غالبیاتِ مہر

غلام رسول مہر

ترتیب وتدوین: **محمد عالم مختارِ حق**

مجلس ترقی ادب، لاہور

غالبیاتِ مہر

غلام رسول مہر

ترتیب و تدوین

محمد عالم مختارِ حق

مجلسِ ترقیِ ادب
۲۔ کلب روڈ، لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

غالبیاتِ مہر از: غلام رسول مہر
ترتیب و تدوین: محمد عالم مختارِ حق
طبعِ اوّل: مئی ۲۰۱۵ء/ شعبان ۱۴۳۶ھ
تعداد: ۶۰۰

ناشر : ڈاکٹر تحسین فراقی
ناظم مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور
مطبع : شرکت پرنٹنگ پریس، نسبت روڈ، لاہور
قیمت : ۵۰۰ روپے

یہ کتاب محکمۂ اطلاعات و ثقافت حکومتِ پنجاب کے تعاون سے شائع ہوئی

فہرست

حصہ اوّل۔ حیات وتصانیفِ غالبؔ

۱۔ نسخۂ حمیدیہ طباعت وتحقیق کی داستان ۶
۲۔ میرزا غالبؔ ۱۹
۳۔ احوالِ غالب کی گم شدہ کڑیاں ۳۴
۴۔ حیاتِ غالبؔ (چند گزارشیں) ۴۱
۵۔ میرزا غالبؔ کی والدہ ماجدہ ۵۰
۶۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اور قلعہ معلّٰی سے تعلق ۵۴
۷۔ غالب کی خاندانی پنشن ۵۸
۸۔ میرزا غالبؔ کا مقدمہ ۶۹
۹۔ بیاضِ غالب کی دریافت ۹۲
۱۰۔ جنگِ آزادی کی کہانی (غالبؔ کے مکاتیب میں) ۱۰۰
۱۱۔ خطوطِ غالبؔ کی اہم خصوصیات ۱۰۸
۱۲۔ لطائف غیبی (قاطع برہان کے سلسلے کی ایک کتاب) ۱۱۹
۱۳۔ پنج آہنگ ۱۳۸

حصۂ دوم۔ غالب کا فکر وفن

۱۴۔ غالب کی شاعری (۱) ۱۴۳

۱۵۔ غالب کی شاعری (۲) ۱۵۲

۱۶۔ میرزا غالب کا مقامِ شعر گوئی ۱۶۱

۱۷۔ غالبؔ کی عظمت ۱۸۴

۱۸۔ میرزا غالبؔ کے شاعری کے بعض خاص پہلو ۱۹۰

۱۹۔ فکرِ غالبؔ کی معجز نمائیاں ۱۹۶

۲۰۔ افکارِ غالب کے نئے زاویے ۲۱۱

۲۱۔ میرزا غالبؔ کی انسان دوستی ۲۱۹

۲۲۔ داستانِ فرہاد اور غالبؔ کا تصورِ محبت ۲۳۱

۲۳۔ غالبؔ کا تصور جنّت و دوزخ ۲۳۹

۲۴۔ میرزا غالب کے چند شعر ۲۴۸

۲۵۔ غالب: دو شعر دو ستارے ۲۵۶

۲۶۔ غالبؔ کے آٹھ شعر ۲۶۳

۲۷۔ غالبؔ — چند گزارشیں ۲۷۳

۲۸۔ میرزا غالبؔ کے ہم معنی اُردو اور فارسی اشعار ۲۸۲

۲۹۔ میرزا غالبؔ کا فارسی کلام ۳۰۱

حصہ سوم۔ متفرقات

۳۰- میرزا غالبؔ نقاد کی حیثیت سے ۳۵۷

۳۱- میرزا غالبؔ اور میرؔ تقی میر ۳۶۴

۳۲- میرزا غالبؔ کی صد سالہ برسی ۳۶۸

۳۳- اِشاریۂ غالبؔ ۳۷۸

۳۴- نقدِ غالبؔ ۳۹۳

۳۵- تاثراتِ مہر ۴۱۱

۳۶- میرزا غالب کی عظمت کے پہلو ۴۱۶

۳۷- مولانا مہر کے پانچ پسندیدہ اشعار ۴۱۸

۳۸- غلام رسول مہر کے منتخبہ بہترین اشعارِ غالب ۴۱۹

حصّہ اوّل - حیات وتصانیفِ غالبؔ

نسخۂ حمیدیہ طباعت و تحقیق کی داستان

فارسی اور اُردو میں جتنے عظیم القدر شاعر گزرے ہیں ان میں سے میرے علم کی حد تک کسی کا ابتدائی کلام محفوظ نہیں رہا، جسے سامنے رکھ کر اندازہ کیا جاسکے کہ شعر گوئی کے آغاز میں اس کے رنگ اور آہنگ کی کیا کیفیت تھی اور ارتقائے فکر و نظر کے بلند تر زینوں پر پہنچ کر اس نے کیسے شعر کہے۔ کلام اساتذہ کے جو مجموعے ہمارے پاس ہیں، ان کا مطالعہ ذرا غور سے کیا جائے تو کہیں کہیں لطافت ذوق کا سرمایہ کم محسوس ہوتا ہے۔ سمجھا جاسکتا ہے کہ شاید یہ ابتدائی دور کا کلام ہو۔ تاہم اس میں غلطی کا امکان بھی ہے۔ بعض اوقات کسی زمین سے شاعر کی طبیعت کو مناسبت نہیں ہوتی لیکن وہ خاص حالات کی بنا پر شعر گوئی کے لیے مجبور ہو جاتا ہے، لہٰذا اچھے شعر نہیں نکال سکتا اور اس زمین میں اپنے خاص فطری جوہر نمایاں نہیں کرسکتا۔ ممکن ہے، ہم ایسے کلام کو دورِ ناپختگی کا کلام سمجھ لیں اگرچہ وہ آخری دور میں کہا گیا ہو۔

علامہ اقبال کی مثال:

ہمارے سامنے ایک قریبی مثال حضرت علامہ اقبال مرحوم کی ہے۔ جنھوں نے ”بانگ درا“ مرتب کرتے وقت اپنے چھپے ہوئے اشعار کا بڑا حصہ قلم زد کر دیا کیوں کہ وہ خاص درجے ہی کے اشعار محفوظ رکھنا چاہتے تھے، جنھیں ان کے مقاصد تعلیم و تربیت سے مناسبت تھی۔ اس وجہ سے ان کے ابتدائی ہی نہیں درمیانے دور کا بھی خاصا کلام خارج ہو گیا اگرچہ رسالوں اور اخباروں میں محفوظ رہ گیا۔ اسی طرح حضرت علامہ مرحوم نے فارسی کلام کا بھی ایک حصہ حذف کر دیا اگرچہ اس کلام کو ہم بالکل ابتدائی دور کا کلام نہیں کہہ سکتے۔

غالب کا ابتدائی کلام:

میرزا غالب کو اس اعتبار سے بھی شعرائے شہیر میں یگانہ حیثیت حاصل ہے کہ مختلف اسباب و

احوال کی بنا پر ان کا بالکل ابتدائی کلام بھی محفوظ رہ گیا، جس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ آغازِ شعر گوئی کی مشقوں کا بڑا حصہ اس میں شامل ہے۔ آج سے کم و بیش پچاس سال پیش تر یہ کلام نواب حمید اللہ خان مرحوم کے زیرِ سرپرستی ‘‘نسخۂ حمیدیہ’’ کے نام سے چھپ گیا تھا۔ اس زمانے میں نواب حمید اللہ خان ریاست بھوپال کے چیف سیکرٹری تھے۔ بعد میں مسندِ فرماں روائی کی زینت بنے۔ اس نسخہ کی کتابت حافظ معین الدین خوش نویس نے ۵ صفر ۱۲۳۷ھ (یکم نومبر ۱۸۲۱ء) کو مکمل کی تھی جب میرزا غالب کی عمر کے چوبیس مرحلے پورے ہو رہے تھے۔

میرزا نے دس گیارہ برس کی عمر میں شعر گوئی شروع کر دی تھی اگر ہم فرض کر لیں کہ انھوں نے پندرہ برس کی عمر سے اپنا کلام قابلِ حفاظت سمجھا ہوگا تو ‘‘نسخۂ حمیدیہ’’ کو ابتدائی دس سالوں کی مشقوں کا مجموعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

نسخۂ امروہہ:

حال ہی میں میرزا کے ابتدائی کلام کا ایک اور مجموعہ منظرِ عام پر آیا ہے، جسے بالفعل ‘‘نسخۂ امروہہ’’ قرار دیا جاتا ہے کیوں کہ اس کی دریافت کا سہرا امروہہ کے ایک تاجر کتب کے سر ہے۔ یہ خود میرزا کا لکھا ہوا ہے اور اس کے آخر میں ۱۴ رجب تاریخ ثبت ہے، سنہ درج نہیں لیکن قرائن کی بنا پر سنہ ۱۲۳۱ھ ہونا چاہیے۔ گویا یہ ۱۱ جون ۱۸۱۶ء کا مجموعہ ہے۔ جزوی ترمیموں یا مختلف غزلوں کے مقطعوں میں اسد کی جگہ غالب تخلص بنا دینے کو نظر انداز کر دیا جائے تو فی الجملہ اس نسخے کو ‘‘نسخۂ حمیدیہ’’ کی اصل و اساس سمجھا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے اسے ابتدائی چار پانچ سال کا کلام قرار دینا چاہیے۔ تاہم اس پہلو پر مفصل بحث اس وقت تک ممکن نہیں جب تک یہ نسخہ چھپ کر سامنے نہ آ جائے۔

نسخۂ حمیدیہ کی اہمیت:

غرض ‘‘نسخۂ حمیدیہ’’ کو ابتدائی آٹھ نو سال کے کلام کا مجموعہ سمجھا جائے یا چار پانچ سال کے کلام کا، اس کی اشاعت سے میرزا کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ کرنے کے لیے نئی بنیادیں مہیا ہوتی ہیں، مثلاً:

۱۔ پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ میرزا نے جتنا کلام مستند قرار دے کر شائع کیا اس سے زیادہ نہیں تو کم از کم اتنا ہی کلام حذف بھی کر دیا۔

۲۔ میرزا کے متداول دیوان میں جن زمینوں کے ایک ایک دو دو شعر ملتے ہیں ان زمینوں میں پوری

غزلیں موجود تھیں لیکن میرزا نے باقی شعر قابل اشاعت نہ سمجھے۔

۳۔ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ میرزا نے اُردو شعر کہنے شروع کیے تھے تو ان کا انداز و اسلوب کیا تھا اور یہ اسلوب اختیار کرنے کے اسباب کیا ہو سکتے تھے۔ زیادہ تر یہی اشعار تھے، جن کے متعلق طنز و تعریض کی روایتیں تذکروں میں راہ پا گئیں۔ کور ذوقی اور بے مایگی فکر و نظر کی یہ کتنی افسوس ناک مثال تھی کہ بعض لوگ ان تعریضات کو میرزا کے پورے اُردو کلام سے وابستہ کرتے رہے۔

۴۔ اس مجموعے کی اشاعت نے میرزا کی شاعری کے ارتقائی مدارج کا جائزہ لینے کے لیے خاصا سامان فراہم کر دیا۔

آخر میں یہ بھی عرض کر دینا چاہیے کہ میرے اندازے کے مطابق انتخاب اشعار میں دقت نظر یا غور و توجہ سے کام نہ لیا گیا۔ قلم زدہ اشعار میں سے خاصی تعداد مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے قابل انتخاب تھی، وہ نظر انداز ہو گئی اور بعض وہ شعر لے لیے گئے جن میں فکر یا اسلوب بیان کی کوئی خاص خوبی نہ تھی اور ان کا ترک موجب افسوس ہرگز نہ ہوتا۔

فوج دار محمد خاں:

جو مخطوطہ ''نسخۂ حمیدیہ'' کے نام سے شہرت پذیر ہوا، وہ پہلے ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء میں فوجدار محمد خاں بھوپالی کے کتب خانے میں پہنچا تھا جیسا کہ پہلی مُہر سے ثابت ہوتا ہے۔ فوج دار محمد خاں، نواب غوث محمد خاں والیِ بھوپال کے فرزند، نواب قدسیہ بیگم مرحومہ کے بھائی اور نواب سکندر بیگم مرحومہ کے حقیقی ماموں تھے۔ جب سکندر بیگم مرحومہ کے شوہر نواب جہانگیر محمد خاں کا انتقال ہوا (۱۸۴۴ء) تو ان کی اکلوتی صاحبزادی نواب شاہ جہاں بیگم کو والیۂ بھوپال تسلیم کر لیا گیا۔ وہ کم سن تھیں، اس لیے نیابت کے فرائض فوج دار محمد خاں کو سونپے گئے تھے۔ تھوڑے عرصے بعد یہ انتظام تبدیل ہو گیا اور نواب سکندر بیگم مرحومہ ہی کو نیابت کے لیے موزوں سمجھا گیا۔ بعد ازاں مرحومہ اپنی صاحبزادی کی رضامندی سے ذاتی حقوق کی بنا پر مستقل فرماں روا قرار پائیں اور ریاست بھوپال کے حسن انتظام کا پہلا زریں دور نواب سکندر بیگم ہی کا عہدِ حکومت ہے۔

غالب اور فوج دار محمد خاں کے مراسم:

معلوم ہوتا ہے کہ نواب فوج دار محمد خاں اور میرزا غالب کے درمیان ابتدا ہی سے دوستانہ مراسم

قائم ہو گئے تھے۔ نواب سرکاری کاموں کے سلسلہ میں دہلی آتے تھے تو میرزا سے ضرور ملتے تھے۔ مولوی عبدالقوی دیسنوی نے لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد میرزا کے لیے شدید مالی مشکلات پیدا ہو گئیں۔ نواب سکندر بیگم کو ان کا علم ہوا تو فوج دار محمد خاں ہی کو اس پیش کش کے ساتھ میرزا غالب کے پاس دہلی بھیجا کہ آپ بھوپال آ جائیں، ریاست آپ کے تمام مصارف کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیار ہے۔ اغلب ہے یہ تحریک فوج دار محمد خاں ہی نے کی ہو جو نہ محض میرزا کے حالات سے آگاہ ہی تھے بل کہ ان کے لیے دل میں خاص درد بھی رکھتے تھے۔

بھوپال کی طرف سے دعوت:

یوں میرزا کے تمام قرضے ادا ہو جاتے، جو اُن کے لیے مدت العمر باعثِ مصیبت بنے رہے اور بالکل اوائل حیات سے اس دنیا میں نفس بازپسیں تک انھیں قرضوں سے نجات نہ مل سکی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کی آمدنی کا کتنا بڑا حصہ سود اور سود در سود کی نذر ہوا۔ جب ریاست مصارف کی ذمہ داری قبول کر رہی تھی تو ظاہر ہے کہ آیندہ قرض لینے کی نوبت ہی نہ آتی مگر میرزا یہ پیش کش قبول نہ کر سکے۔ اس کے مختلف وجوہ ذہن میں آتے ہیں۔

۱۔ میرزا پر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں شرکت کا الزام لگ چکا تھا جو حقیقتاً بالکل بے اصل و بے بنیاد تھا۔ میرزا نہیں چاہتے تھے کہ اس الزام سے کامل برأت حاصل کیے بغیر دہلی سے کہیں جائیں۔ ظاہر ہے کہ برأت حاصل کیے بغیر جانا بجائے خود اصل الزام کے اثبات کی ایک قوی دلیل بن سکتا تھا۔

۲۔ میرزا یہ بھی جانتے تھے کہ الزام قائم رہا تو انگریز جب چاہیں گے انھیں پکڑوا دیں گے اور کوئی ریاست انگریزی دار و گیر سے انھیں بچانے کی جسارت نہ کر سکے گی۔

۳۔ نواب یوسف علی خان مرحوم والیٔ رام پور نے میرزا کے لیے ایک سو روپے ماہ وار کی رقم مستقل طور پر مقرر کر دی تھی جو ہنڈی کے ذریعے میرزا کو پہنچتی رہتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی نواب مختلف اوقات میں رقمیں بھیجتے رہتے تھے جن کے لیے میرزا نے ''فتوح'' کی اصطلاح وضع کر رکھی تھی اور نواب مرحوم میرزا کو رام پور بلاتے بھی رہتے تھے اگر میرزا بھوپال چلے جاتے تو سو روپے ماہ وار کے وظیفے اور ''فتوح'' کی بندش کے علاوہ نواب کو ملال بھی ہوتا کہ ان کی دعوت میرزا نے قبول نہ کی حالاں کہ ان کے ساتھ دوستانہ روابط بہت پہلے سے استوار تھے۔

میرزا کی مصلحتیں:

میرزا گوشہ وتوشہ کے بارے میں امن واطمینان کے خواہاں تھے اور خانہ داری کے مصارف کی پریشانیوں نیز سود خوار مہاجنوں کے تقاضوں سے بچنے کے لیے دوزخ میں جانے کو بھی ترجیح دیتے تھے جیسا کہ خود کہتے ہیں:

در طلب جامہ و ناں کش مکش از زن   داں کہ نہ باشد دراں مضیق مصیبت
شور ناروائے تقاضائے مہاجن   داں کہ نہ باشد دراں مقام صعوبت

ممکن ہے کسی کو خیال ہو کہ میرزا دہلی کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ذوق کو حیدر آباد دکن کے دیوان، مہاراجا چندو لال، نے بلایا تھا تو انھوں نے کہا تھا:

گرچہ ہے ملکِ دکن میں ان دنوں قدرِ سخن
کون جائے ذوق پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

میرزا غالب کو بھی ناسخ نے حیدر آباد جانے کا مشورہ دیا تھا۔ غالباً اسی زمانے میں انھوں نے کہا تھا:

عالم توفیق را غالب سواد اعظم
مہر حیدر پیشہ دارم، حیدر آبادِ خودم

دہلی سے محبت کا مسئلہ:

بلاشبہ میرزا کو دلی کے در و دیوار سے انتہائی محبت تھی جو مسلمانوں کی ہفت صد سالہ تہذیب وتمدن اور علوم وثقافت کا آخری بڑا مأمن تھی اور جہاں میرزا کی عمر کا بڑا حصہ گزرا تھا لیکن ہمیں علم ہے کہ ۱۸۴۶ء میں نصیر الدولہ معین الملک نواب تجمل حسین خان بہادر حشمت جنگ والی فرخ آباد نے میرزا کو بہ اصرار بلایا تھا تو وہ جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے اور اپنے عزیز شاگرد میر احمد حسین میکش کو بھی پاٹودی سے بلا لیا تھا کہ ساتھ لے جائیں، جیسا کہ ان کے ایک فارسی مکتوب سے واضح ہوتا ہے۔ اس اثنا میں اچانک تجمل حسین خان بیمار ہو گئے اور اسی بیماری میں وفات پائی۔ یوں یہ ارادہ قوت سے فعل میں نہ آ سکا۔

میرزا دانستہ اطمینان و دلجمعی کا شیرازہ لامتناہی مدت تک منتشر نہیں رکھ سکتے تھے۔ ریاست بھوپال کی پیش کش ضرور قبول کر لیتے مگر خصوصی مصلحتیں ہی اسے قبول نہ کرنے کی متقاضی ہوئیں، جن کی طرف اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے۔

نسخۂ حمیدیہ کی مُہریں:

بہ ہر حال فوج دار محمد خان کے دوستانہ روابط موجود تھے۔ جب انھیں قلمی دیوان کا علم ہوا تو اصرار کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ یوں یہ نسخہ کتابت سے کم و بیش گیارہ سال بعد فوج دار محمد خان کے کتب خانے میں شامل ہوا، جیسا کہ ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء کی مُہر سے ثابت ہے۔ یہ دعویٰ صحیح معلوم نہیں ہوتا کہ یہ نسخہ فوج دار محمد خان کے لیے لکھوایا گیا تھا اگر ایسا ہوتا تو بعد اتمام کتابت یہ گیارہ سال تک میرزا کے پاس کیوں رہتا؟

علاوہ بریں نسخے پر ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء کی مُہر بھی ثبت ہے اور دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ یہ مُہر ۱۲۴۸ھ والی مُہر سے بڑی ہے، جو بداہتہً اس زمانے میں بنوائی گئی جب فوج دار محمد خاں کو نواب شاہجہاں بیگم کی نیابت سپرد ہوئی تھی اور نسباً بڑے ہونے کے علاوہ منصباً بھی بڑے ہو گئے تھے لیکن ظاہر ہے کہ محض بڑی مُہر لگانے کے شوق میں تو یہ نہیں لگائی گئی ہو گی۔ اس کا کوئی نہ کوئی معقول سبب ہونا چاہیے۔

''نسخۂ حمیدیہ'' کی تمہید میں مذکور ہے کہ اصل مخطوطہ:

> ''کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے کئی مرتبہ، تصحیح و ترمیم کی غرض سے غالب کے پاس بھی گیا ہے اور ان کی نظر سے گزرا ہے اور انھوں نے خود اس میں جابجا اصلاحیں کی ہیں......''

لیکن یہ دعویٰ محض قیاس پر مبنی ہے۔ بے شک ایک مرتبہ کتب خانے سے باہر جانے کے ثبوت میں ۱۲۴۸ھ کے بعد ۱۲۶۱ھ کی مُہر پیش کی جاسکتی ہے۔ تاہم اس کی حیثیت زیادہ محکم نہیں۔ اس کے لیے وزنی ثبوت درکار ہے۔

اگر اسے تسلیم نہ کیا جائے تو ۱۲۶۱ھ کی مُہر لگانے کی توجیہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ جب فوجدار محمد خان نے نائب ریاست کی حیثیت سے بڑی مُہر بنوالی تو یہ مُہر اپنی تمام کتابوں پر بھی لگوا

دی۔ یوں مخطوطہ دوسری مرتبہ مُہر سے مزیّن ہوا، جو پہلی مُہر کی طرح مختلف اوراق پر لگائی گئی ہوگی لیکن یہ کوئی اچھی اور زیبا توجیہ نہیں بل کہ بدیہی طور پر نازیبا توجیہ ہے جسے قبول کرنے سے طبیعت ابا کرتی ہے۔

ترمیمیں اور اضافے:

اس طرح یہ کہنا بھی قیاس ہی کا کرشمہ ہے کہ میرزا غالب نے اس مخطوطے میں جتنے اضافے کیے یا ترمیمیں فرمائیں وہ اسے فوج دار محمد خاں کے حوالے کرنے سے پہلے ہو چکی تھیں۔ یہ مان لینے میں کیوں تامل ہو کہ فوج دار محمد خان کبھی دہلی جاتے وقت نسخہ اپنے ساتھ لے گئے اور اصرار کیا کہ میرزا پہلے کی طرح مزید ترمیمیں اور اضافے کر دیں۔ میرزا نے حقِ دوستی کی پاسداری میں یہ مطالبہ بھی قبول کر لیا چناں چہ اوقاتِ فراغت میں جو بھی پڑھا لکھا میرزا کے پاس آتا رہا، اس کے خط کی خوبی و ناخوبی سے قطع نظر کرتے ہوئے کچھ بڑھوایا بدلوا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر حمید احمد خاں نے ترمیموں کے متعلق جا بجا مختلف تصریحات فرمائی ہیں، مثلاً:

۱۔ باریک قلم، شکستہ
۲۔ باریک قلم، خوش خط۔
۳۔ موٹا قلم، بد خط تحریر۔
۴۔ موٹا قلم، شکستہ۔
۵۔ یہ بجنسہٖ غالب کی تحریر معلوم ہوتی ہے۔

گویا میرزا غالب دوسرے لوگوں سے بھی ترمیم کراتے رہے اور کبھی خود بھی کچھ لکھ دیا۔ یہ صورت قرینِ قیاس ہے اور اسے یک قلم رد نہ کر دینا چاہیے۔

نسخۂ حمیدیہ کی گم شدگی:

فوج دار محمد خاں کا انتقال ۱۸۶۶ء میں ہوا۔ اس کے بعد یہ مخطوطہ مرحوم کے فرزند یار محمد خاں شوکت کی تحویل میں آیا، جو میرزا غالب کے شاگرد تھے۔ ان کا انتقال ۱۸ اگست ۱۹۱۲ء کو ہوا۔ اس کے بعد یہ نادر نسخہ کتب خانہ عالیہ بھوپال میں منتقل ہوا۔ صدیق مکرم مولانا امتیاز علی خاں صاخب عرشی رامپوری کا بیان ہے کہ جس زمانے میں ریاست بھوپال دوسری ریاستوں کی طرح ہندوستان میں ضم ہوئی یعنی تقسیم سے سال دو سال بعد، اس وقت یہ گوہر نایاب گم ہو گیا۔ کچھ پتا نہ چل سکا کہ کہاں گیا اور

کون لے گیا۔ اب اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا، گویا اب اصل نسخہ سامنے رکھ کر مطبوعہ نسخے سے اختلافات کا جائزہ لینا ممکن نہیں۔ وہی سرمایہ باقی رہ گیا ہے جو بعض اصحاب نے یادداشتوں کی شکل میں مہیا کر لیا تھا۔ ان میں سے ایک صاحب علم و نظر پروفیسر حمید احمد خاں بھی تھے، جنھوں نے اواخر اگست ۱۹۳۸ء میں حیدرآباد سے لوٹتے ہوئے چند روز بھوپال میں گزارے اور پورے نسخے کے مقابلے سے ضروری نوٹ فراہم کر لیے تھے۔

ترتیب و اشاعت کی کہانی:

نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب و اشاعت کی کہانی بھی اختصاراً سن لیجیے:

انجمنِ ترقیِ اُردو نے ۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۴ء میں فیصلہ کیا تھا کہ میرزا غالب کے دیوان اردو کا ایک صحیح نسخہ پورے اہتمام سے چھاپا جائے چناں چہ دیوان کی ترتیب ہاشمی فرید آبادی مرحوم کے سپرد ہوئی اور انھوں نے ۱۹۱۵ء میں دیوان کا مبیضہ تیار کر دیا، جس کے مطابق طباعت ہونے والی تھی۔ اس اثنا میں نظامی پریس بدایوں سے دیوانِ غالب کا ایک عمدہ اور خوبصورت نسخہ چھپ کر منظرِ عام پر آ گیا۔ یہ غالباً سید راس مسعود مرحوم و مغفور کی سعی و کوشش کا نتیجہ تھا۔ اس سے انجمنِ ترقیِ اُردو کے ولولۂ اشاعت دیوان پر اوس پڑ گئی۔

بجنوری مرحوم کا عزم:

اسی زمانے میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم ولایت سے واپس آئے اور بھوپال میں مشیر تعلیم مقرر ہوئے۔ انھیں کلام غالب سے انتہائی شیفتگی تھی۔ انجمن کی تجویز اشاعت دیوان کا ذکر ان کے گوش زد ہوا تو وہ خود یہ کام انجام دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان کی وجہ سے انجمنِ ترقیِ اُردو اپنی تجویز کو از سرِ نو لباسِ عمل پہنانے کے لیے آمادہ ہو گئی۔

بجنوری مرحوم نے ترتیب دیوان کے ساتھ ساتھ اس پر ایک مفصل مقدمہ بھی لکھنا شروع کیا، جس کا مدعا یہ تھا کہ دیوان کی معنوی قدر و قیمت سے دنیا کو روشناس کرایا جائے اور حق یہ ہے کہ یہی مقدمہ ہے، جس کے آئینے میں پہلی مرتبہ عظمت غالب کے گوناگوں جلوے روشناس اہل نظر ہوئے۔ یقیناً عظمت غالب کی اصل بنیاد خواجہ حالی مرحوم کی ''یادگار'' سے استوار ہوئی تھی لیکن بجنوری مرحوم کے مقدمہ نے سوچنے سمجھنے والوں کے دل و دماغ میں جو ہمہ گیر ہلچل پیدا کر دی تھی، اس کا رنگ اور تھا۔

اشاعت کا مجوزہ نقشہ:

اچانک بجنوری مرحوم کو سرکاری کتب خانۂ بھوپال میں دیوان غالب کے مخطوطے کا علم ہوا۔ اسے نکلوا کر دیکھا تو آنکھیں کھل گئیں چناں چہ مرحوم نے متداول دیوان اور مخطوطے کو اکٹھا چھاپنے کا ایک نقشہ تیار کر لیا اور اسی کے مطابق کتابت شروع کرا دی۔

اس نقشے کی کیفیت ایک روایت کے مطابق یہ تھی:

۱۔ مخطوطے کے اشعار ایک طرف کے صفحات پر چھاپے جائیں۔ مقابل کے صفحات پر ان زمینوں میں متداول نسخے کے اشعار شائع کیے جائیں۔

۲۔ قلمی یا مطبوعہ نسخے کے جو اشعار صرف ایک نسخے میں ہوں، ان کے مقابل کے صفحات سادہ چھوڑ دیے جائیں۔

ظاہر ہے کہ اس طرح دیوان کی ضخامت بہت بڑھ جاتی لیکن قلمی اور متداول یا قدیم و جدید کا اندازہ خوانندگان کرام کو بہ آسانی ہو جاتا اور مخطوطے کی اشاعت کا اہم مقصد اور فائدہ یہی تھا۔ دونوں کو بعد میں جس طریق پر چھاپا گیا اس سے اصل مقصد تو فوت ہو گیا، البتہ مخطوطے کے اشعار محفوظ ہو گئے۔

ڈاکٹر بجنوری کی وفات:

بجنوری مرحوم کی یہ تجویز ابھی ابتدائی مراحل ہی میں تھی کہ ۱۹۱۸ء کے وبائی انفلوئنزا میں پہلے ڈاکٹر بجنوری کی بیگم کا انتقال ہوا، چند روز بعد ۷ نومبر ۱۹۱۸ء کو وہ خود بھی عین عالمِ شباب میں رہگرائے عالم بقا ہو گئے اور دیوان کی طباعت کا معاملہ معرض اختلال میں پڑ گیا۔

آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند

مفتی انوار الحق مرحوم:

نواب حمید اللہ خان مرحوم اس زمانے میں ریاست بھوپال کے چیف سیکرٹری تھے۔ انھوں نے دیوان کا کام مفتی محمد انوار الحق مرحوم کے سپرد کر دیا، جو ناظم سر رشتۂ تعلیمات تھے لیکن جو نقشہ بجنوری مرحوم نے تیار کیا تھا، اس کی پابندی کی توقع مفتی انوار الحق مرحوم سے نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ بہت بڑے فاضل تھے۔ ذوق شعر سے بھی بہرہ مند تھے مگر پیش نظر کام کی اہمیت اور مجوزہ نقشہ کے بدیہی فوائد سے

آگاہ نہ تھے۔ نیز اس کے لیے جس جان کاوی کی ضرورت تھی اس کے لیے فرصت نہیں نکال سکتے تھے۔

پھر ایک مصیبت یہ آن پڑی کہ ڈاکٹر بجنوری مرحوم دیوان غالب پر جو مقدمہ لکھ رہے تھے، وہ نامکمل رہ گیا۔ ان کا شروع کیا ہوا کام، وہی پایۂ تکمیل پر پہنچا سکتا تھا، جسے وسعت علم و نظر اور لطافت و حسن ذوق کے علاوہ کلام غالب کے ساتھ خاص شیفتگی اور لگن ہوتی۔ مرحوم نے جو کچھ لکھا تھا وہ متداول دیوان کے ایک حصے پر مبنی تھا۔ مخطوطے پر وہ کچھ بھی نہیں لکھ سکے تھے۔

مفتی انوار الحق مرحوم خود کچھ نہ کر سکے کہ جو کچھ جس حالت میں انھیں ملا، اسے اسی حالت میں مختصر سی تمہید کے ساتھ حوالۂ طباعت کر دیا۔ غالباً وہ متن پر بھی پوری توجہ نہ فرما سکے، بل کہ متن کی ترتیب بھی ملحوظ نہ رکھ سکے۔

یہ حقائق ان اصحاب کے ذریعے سے وقتاً فوقتاً منظر عام پر آتے رہے جنھوں نے اس زمانے میں مطبوعہ نسخے کا مقابلہ مخطوطے کے متن سے کیا تھا اور ان میں ایک ہمارے گرامیِ منزلت دوست پروفیسر حمید احمد خاں بھی تھے۔

پریشان خاطری کی مثال:

حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے کہ مفتی صاحب کو ''نسخۂ حمیدیہ'' کا کام اطمینان و دل جمعی سے پورا کرنے کی مہلت نہ مل سکی۔ شاید اس لیے کہ ان کے اپنے واجبات و فرائض خاصے دقت طلب اور پریشان کن تھے۔ نیز یہ کام ناخواستہ ان پر آ پڑا تھا اور اس کے ساتھ اُنھیں کوئی دلی وابستگی نہ تھی۔

پریشان خاطری کی مثالیں ان کی تمہیدی تحریر میں بھی موجود ہیں، مثلاً ایک مقام پر انھوں نے شکوہ کیا ہے کہ احباب و اقربا نے بجنوری مرحوم کے حالات بہم پہنچانے میں دریغ کیا بل کہ ان کی تصویر بھی واپس لے لی گئی جسے نسخے کے ساتھ چھاپنا منظور تھا (ص ۲۶-۲۷) حالاں کہ ''نسخۂ حمیدیہ'' کے اس ایڈیشن میں بجنوری مرحوم کی تصویر موجود ہے، جس میں مقدمہ شائع ہوا ہے۔ گویا تمہید کا یہ حصہ چھپ گیا تھا۔ بعد میں تصویر ملی تو اُسے بھی شائع کر دیا گیا مگر نہ متعلقہ عبارت تبدیل کی گئی اور نہ اس کے بارے میں کوئی اشارہ ضروری سمجھا گیا۔

پھر ایک ہی ایڈیشن کے دو نسخوں —— یعنی با مقدمہ اور بے مقدمہ نسخوں —— میں کئی اختلافات ہیں۔ جن کی تفصیل یہاں پیش کرنا محض تکلف ہوگا۔

چند نا معلوم افراد:

پروفیسر حمید احمد خاں نے اپنے مرتبہ نسخے کے دیباچے میں تین اصحاب کے نام لکھے ہیں، جنھوں نے مخطوطے کو دیکھا اور بعض اشعار پر صاد کرنے کے ساتھ اپنا نام لکھ دیا۔ نام یہ ہیں:

(۱) عبد العلی، (۲) عبد الصمد مظہر، (۳) آغا علی۔

عبد العلی:

ان میں سے عبد العلی کے متعلق عرشی صاحب کا خیال ہے کہ فرماں روایان رام پور کے خاندان سے عبد العلی بن غلام محمد خاں ہوں گے۔ ڈاکٹر سید حامد حسن صاحب نے خود بھوپال سے دو ''عبد العلی'' پیش کر دیے۔ اول سید عبد العلی رضوی جو قاضی سید امجد علی رضوی کے فرزند تھے۔ ۱۸۳۶ء کے قریب پیدا ہوئے۔ ریاست میں ملازمت کی ابتدا تحصیل داری سے ہوئی۔ پھر مختلف مناصب پر فائز ہوتے رہے۔ ۱۸۹۱ء میں وہ مہتمم دفتر حضور یعنی اکاؤنٹینٹ جنرل ہو گئے تھے۔

دوسرے عبد العلی تونگر بن عبد الواحد خاں مسکین خیر آبادی۔ یہ ۱۸۲۰ء کے قریب پیدا ہوئے۔ نواب سکندر بیگم مرحومہ کے عہد میں میر دبیر ریاست رہے۔ نواب شاہ جہاں بیگم کے عہد میں وسیع اختیارات حاصل کر لیے۔ بعد میں کارکنان ریاست کی دراندازیوں سے تونگر کے متعلق بدگمانیاں پیدا ہوئیں۔ وہ پہلے ملازمت سے برطرف ہوئے، ۸ نومبر ۱۸۷۰ء کو انھیں ریاست سے نکال دیا گیا۔ ۱۸۸۳ء میں بہ مقام اندور اُن کا انتقال ہوا۔

ایک قیاس:

ڈاکٹر سید حامد حسن صاحب کا خیال ہے کہ ممکن ہے عبد الواحد خاں مسکین خیر آبادی میرزا غالب کا یہ مجموعۂ کلام دہلی سے بھوپال لائے ہوں اور عبد العلی تونگر نے اسے اس زمانے میں دیکھا ہو، جب یہ ان کے والد کے پاس تھا۔

میرے نزدیک اغلب یہی ہے کہ یہ مجموعہ فوج دار محمد خاں خود میرزا غالب سے لائے۔ مسکین مومن کے شاگرد تھے اور مصطفیٰ خاں شیفتہ کے ساتھ انھوں نے ربط ضبط پیدا کر لیا تھا لیکن یہ کیوں کر ممکن تھا کہ شیفتہ کے ذریعے سے وہ اس مجموعۂ کلام کو حاصل کر لیتے، جو میرزا نے بہ ظاہر اپنے لیے خوش نویس سے لکھوا کر رکھ لیا تھا؟ یہ

ہر حال قیام بھوپال کے دوران میں ممکن ہے تونگر نے خود فوج دار محمد خاں کے کتب خانے میں یہ مجموعہ دیکھ لیا ہو۔

عبدالصمد مظہر:

عبدالصمد مظہر ۲۲ دسمبر ۱۸۸۳ء کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ پھر پنجاب یونیورسٹی سے بی-اے کا امتحان پاس کیا۔ ۲۶ مئی ۱۹۰۶ء کو نواب زادہ عبید اللہ خاں کرنل انچیف بھوپال کے ملٹری سیکرٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۸ء میں نواب سلطان جہان بیگم والیۂ بھوپال کے ملٹری سیکرٹری بنا دیے گئے۔ ۱۴ اگست 1918ء کو پولیٹکل سیکرٹری دربار اور وکیل ریاست کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں سر علی امام نے انھیں حیدر آباد بلا لیا، جہاں وہ معتمد حرفت و تجارت اور معتمد فوج ہوئے اور صمد یار جنگ کا خطاب پایا۔ ۱۷ جنوری ۱۹۶۱ء کو وفات پائی۔

ان صاحب نے یہ نسخہ یا تو بہ زمانۂ قیام بھوپال دیکھا یا اس وقت دیکھا جب ۱۹۲۸ء کے قریب ڈاکٹر سید عبداللطیف نے یہ نسخہ حیدر یار جنگ سر اکبر حیدری کی وساطت سے حیدر آباد منگوایا تھا۔

ڈاکٹر سید حامد حسن صاحب فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے نسخے کے پہلے ورق پر شکستہ خط میں جن دستخطوں کو ”محمد حسین“ پڑھا، وہ دراصل ”محمد حنیف“ ہے۔ قاضی محمد حنیف فوج دار محمد خاں کے معتمد خاص اور خیر خواہ ہونے کے ساتھ ان کی جاگیر کے منتظم اعلیٰ بھی تھے۔

گویا جن اصحاب کا ذکر پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے کیا ہے ان میں سے صرف آغا علی کا کوئی سراغ اب تک نہیں ملا۔

حمید احمد خاں کی محنت و کاوش:

پروفیسر حمید احمد خاں نے جو محنت و کاوش فرمائی، علمی نقطۂ نظر سے اس کا صحیح اندازہ اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب بھوپال کے نسخۂ حمیدیہ کا مقابلہ مجلس ترقی ادب کے نسخۂ حمیدیہ سے صفحہ بہ صفحہ کر لیا جائے اور یہ کام چند گھنٹوں یا چند دنوں کا نہیں۔

آخر میں قدرت کی اس عجیب اندازہ فرمائی کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں کہ کلام غالب کے مخطوطے کو اس وجہ سے ”نسخۂ حمیدیہ“ کہا گیا ہے کہ یہ نواب حمید اللہ خاں مرحوم کی سرپرستی میں چھپا تھا۔ اس زمانے میں وہ ریاست بھوپال کے چیف سیکرٹری تھے۔ بعد میں مسند فرماں روائی کی زینت بنے۔ جس

بالغ نظر محقق نے اس مخطوطے کے متن کی تحقیق و تصحیح اب درجۂ اتمام پر پہنچائی، اس کے نام کا جزوِ اعظم بھی ’’حمید‘‘ ہی ہے۔ نواب حمید اللہ خاں مرحوم پہلی طباعت کے سرپرست تھے، چھان بین اور جانچ پڑتال کے اہتمام تام کو پایۂ اتمام پر پہنچانے والے ’’حمید احمد خاں‘‘ ہیں۔ ’’نسخۂ حمیدیہ‘‘ پہلے انتساباً ’’نسخۂ حمیدیہ‘‘ تھا، اب تحقیقاً ’’نسخۂ حمیدیہ‘‘ بن کر منظرِ عام پر آیا ہے۔ گویا اب ہم اسے زیادہ وثوق و اعتماد سے ’’نسخۂ حمیدیہ‘‘ قرار دے سکتے ہیں۔ یا سمجھ لیجیے کہ پہلی اشاعت صرف صوری و ظاہری حیثیت سے ’’نسخۂ حمیدیہ‘‘ تھی اور اب باطن و معنویت کے اعتبار سے بھی ’’نسخۂ حمیدیہ‘‘ بن گئی ہے۔

الہامی نام:

غرض ’’نسخۂ حمیدیہ‘‘ الہامی نام تھا جو پچاس سال پیش تر بھی صحیح، موزوں اور جاذبِ قلب و نظر تھا اور اب بھی ہر اعتبار سے صحیح، موزوں اور جاذبِ قلب و نظر ہے۔ کسی بھی پہلو اور کسی بھی وجہ سے اسے بدلنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

یک چراغے است درین بزم کہ از پرتو آن
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

(’’اقبال‘‘ لاہور۔ بزمِ اقبال لاہور۔ اپریل ۱۹۶۹ء)

میرزا غالب

میرزا اسد اللہ بیگ خاں غالب، قوم کے سلجوقی ترک، ۲۷- دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہُوئے۔ ان کے دادا میرزا قوقان بیگ خاں اس زمانے میں سمرقند سے ہندوستان آئے تھے۔ جب سلطنت مغلیہ کے اقبال کا دیا ٹمٹما رہا تھا اور نواب معین الملک عرف میر منّو پنجاب کے ناظم تھے۔ میرزا قوقان بیگ خاں پہلے میر منّو کے پاس ملازم ہُوئے۔ ان کی وفات پر نظامتِ پنجاب کا کارخانہ درہم برہم نظر آیا تو دہلی چلے گئے۔ یقینی طور پر معلوم نہیں کہ دہلی ہی میں رہے یا اور کسی جگہ بھی مشغولیت اختیار کی۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ جب شاہ عالم ثانی مرہٹوں کا سہارا لے کر پورب سے دہلی پہنچا اور ذوالفقارالدولہ نجف خاں کے ہاتھ میں اختیارات کی باگ آئی تو میرزا قوقان بیگ خاں کو ضلع بلندشہر میں پہاسو کا تعلقہ ذات اور رسالے کی تنخواہ کے لیے مل گیا۔ غالباً دہلی ہی میں انھوں نے شادی کی۔ چار۴ بیٹے اور تین۳ بیٹیاں ہُوئیں۔ ہمیں ان کی نرینہ اولاد میں سے صرف دو۲ کے نام معلوم ہیں۔ ایک میرزا عبداللہ بیگ خاں عرف میرزا دلھا، دوسرا میرزا نصراللہ بیگ خاں۔

نجف خاں کی وفات کے بعد اس خاندان نے شاہی ملازمت چھوڑ کر ریاست جے پور میں ملازمت کرلی اور بہ ظاہر اسی دور میں اقامت کے لیے آگرہ مناسب سمجھا گیا۔ عبداللہ بیگ خاں کی شادی آگرہ کے رئیس خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی صاحب زادی عزت النسا بیگم سے ہُوئی تھی اور وہ خانہ داماد کی حیثیت سے وہاں رہنے لگے۔ ان کے تین بچّے ہوئے، چھوٹی خانم، میرزا اسد اللہ بیگ خاں غالب اور میرزا یوسف خاں۔

عبداللہ بیگ خاں پہلے آصف الدولہ کے پاس لکھنؤ میں ملازم رہے پھر حیدرآباد چلے گئے جہاں نظام الملک میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی نے انھیں سوسوار کا افسر مقرر کردیا۔ یہ نوکری چھٹی تو آگرہ چلے آئے۔ پھر سواروں کا ایک دستہ لے کر ملازمت کی غرض سے الور پہنچے، وہاں ایک لڑائی میں مارے گئے۔ یہ ۱۸۰۳ء کا واقعہ ہے۔ راج گڑھ میں ان کی قبر بنی۔ میرزا غالب نے مہاراجا الور کے

قصیدے میں لکھا ہے:

کافی بود مشاہدہ، شاہد ضرور نیست
در خاکِ راج گڑھ پدرم را بود مزار

عبداللہ بیگ خاں کی وفات کے وقت غالب کی عمر صرف پانچ برس کی تھی۔ چھوٹی خانم ان سے بڑی تھیں۔ میرزا یوسف دو برس چھوٹے تھے۔ ان یتیم بچّوں کو ان کے حقیقی چچا میرزا نصر اللہ بیگ نے اپنے دامنِ شفقت میں لے لیا۔ وہ پہلے مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے صوبہ دار تھے۔ جب انگریز دہلی اور آگرہ پر قابض ہو گئے اور صوبے داری کمشنری بن گئی تو لارڈ لیک نے میرزا نصر اللہ خاں کو چار سو سواروں کا افسر بنا دیا اور ایک ہزار سات سو روپے ماہانہ تنخواہ مقرر کی۔ پھر میرزا نے سونک اور سونسا کے پرگنے ہلکر سے بزور چھین لیے۔ سونک اور سونسا آج کل ضلع متھرا میں ہیں۔ لارڈ لیک نے اس کارنامے پر خوش ہو کر دونوں پرگنے نصر اللہ خاں کو بہ طور جاگیر دے دیے۔ غرض ان کی آمدنی لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ ہو گئی لیکن اس واقعے پر تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ میرزا نصر اللہ خاں بھی ۱۸۰۶ء میں اچانک وفات پا گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ہاتھی پر سوار ہو کر نکلے تھے۔ اتفاقیہ گر گئے اور اسی حادثے میں انتقال پا گئے۔ اس طرح نہ محض ان کی تنخواہ بند ہوئی بل کہ سرکار انگلشیہ نے سونک اور سونسا کے پرگنے بھی اپنے قبضے میں لے لیے تاہم میرزا کے پس ماندوں کے لیے دس ہزار روپے سالانہ کی پنشن مقرر کر دی گئی۔ پس ماندوں میں مرحوم کی والدہ، تین بہنیں، ایک بھتیجی اور دو بھتیجے تھے۔

پنشن میں قطع و برید:

میرزا نصر اللہ بیگ خاں کی شادی نواب احمد بخش خاں والی فیروز پور جھرکا کی ہمشیرہ سے ہوئی تھی اور ان کے پس ماندوں کی پنشن فیروز پور جھرکا ہی کی ریاست سے متعلق کر دی گئی۔ نواب نے پہلے دس ہزار روپے کی رقم گھٹا کر پانچ ہزار کی پھر اس پانچ ہزار میں سے دو ہزار روپے کا حصہ دار خواجہ حاجی کو بنا دیا، جو میرزا نصر اللہ بیگ خاں کے رسالے کا ایک افسر تھا اور میری معلومات کے مطابق اسے میرزا کے خاندان سے کوئی نسبی علاقہ نہ تھا اس لیے پسماندوں میں شمار نہیں ہو سکتا تھا۔ خود میرزا غالب کا بیان ہے کہ میرے دادا کے ملازموں میں ایک شخص خواجہ مرزا کا نام تھا جو بارگیر (سائیس) کی حیثیت میں پانچ سو روپے تنخواہ پاتا تھا۔ میرزا کے دادا کی اہلیہ کی ایک بیوہ بہن تھی، جس کی صرف ایک بیٹی تھی۔ میرزا کے دادا نے اس بیٹی کی شادی خواجہ مرزا سے کر دی، اس کا بیٹا خواجہ حاجی تھا۔

ظاہر ہے کہ میرزا قوقان بیگ خاں کی بیگم کی بھانجی کا بیٹا، کسی بھی صورت میں قوقان بیگ خاں کے خاندان کا فرد نہیں ہو سکتا تھا۔ غرض دو ہزار کی یہ رقم خواجہ حاجی کے حوالے کر دینے کے بعد میرزا کے متعلقین کے لیے صرف تین ہزار روپے سالانہ کی رقم رہ گئی جو بہ صورت ذیل تقسیم ہوئی:

والدہ و ہمشیرگان میرزاے مرحوم	پندرہ سو روپے
برادرزادگان میرزاے مرحوم	پندرہ سو روپے
(میرزا غالب اور میرزا یوسف)	

پندرہ سو روپے میں سے میرزا غالب کو محض ساڑھے سات سو روپے سالانہ یا ساڑھے باسٹھ روپے ماہانہ ملتے تھے۔ ابتداء میں غالب یا ان کے عزیزوں میں سے کسی نے اس قطع و برید کے خلاف اعتراض نہ کیا۔ اس کی کئی وجہیں ذہن میں آتی ہیں مثلاً گھر میں کوئی بالغ مرد نہ تھا جو اصل مطالبے کا تعاقب کرتا۔ نواب احمد بخش کے ساتھ قریبی رشتہ تھا اس لیے ان کے خلاف مقدمہ کھڑا کرنا غیر مناسب سمجھا گیا۔ نواب موصوف مقررہ پنشن کے علاوہ بھی ان لوگوں کو کچھ رقمیں دیتے رہتے تھے اس لیے قانونی کارروائی خلاف تقاضاے احسان نظر آئی۔ سب سے آخر میں یہ کہ پہلی رشتہ داری کی بنا پر خود میرزا کی شادی نواب احمد بخش خاں کی بھتیجی سے ہو گئی۔ اس طرح وہ احمد بخش خاں کے ہم خاندان بن گئے تھے۔ ۱۸۲۶ء میں خواجہ حاجی نے وفات پائی جسے نواب احمد بخش خاں نے پنشن میں دو ہزار کا حصہ دار بنا لیا تھا اور یوں قانونی کارروائی کا بہت اچھا موقع پیدا ہو گیا۔

نواب احمد بخش خاں کا معاملہ:

مالک رام صاحب نے خود میرزا غالب کی ایک درخواست (جو ۲۸؍اپریل ۱۸۲۸ء کو پنشن کے سلسلے میں پیش کی گئی تھی) کی بنا پر لکھا ہے کہ میرزا نے کئی مرتبہ نواب احمد بخش خاں سے یہ ذکر کیا اور کہا کہ خواجہ حاجی کو کس وجہ سے ہماری خاندانی پنشن میں شریک کیا گیا؟ نواب کا جواب یہ تھا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں لارڈ لیک کے روبرو کہہ چکا ہوں کہ خواجہ حاجی نصر اللہ بیگ خاں کا رشتہ دار ہے۔ اب اس کے خلاف کچھ کہوں تو میری سبکی ہو گی۔ البتہ خواجہ حاجی کے مرتے ہی یہ دو ہزار بھی آپ لوگوں کے لیے مقرر کرا دوں گا۔

نواب ممدوح خود بھی وقتاً فوقتاً کچھ رقم میرزا کو دے دیتے تھے جیسا کہ خود میرزا نے ایک مقام پر لکھا ہے۔

ادھر خواجہ حاجی نے نصر اللہ بیگ خاں کی ناگہانی وفات پر ان کا سروسامان اپنے قبضے میں لے لیا کیوں کہ وہ بیگم قوقان بیگ خاں کی بھانجی کا بیٹا ہونے کے باعث دوسرے ملازموں کے مقابلے میں خاندان کا زیادہ قریبی فرد سمجھا جاتا تھا۔ نصر اللہ بیگ خاں کے دونوں بھتیجے یعنی میرزا غالب اور میرزا یوسف اتنے چھوٹے تھے کہ کچھ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ ممکن ہے خواجہ حاجی نے اہلِ خاندان کے حقوق نگہداشت کے سلسلے میں خواتین تک کچھ باتیں پہنچائی ہوں اور وہ پچاس سواروں کے ساتھ نواب احمد بخش کے پاس پہنچ گیا۔

نواب احمد بخش خاں کو جاگیر ملی تھی تو یہ قرار پایا تھا کہ وہ پچیس ہزار روپے سالانہ حکومت کو ادا کرتے رہیں گے۔ پھر لارڈ لیک نے پچیس ہزار کی یہ رقم اس شرط کے ساتھ معاف کر دی کہ نواب موصوف دس ہزار روپے سالانہ نصر اللہ بیگ خاں کے پس ماندگاں کو دیں نیز خواجہ حاجی کے پچاس سواروں کا خرچ خود سنبھال لیں۔

نواب احمد بخش نے اوّلاً دس ہزار کی رقم گھٹا کر پانچ ہزار کرائی۔ پھر خواجہ حاجی کو دو ہزار کا حصہ دار بنا دیا گویا اس طرح اپنے لیے پچیس ہزار میں سے بیس ہزار رکھ لینے کا انتظام کر لیا اور اس تخفیف و تصرف کی پوری زد نصر اللہ بیگ خاں کے متعلقین پر پڑی۔

خواجہ حاجی ۱۸۲۶ء میں فوت ہو گیا تو نواب کے لیے اچھا موقع تھا کہ اصل تصرف کی تلافی کرا دیں۔ میرزا غالب نے اس کے لیے کوشش بھی کی لیکن سوء اتفاق سے نواب اس زمانے میں زخمی ہو گئے تھے اور انھوں نے اپنی اسی حالت کو کچھ نہ کر سکنے کا بہانہ بنایا۔ اس طرح خواجہ حاجی کے حصے کی رقم ان کے بیٹوں کے نام منتقل ہو گئی اور نصر اللہ بیگ خاں کے متعلقین بہ دستور ستم زدہ رہ گئے۔

میرزا غالب کا اپنا ٹھاٹھ امیرانہ تھا پھر میرزا یوسف پر ۱۸۲۵ء میں دیوانگی کا دورہ پہلی مرتبہ پڑا۔ اس وجہ سے میرزا کو سخت مالی پریشانیاں لاحق ہوئیں۔ ان اضطراب انگیز حالات میں وہ خاندانی پنشن کی بحالی کے لیے راہگرائے کلکتہ ہوئے۔ اس سلسلے میں ایک اور محرک کا ذکر ضروری ہے۔ نواب احمد بخش نے اپنی جائداد زندگی ہی میں بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دی تھی۔ فیروز پور جھرکا کی ریاست شمس الدین احمد خاں کو دے دی اور لوہارو دونوں چھوٹے بیٹوں کے حوالے کر دیا۔ بیٹوں کے درمیان شدید کشمکش تھی جس کی وجہ سے خاندان کے افراد دو حصوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ میرزا غالب اور ان کی بیگم چھوٹے بیٹوں کے ساتھ تھے اور انھیں شمس الدین احمد خاں سے شدید اختلاف تھا۔ میرا خیال ہے

کہ وہ لوگ بھی میرزا کو پنشن کے سلسلے میں چارہ جوئی پر آمادہ کرنے کے موجب بنے ہوں گے۔

اسی پنشن کے سلسلے میں غالب نے ۱۸۲۷ء میں کلکتہ کا سفر اختیار کیا جو اس زمانے میں حکومت انگلشیہ کا مرکز تھا۔ میرزا کے مطالبات یہ تھے:

۱۔ دس ہزار روپے کی جو رقم ابتداء میں مقرر ہوئی تھی اسے بحال کیا جائے۔

۲۔ خواجہ حاجی کو میرزا نصر اللہ بیگ کے پسماندوں میں شامل کر کے دو ہزار روپیہ سالانہ دینے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ یہ رقم نیز پانچ ہزار سالانہ کی گھٹائی ہوئی رقم، ۱۸۰۶ء سے یک مشت ادا کی جائے۔

۳۔ آیندہ کے لیے پنشن فیروز پور جھرکا کی ریاست کے بجائے سرکار انگلشیہ کے خزانے سے متعلق کر دی جائے۔

دعویٰ ریاست فیروز پور جھرکا کے خلاف تھا جس کے والی نواب احمد بخش خاں کے فرزند اکبر نواب شمس الدین احمد خاں بن گئے تھے۔ ان کی طرف سے یہ جواب دعویٰ پیش ہُوا کہ دس ہزار روپے کی پنشن میں نصف کی تخفیف اور بقیہ رقم میں خواجہ حاجی کا شمول لارڈ لیک کے حکم سے ہُوا جو ابتدائی پنشن مقرر کرنے کا ذمہ دار تھا۔ مقدمہ خاصی دیر تک جاری رہا۔ میرزا غالب لارڈ لیک کے دُوسرے حکم سے بالکل بے خبر تھے اور کہتے تھے کہ اگر یہ حکم جاری بھی ہُوا تو خلافِ قاعدہ تھا اور اس کا کوئی ریکارڈ دفتر میں موجود نہیں، نہ کسی بڑے یا چھوٹے حاکم کا کوئی ذاتی حکم سرکار کے منظورہ حکم کا ناسخ ہو سکتا ہے۔ آخر حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ لارڈ لیک کا دوسرا حکم سر جان میلکم کے پاس بھیج کر پوچھا جائے کہ آیا اُس پر مُہر اور دست خط لارڈ موصوف ہی کے ہیں؟ سر جان میلکم پنشن کے تقرر کے زمانے میں لارڈ لیک کا سیکرٹری تھا۔ اُس نے مُہر اور دست خط کی تصدیق کر دی تو اصل حکم صحیح تسلیم کر لیا گیا اگرچہ محض اس بناء پر یہ حکم خلافِ انصاف تھا اور میرزا غالب کا دعویٰ خارج ہو گیا۔ اس طرح انھیں ساڑھے سات سو روپے سالانہ پر قناعت کرنا پڑی۔

شادی اور دہلی میں توطن:

میرزا غالب کی شادی تیرہ برس کی عمر میں نواب احمد بخش خاں کے بھائی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بڑی صاحب زادی امراؤ بیگم سے ہُوئی۔ اس تعلق کی بناء پر وہ پندرہ سولہ برس کی عمر میں آگرہ کی سکونت چھوڑ کر دہلی میں مقیم ہو گئے اور باقی زندگی اسی شہر میں گزاری۔ ان کے بھائی میرزا یوسف بھی آگرہ سے دہلی آ گئے تھے۔ وہ دیوانے ہو گئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں بحالت

دیوانگی فوت ہوئے۔ بیگم کی وجہ سے نواب احمد بخش خاں کا خاندان (بہ استثنائے شمس الدین احمد خاں) میرزا کا اپنا خاندان بن چکا تھا اس کے مختلف افراد کی اجمالی کیفیت یہ ہے:

۱۔ نواب غلام حسین مسرورؔ جو میرزا کے ہم زلف یعنی امراؤ بیگم کی چھوٹی بہن آبادی بیگم کے شوہر تھے۔

۲۔ میرزا زین العابدین خاں عارفؔ ابن غلام حسین خاں مسرورؔ جنھیں امراؤ بیگم نے اپنا بیٹا بنا لیا تھا وہ ۱۸۵۲ء میں بہ عالم جوانی فوت ہوئے۔

۳۔ باقر علی خاں کاملؔ اور حسین علی خاں شاداںؔ، فرزندان زین العابدین خاں عارفؔ، حسین علی خاں شاداںؔ کو بیگم غالب بچپن ہی میں اپنے پاس لے آئی تھی۔ عارفؔ کی وفات کے بعد باقر علی خاں بھی میرزا کے پاس آ گئے۔ یہ میرزا کی زندگی میں الور میں ملازم ہو گئے تھے۔ میرزا کی وفات کے بعد ملازمت چھوڑ کر گھوڑوں کی تجارت شروع کر دی اور جوانی میں فوت ہو گئے۔ میرزا کی وفات کے بعد حسین علی خاں رام پور میں پچیس روپے کے ملازم ہو گئے تھے۔ اپنے بڑے بھائی کی وفات کے بعد یہ بھی چل بسے۔

۴۔ علی بخش خاں ابن الٰہی بخش خاں معروف یعنی بیگم غالب کے حقیقی بھائی۔ ابتداء میں انھیں فیروز پور جھرکا سے سو روپے پنشن ملتی تھی جو ریاست کی ضبطی کے بعد نصف رہ گئی۔ ’’غدر‘‘ کے بعد یہ دہلی سے باہر رہے۔ ۱۸۶۴ء میں فوت ہوئے۔ ان کے بیٹے غلام فخر الدین خاں بہادر شاہ ثانی کی جاگیر کوٹ قاسم کے منتظم تھے۔ ’’غدر‘‘ کے بعد ان پر مقدمہ چلا لیکن بری ہو گئے۔ ان کی شادی میرزا کے بھائی یوسف خاں کی اکلوتی بیٹی سے ہوئی تھی۔ ان کے بیٹے محمد سعید خاں حیدر آباد چلے گئے تھے۔ کئی برس کی ملازمت کے بعد درویشی اختیار کر لی۔ ان کے بیٹے میرزا نصر اللہ بیرسٹر ایٹ لاء دولت آصفیہ میں صدر محاسب بن گئے تھے۔ معروفؔ کے دیوان کی پہلی جلد انھی نے شائع کی تھی۔

۵۔ نواب شمس الدین احمد خاں (نواب احمد بخش خاں کے فرزند اکبر) ریاست فیروز پور جھرکا کے والی بنے۔ دو چھوٹے بھائیوں سے ان کا جھگڑا ہو گیا جنھیں نواب احمد بخش خاں نے لوہارو کی جاگیر دے دی تھی۔ شمس الدین احمد خاں چاہتے تھے کہ لوہارو میں بھی ان کا انتظام ہو اور چھوٹے بھائیوں کو ایک مقررہ رقم ملتی رہے۔ انتظام ریاست سے کوئی سروکار نہ ہو۔ بھائی کہتے تھے کہ لوہارو کے علاوہ والد کی منقولہ جائداد میں سے بھی حصہ ملنا چاہیے۔ یہ جھگڑا دیر تک چلتا رہا۔ آخر ولیم فریزر ریذیڈنٹ دہلی کی کوشش سے لوہارو چھوٹے بھائیوں کو مل گیا۔ اس وجہ سے شمس الدین

احمد خاں اور ولیم فریزر کے درمیان دشمنی پیدا ہو گئی جس نے عام شہرت حاصل کر لی۔ ۱۸۳۵ء میں فریزر مارا گیا۔ اس کے قتل کا الزام شمس الدین احمد خاں اور اس کے ایک غلام پر لگا۔ دونوں کو پھانسی ملی اور ریاست ضبط ہو گئی۔

۶۔ امین الدین احمد خاں (نواب احمد بخش خاں کے منجھلے فرزند) جنھیں لوہارو کا والی تسلیم کیا گیا یہ ۱۸۶۹ء میں فوت ہوئے۔ نواب علاء الدین احمد خاں علائی (غالب کے خلیفہ ثانی) انھی کے فرزند اکبر اور جانشین تھے۔ علائی نے ۱۸۷۴ء میں وفات پائی اور ان کے فرزند اکبر نواب امیر الدین احمد خاں رئیس بنے جن کا دوسرا نام ''فرخ میرزا'' تھا اور غالب انھیں ''فرخ سیر'' کہا کرتے تھے۔

۷۔ ضیاء الدین احمد خاں نیرّ (نواب احمد خاں کے فرزند اصغر) جنھیں لوہارو سے حصّے کی رقم ملا کرتی تھی۔ اردو اور فارسی کے ادیب اور شاعر تھے۔ اُردو میں نیرّ اور فارسی میں رخشاں تخلّص تھا۔ تاریخ کے یگانہ عالم مانے جاتے تھے۔ ایلیٹ نے اپنی تاریخ مرتب کرتے وقت زیادہ تر نادر قلمی نسخے انھی سے لیے تھے۔

۸۔ شہاب الدین احمد ثاقب (نیرّ کے فرزند اکبر) ۱۸۶۹ء میں میرزا غالب کے بعد فوت ہوئے۔ ان کے چار بیٹے تھے:

(۱) شجاع الدین احمد خاں تاباں، جن کی شادی باقر علی خاں کامل کی بڑی صاحب زادی سے ہُوئی تھی اور وہ لاولد فوت ہُوئے۔

(۲) سراج الدین احمد سائل جن کا انتقال چند سال (۱) پیش تر ہوا۔

(۳) بہاء الدین احمد خاں: ان کی صرف ایک صاحبزادی تھی جن کی شادی نواب سر ذوالفقار علی مرحوم رئیس مالیر کوٹلہ سے ہوئی۔ یہ صاحبزادی یعنی بیگم ذوالفقار علی خاں بفضلِ خدا زندہ ہیں۔

(۴) ممتاز الدین احمد خاں کی بھی ایک ہی بیٹی تھی جس کی شادی سر امیر الدین احمد خاں سے ہوئی۔

۹۔ سعید الدین احمد خاں طالب (نیرّ کے فرزند اصغر) لاولد فوت ہوئے۔

شغل شعر و ادب:

میرزا غالب نے معمول کے مطابق عربی اور فارسی کی تعلیم پائی۔ گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنے

لگے۔ اُردو ان کی مادری زبان تھی اس لیے کہ ان کی والدہ ہندوستانی تھیں۔ فارسی اس عہد کی مروّجہ تعلیمی زبان تھی جس طرح بعد میں انگریزی تعلیمی زبان بنی۔ ترکی بھی ان کے گھر کی ایک بولی تھی۔ خواجہ حالؔی نے لکھا ہے کہ ان کے دادا کی زبان ترکی تھی اور ہندوستانی بہت کم سمجھتے تھے۔ والد اور چچا بھی یقیناً ترکی جانتے ہوں گے اور میرزا بھی اس سے ناواقف نہ ہوں گے۔ وہ تیرہ چودہ برس کے تھے جب ایک نومسلم پارسی بطریقِ سیاحت آگرہ پہنچا اور کم وبیش دو برس میرزا کے ہاں ٹھہرا رہا۔ اس کا اصل نام ہرمزد تھا۔ مسلمان ہونے کے بعد عبدالصمد نام اختیار کیا۔ یہ فارسی اور عربی کا اجل فاضل اور منطق و فلسفہ کا یگانہ ماہر تھا۔ خصوصاً قدیم فارسی کے حقائق وغوامض پر اسے پورا پورا عبور حاصل تھا۔ اسی عبدالصمد کی تعلیم نے میرزا کے طبعی جوہروں کو جلا دے کر روشن کر دیا۔ مروّجہ تعلیم کے سوا انھوں نے جو کچھ سیکھا، عبدالصمد ہی سے سیکھا۔

شاعری کا جوہر انھیں مبدأ فیاض سے ملا تھا۔ طبیعت دقّت پسند تھی۔ میرزا عبدالقادر بیدؔل کا کلام پڑھا تو بیدؔل ہی کے رنگ میں اُردو شعر کہنے لگے۔ اس دور کا کلام ”نسخۂ حمیدیہ“ کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اس کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شروع میں بیدؔل میرزا کے دل ودماغ پر بے طرح مسلّط تھا۔ انھوں نے مختلف غزلوں کے مقطعوں میں اس کا اظہار بھی کر دیا ہے جیسے جیسے طبیعت میں پختگی آتی گئی طرزِ فکر ونظر میں تبدیلی یا کہنا چاہیے صفائی اور پختگی آتی گئی۔ پھر وہ فارسی گوئی پر متوجہ ہُوئے یہاں تک کہ دورِ متوسط میں اُردو کے بجائے فارسی ہی کے شاعر سمجھے جاتے تھے۔

دہلی میں اقامت کے بعد شاعروں کے عام طریقے کے مطابق انھوں نے شاہی دربار سے بھی تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ عرفؔی اور نظیرؔی کے ہم پایہ تھے لیکن ان کے زمانے کا شاہی دربار مغلوں کی سطوت وشوکت کا محض ایک بے رنگ نقش رہ گیا تھا۔ اس لیے میرزا کا کمال شاعری جس قدردانی ومنزلت شناسی کا حق دار تھا وہ اسے نصیب نہ ہُوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر شاہ ثانی کی مدح میں وہ ایک قصیدہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ ۱۸۳۷ء میں ابوظفر سراج الدین تخت نشین ہُوا تو اس کی مدح میں قصیدوں پر قصیدے کہنے لگے۔ ان قصیدوں کے محرک غالباً وہ لوگ تھے جو میرزا کے دوست تھے اور دربار میں انھیں خاصا رسوخ حاصل تھا۔ انھی میں سے شیخ نصیر الدین عرف کالے صاحب (بہادر شاہ کے پیر) اور حکیم احسن اللہ خاں کی سفارش سے ۱۸۵۰ء میں میرزا کو تیموری خاندان کی تاریخ لکھنے کا کام سونپا گیا۔ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ خطاب ملا اور پچاس روپے مہینہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ پوری

تاریخ کا نام ”پرتوستان“ تھا۔ اس کی دو جلدیں تجویز ہوئیں۔ جلد اول میں ابتدائے آفرینش سے ہمایوں بادشاہ تک کا حال۔ جلد دوم میں جلال الدین اکبر سے بہادر شاہ ثانی تک کا حال۔ پہلی جلد کا نام ”مہر نیمروز“ اور دوسری کا نام ”ماہ نیم ماہ“ قرار پایا۔ میرزا نے پہلی جلد ۱۸۵۲ء میں مکمل کر دی تھی۔ دوسری کی تسوید و ترتیب شروع ہی نہ ہو سکی۔

دربار شاہی سے تعلق کے زمانے میں میرزا نے اپنی اکثر بہترین اُردو غزلیں کہیں۔ اس لیے کہ قلعے میں مشاعرے ہوتے تھے جن میں میرزا کو شریک ہونا پڑتا تھا۔ بہادر شاہ ویسے بھی اُردو غزلیں طلب کرتے رہتے تھے جیسا کہ خود میرزا نے ۱۸۵۱ء کے ایک خط میں منشی نبی بخش حقیر کو لکھا ہے مغلوں کی حکمرانی کے تمام مناصب انگریزوں کے قبضے میں چلے گئے تھے۔ میرزا کے پاس شعر گوئی کے سوا کوئی ہنر نہ تھا اس لیے انگریز حاکموں اور ملکہ وکٹوریا کی مدح میں بھی انھوں نے قصیدے کہے۔ ایک قصیدے میں کس درد و سوز سے کہتے ہیں:

باصلیم فتادہ کار بہ دہر   علمِ کاویاں نمی خواہم

انھوں نے چند قصیدے متفرق امراء کی مدح میں بھی کہے مثلاً نصیر الدین حیدر، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ والیانِ اودھ، نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں والیان رام پور، سر سالار جنگ وزیر اعظم حیدر آباد، نواب وزیر الدولہ والی ٹونک، راجا شیو دھیان سنگھ مسند نشین الور، مہاراجا نرندر سنگھ والی پٹیالہ۔ چند قصیدے دوستوں کی مدح میں ہیں: مثلاً نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مفتی صدر الدین آزردہ، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ، ان قصیدوں کا مدعا میرزا غالب کی اصطلاح خاص میں محض ”بھٹئی“ نہ تھا، بل کہ قصیدہ گوئی کمالات شاعری کی نمایش کا ایک متداول ذریعہ تھی۔

خاندانی پنشن کے علاوہ میرزا سات برس تک قلعے سے تنخواہ پاتے رہے۔ انھیں مختلف امراء کی طرف سے صلے ملے ہوں گے۔ نواب یوسف علی خاں والی رام پور نے مستقل تنخواہ مقرر کر دی تھی جو ان کے جلیل القدر فرزند نواب کلب علی خاں کے عہد حکومت میں بھی جاری رہی۔

قاطع برہان کا ہنگامہ اور وفات:

میرزا کو ہندوستان کے عام فارسی شعرا کی طرز و روش پسند نہ تھی اور میرزا انھیں مستند بھی نہیں

مانتے تھے۔ کلکتہ کے ایک اجتماع میں ان کے کلام پر اعتراض ہوئے اور معترضین نے قتیلؔ کی سند پیش کی میرزا نے سند کو بے پروائی سے ٹھکرا دیا۔ اس پر ہنگامہ بپا ہُوا اور میرزا نے معذرت کے طور پر مثنوی ”بادِ مخالف“ لکھی۔ اس میں ایک جگہ فارسی کے مشہور اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

آنکہ طے کردہ ایں مواقف را   چہ شناسد قتیلؔ و واقفؔ را

ایک غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں:

غالبؔ سوختہ جاں راچہ بہ گفتار آری   بہ دیارے کہ ندانند نظیریؔ ز قتیلؔ

”غدر“ کے زمانے میں ان کے پاس ”برہان قاطع“ (مولفہ محمد حسین تبریزی ثم دکنی) کے مطبوعہ نسخے کے سوا کوئی کتاب نہ تھی۔ ”غدر“ کے حالات میں ”دستنبوے“ لکھنے سے فارغ ہوئے تو ”برہان قاطع“ کو دیکھنے لگے۔ اس میں جو غلطیاں نظر آئیں ان پر نشان لگاتے گئے۔ پھر ایک کتاب مرتب کر دی جس کا نام ”برہان قاطع“ کی نسبت سے ”قاطع برہان“ رکھا۔ یہ فارسی کے ہندوستانی لغت نگاروں کو کھلا چیلنج تھا۔ ”قاطع برہان“ کے رد و اثبات میں کئی کتابیں لکھی گئیں اور میرزا کی زندگی کے آخری دم تک تغلیط و توثیق کا یہ ہنگامہ گرم رہا۔ ”قاطع برہان“ کو بعض فوائد کے اضافے کے ساتھ انھوں نے دوبارہ چھپوایا تو اس کا نام ”درفش کاویانی“ رکھا۔

تہتر برس، تین مہینے اور تئیس دن کی عمر پا کر میرزا ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء (۲-ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ) کو اس خاکداں سے راہ گرائے عالم بقا ہوئے۔ بیگم نے پورے ایک برس بعد انتقال کیا۔

میرزا کے سات بچے ہوئے لیکن کوئی پندرہ مہینے سے زیادہ زندہ نہ رہا صرف میرزا کا کلام بقائے نام اور شہرت عام کی دستاویز رہ گیا۔

تصانیف: میرزا کی تصانیف کا مختصر نقشہ یہ ہے:

۱۔ کلیات نظم فارسی:

اس میں قطعات، ترکیب بند، ترجیع بند، مثنویاں، قصیدے، غزلیں اور رباعیاں غرض سب کچھ شامل ہے۔ نثر میں اس کا مقدمہ نہایت پُر زور لکھا ہے اور خاتمہ بھی ایسا ہی ہے۔

۲۔ کلیات نثر فارسی:

اس میں میرزا کی تین کتابیں شامل ہیں:

(۱) ''پنج آہنگ'' جو فارسی کے قواعد، تقریظوں اور فارسی خطوں پر مشتمل ہے۔

(۲) ''مہر نیم روز'' یعنی تاریخ خاندانِ تیموری۔

(۳) ''دستنبوے'' جس میں ''غدر'' کے دیدہ وشنیدہ حالات درج ہیں۔ آخری کتاب خالص فارسی ہے اور اس میں عربی کا ایک لفظ بھی نہیں؟

۳۔ دیوانِ اُردو:

اس کے پانچ ایڈیشن صرف میرزا کی زندگی میں شائع ہو چکے تھے۔ بعد میں بیسیوں ایڈیشن چھپے اور متعدد شرحیں لکھی گئیں۔

۴۔ نسخہ حمیدیہ:

میرزا کے ابتدائی اُردو کلام کا مجموعہ جسے وہ قلم انداز کر چکے تھے۔

۵۔ سبدچیں:

میرزا کا وہ فارسی کلام جو کلیات نظم فارسی میں شامل نہ ہو سکا یا کلیات کی طباعت کے بعد کہا گیا۔

۶۔ باغ دودر:

جس میں وہ اشعار اور مکاتیب ہیں جو پہلے مجموعوں میں شامل نہ تھے۔ حقیقتاً اسے سبدچیں کی طبع ثانی کہنا چاہیے۔

۷۔ عودِ ہندی:

اُردو خطوط کا وہ مجموعہ جو میرزا کی وفات سے چار ماہ پیش تر میرٹھ میں چھپا تھا۔

۸۔ اُردوے معلّٰی حصہ اوّل:

اُردو خطوط کا وہ مجموعہ جو میرزا کی زندگی میں مرتب ہُوا۔ دہلی میں چھپ رہا تھا لیکن میرزا کی وفات کے بعد طباعت مکمّل ہُوئی۔

۹۔ اُردوے معلّٰی حصہ دوم:

جو اُردو خطوط پہلے حصے میں شامل نہیں ہوئے تھے ان کا ایک مجموعہ خواجہ حالؔی نے مرتب کر کے مطبع مجتبائی کے حوالے کر دیا تھا۔ ۱۸۹۹ء میں یہ بھی حصہ اوّل کے ساتھ شائع ہو گیا۔

۱۰۔ نادر خطوطِ غالب:

میرزا کے ستائیس اردو مکاتیب کا مجموعہ جو کرامت حسین صاحب کرامتؔ ہمدانی بہاری، صفیر بلگرامی اور صوفی منیری کو لکھے گئے تھے۔ میرے نزدیک ان کا مستقل وجود محلِ نظر ہے۔

۱۱۔ مکاتیبِ غالب:

میرزا کے ان خطوں کا مجموعہ جو والیان رام پور کو لکھے گئے۔

۱۲۔ متفرقاتِ غالب:

میرزا کے فارسی نظم و نثر کے تبرکات۔

۱۳۔ نادراتِ غالب:

میرزا کے ان خطوط کا مجموعہ جو منشی نبی بخش حقیرؔ کو لکھے گئے تھے۔

۱۴۔ انتخابِ غالب:

اردو اور فارسی اشعار کا وہ انتخاب جو میرزا نے نواب کلب علی خاں والی رام پور کی فرمائش پر مرتب کیا تھا۔ یہ بھی دربار رام پور کی توجہ سے چھپ گیا ہے۔

۱۵۔ قاطع برہان:

جسے بعض فوائد کے اضافے کے ساتھ دوبارہ ''درفش کاویانی'' کے نام سے چھپوایا گیا۔

۱۶۔ نامۂ غالب:

''قاطع برہان'' کی بحث کے سلسلے کا وہ طویل خط جو میرزا رحیم بیگ مؤلف ''ساطع برہان'' کے نام لکھا گیا تھا، الگ بھی چھپ گیا تھا، ''اودھ اخبار'' میں بھی شائع ہوا تھا۔ ''عود ہندی'' میں بھی شامل ہو گیا تھا۔

۱۷۔ تیغ تیز:

''قاطع برہان'' کی بحث کے سلسلے کا ایک اُردو رسالہ۔

۱۸۔ نکات ورقعات غالب:

اس میں ''پنج آہنگ'' سے فارسی قواعد والے حصّے کا اردو ترجمہ کر کے پندرہ فارسی خطوط شامل کر دیے گئے تھے۔

۱۹۔ قادرنامہ:

بچّوں کے نصاب کی کتاب۔

۲۰۔ لطائف غیبی:

''قاطع برہان'' کی بحث کے سلسلے کی ایک کتاب، جو سیف الحق میاں داد خاں سیاح کے نام سے چھپی۔

۲۱۔ سوالات عبدالکریم:

یہ بھی قاطع برہان کے سلسلے کا ایک رسالہ ہے جو عبدالکریم کے نام سے چھپا لیکن دراصل میرزا نے لکھا تھا۔

۲۲۔ گل رعنا:

میرزا نے اپنے عزیز دوست سراج الدین احمد کی فرمایش پر اُردو اور فارسی کلام کا ایک انتخاب مرتّب کیا تھا۔ اس کا نام ''گل رعنا'' رکھا تھا۔ اس کا صرف ایک حصّہ مولانا حسرت موہانی کے پاس تھا جیسا کہ ایک مرتبہ مرحوم نے خود بتایا۔ اس کا ایک نسخہ مالک رام صاحب کے پاس ہے اور ایک یا دو نسخے بعض اور اصحاب کے پاس ہیں۔ ایک نسخہ اب ''مجلس یادگار غالب'' اور ریسرچ سوسائٹی پاکستان کے اشتراک سے شائع ہو رہا ہے۔

میرزا کا مقام ادب وشعر میں:

ادب وشعر میں میرزا کی رفعت و برتری اب کسی شرح کی محتاج نہیں رہی۔ جامعیت ان کی

نمایاں ترین خصوصیت ہے۔ بے شائبہ مبالغہ ہندوستان نے امیر خسرو کے بعد شاعری میں ان جیسا جامع شخص پیدا نہیں کیا۔ وہ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں کے یگانہ شاعر تھے۔ حافظ اور نظیری کی طرح محض غزل ہی میں نہیں، عرفی کی طرح محض غزل اور قصیدے ہی میں نہیں بل کہ تمام اصنافِ سخن میں ان کی رفعت مرتبت عموماً مسلّم ہے۔ غزل، قصیدہ، رباعی، مثنوی، ترکیب بند، ترجیع بند، قطعہ، مرثیہ، نوحہ وغیرہ کوئی صنف نظم نہیں جس میں ان کا پایہ یکساں بلند اور مختلف اصناف کے مشاہیر اساتذہ کے برابر نہ ہو۔ اُردو نظم میں اگرچہ ان کا کلام تھوڑا ہے لیکن جتنا ہے ہر لحاظ سے ہماری قومی زبان کا نہایت گراں بہا سرمایہ ہے پھر میرزا فارسی نثر کے یگانہ ادیب تھے۔ فارسی کلیات نثر میں ہر رنگ اور ہر انداز کی نثریں موجود ہیں۔ ابوالفضل کا سرمایہ شہرت صرف نثر نگاری تھا، میرزا نثر میں اس سے پیچھے نہیں اور نثر نگاری ان کے کمالات فطری کی بہار آفرینی کا محض ایک کرشمہ ہے۔ اُردو نثر میں ان کے صرف مکاتیب ہیں یا چند تقریظیں اور دیباچے لیکن حسنِ کلام، لُطفِ بیان، روانی وانسجام، بے ساختگی اور دل آویزی میں نثر کا ایسا جلیل الشان مجموعہ نہیں مل سکتا۔

اگر میرزا کے خداداد جوہروں کا اندازہ اس بناء پر کیا جائے کہ زندگی میں انھیں شعروادب کے ذریعہ سے کس قدر مالی منافع حاصل ہوا یا انھوں نے کون کون سے اعزازات پائے تو لاریب خود ان کی زبان مستعار لے کر کہنا پڑے گا۔

درآں دیار کہ گوہر خریدن آئیں نیست
دکاں کشودہ ام و قیمتِ گہر گویم

یا

بہ کلبہ ام گہرِ شب چراغِ خس پوش است
سخن ز تیرگی طالعِ ہنر گویم

لیکن اگر ان کی شہرت وناموری اور وفات کے بعد روز افزوں قدر ومنزلت کو سامنے رکھا جائے تو تسلیم کرنا چاہیے کہ علّامہ اقبال مرحوم کو چھوڑ کر اُردو زبان کے کسی شاعر کو عقیدت عامہ کی ویسی گراں بہا متاع نصیب نہیں ہوئی جیسی میرزا کے حصّے میں آئی۔ انھوں نے خود پیش گوئی کی تھی:

کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بوده است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

اس کا روشن ثبوت یوں مل گیا کہ ۱۹۶۹ء میں ان کی صد سالہ برسی دُنیا بھر میں منائی گئی۔

(ماخوذ دیباچہ خطوط غالب طبع چہارم ۱۹۶۸ء
شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور)

احوالِ غالب کی گُم شدہ کڑیاں

خاندان دہلی سے آگرہ کیوں کر پہنچا:

میرزا غالبؔ کے احوال و سوانح اور شعر و ادب پر اتنی کتابیں ترتیب پا چکی ہیں کہ اگر انھیں یکجا رکھا جائے تو ایک چھوٹا سا کتب خانہ بن جائے۔ شعراء کو تو چھوڑ دیجیے اس سرزمین کے شاید ہی کسی ممتاز و مشہور فرد کو تحریر و نگارش اور تحقیق و کاوش میں اعتنا و توجہ کا وہ مقام حاصل ہُوا ہو جو میرزا غالب کے حصے میں آیا۔ شاید اقبالؔ اس باب میں میرزا سے ہمسری کا دم بھر سکتا ہے تاہم میرزا کی زندگی کے بعض گوشے ایسے بھی ہیں جو اب تک پوری طرح روشنی میں نہیں آ سکے۔ ان میں سے ایک گوشہ یہ بھی ہے کہ میرزا کا خاندان دہلی سے آگرہ کیوں کر پہنچا۔

مسئلے کی حیثیت:

نظر بہ ظاہر یہ مسئلہ چنداں اہمیت نہیں رکھتا اور شاعر کی زندگی کے بیش تر سوانح حقیقتاً اہم نہیں ہوتے۔ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ میرزا کے جدامجد، والد ماجد اور عم محترم طالع آزما سپاہی تھے۔ جب ان کے جدامجد سمرقند سے لاہور ہوتے ہوئے دہلی پہنچ گئے تو وہاں سے آگرہ چلے جانا ہرگز مشکل نہ تھا لیکن اگر ہم دوسرے گوشوں میں چھان بین اور کرید کو ایک اہم علمی کام سمجھتے ہیں تو اس معاملے پر کیوں غور و فکر نہ کریں جس کے صحیح حل پر ایک سے زیادہ پیچیدگیوں کا سلجھاؤ موقوف ہے۔ ممکن ہے اس طرح میرزا کے سوانح کی بعض اور کڑیوں کا سراغ مل جائے جو ہماری معلومات میں خاصے قابل قدر اضافے کا باعث بن جائے۔

دادا کی ملازمت:

معلوم ہے کہ شاہ عالم ثانی کی سرکار میں میرزاؔ کے دادا کی ملازمت کا وسیلہ ذوالفقار الدولہ نجف خاں تھے۔ خواجہ حالیؔ مرحوم نے یادگار میں لکھا ہے:

> ”ذوالفقارالدولہ میرزا نجف خاں شاہ عالم کے دربار میں دخل کلّی رکھتے تھے۔ نجف خاں نے میرزا کے دادا کو سلطنت کی حیثیت کے موافق ایک عمدہ منصب دلوادیا اور پہاسو کا سیر حاصل پرگنہ ذات اور رسالے کی تنخواہ میں مقرر کرادیا“۔

میرزا کے دادا قوقان بیگ خاں کے متعلق تمام سوانح نگاروں کا بیان یہی ہے بل کہ یہ تصریح بھی موجود ہے کہ میرزا قوقان بیگ خاں پچاس گھوڑے اور نقارہ ونشاں سے ملازم ہوئے تھے۔

نقل مکان اور متعلقہ سوالات:

اب پہلا سوال یہ ہے کہ جب وہ شاہ عالم کی سرکار میں ملازم تھے اور پہاسو کا تعلقہ ان کی ذات اور رسالے کی تنخواہ کے لیے مقرر تھا جو ضلع بلند شہر میں واقع ہے تو وہ دہلی سے آگرہ کیوں منتقل ہوئے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر وہ دہلی سے آگرہ منتقل نہ ہُوئے تو انھوں نے اپنے بڑے بیٹے میرزا عبداللہ بیگ خاں کی شادی آگرہ میں کیوں کی؟ میرزا کے نانا خواجہ غلام حسین خاں کمیدان آگرہ کے رؤسا میں سے تھے اور بہ ظاہر میرزا قوقان بیگ خاں کی حیثیت زیادہ بلند نہ تھی۔ خواجہ غلام حسین خاں کیوں کر اپنی بیٹی کی شادی دہلی کے ایک غیر معروف اور اجنبی رسالدار کے بیٹے سے کردینے پر راضی ہوسکتے تھے جس کے ساتھ بُعد مکانی کے باعث تعارف کی بھی کوئی شکل نہ تھی؟ میرے محدود علم کے مطابق کسی بھی سوانح نگار نے ان امور پر توجہ نہیں کی، بل کہ میں سمجھتاہُوں کہ کسی کی طبیعت ان سوالات پر اٹکی ہی نہیں اور اٹکے بغیر تحقیق وکاوش کا احساس کیوں کر پیدا ہوسکتا تھا؟

”انتخاب یادگار“ کا بیان:

امیر مینائی مرحوم نے ”انتخاب یادگار“ میں فرمایا ہے:

”جداعلیٰ ان کے (میرزا غالب کے) ماوراٗالنہر سے ہندوستان میں آئے اور نواب نجف خاں کے عہد میں منصب دار شاہی رہے۔ جب ریاست مغلیہ برہم ہوگئی ملازم مہاراجا جے پور ہُوئے اور بودوباش شہر آگرہ میں اختیار کی“۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ذوالفقارالدولہ نجف خاں کی وفات کے بعد نہ شاہی ملازمت باقی رہی اور نہ پہاسو کا پرگنہ قبضے میں رہ سکتا تھا لہٰذا جے پور میں ملازمت کی ضرورت پیش آئی اور اس سلسلے میں دہلی کو چھوڑ کر آگرہ میں قیام اختیار کیا جو جے پور سے قریب تھا گویا دہلی سے نقل مکان میرزا کے دادا نے کیا تھا۔

یہ بیان ''انتخاب یادگار'' کے سوا کہیں نہیں ملتا۔ خود میرزا نے بھی اپنی تحریرات میں کہیں اس کی طرف اشارہ نہیں کیا حالاں کہ وہ ذاتی اور خاندانی حالات کے جزئیات حسب ضرورت بیان کرتے رہے۔ میرا خیال ہے کہ امیر مینائی مرحوم نے خود میرزا سے یہ واقعہ سُنا ہوگا۔ اغلب ہے اس کے بارے میں سوال کیا ہو تو میرزا کو تفصیل بتانے کی ضرورت پیش آئی ہو۔

ذوالفقار الدولہ نجف خاں:

اب ہمیں اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ کب ملازمت شاہی کے ترک کی ضرورت پیش آئی۔ ہمارے سامنے کوئی مستند بیان نہیں لیکن ذوالفقار الدولہ نجف خاں کی وفات کے بعد جو حالات پیش آئے انھیں سامنے رکھ کر زیادہ سے زیادہ قرین قیاس نقشہ تیار کر سکتے ہیں اگر اس کی روشنی میں تحقیق کی جائے تو اغلب ہے زیادہ مستند و موثق شہادتیں بھی میسر آ جائیں۔

ذوالفقار الدولہ نجف خاں نے ۲۶-اپریل ۱۷۸۲ء کو وفات پائی۔ وہ سلطنت مغلیہ کے دورِ زوال میں ایک غیر معمولی شخصیت کا حامل تھا۔ شجاعت و مردانگی میں فرد، نظم و نسق میں یگانہ، ہجوم مصائب میں اولوالعزم، فتح و کامرانی میں شفیق و رحم دل، سیرت پاکیزہ، کردار اُجلا، سلطنت کی شانِ قدیم کو از سرِ نو بحال کرنے میں سرگرم، میرزا غالب کی شاعری کی طرح ذوالفقار الدولہ نجف خاں کی ملک داری و سپہ گری بھی اکبر، جہان گیر اور شاہ جہاں کی بادشاہی کے لیے زیبا تھی۔

وارثوں میں کش مکش:

اس کے نرینہ اولاد نہ تھی۔ دو شخص اس کی جائداد اور مناصب کے وارث سمجھے جاتے تھے۔ ایک اس کا بھتیجا میرزا شفیع دوسرا افراسیاب خاں جسے نجف خاں کی ہمشیر نے بیٹا بنا لیا تھا اور ایک روایت کے مطابق نجف خاں بھی اسی کو بیٹا سمجھتا تھا۔

میرزا شفیع کے پاس فوج بھی زیادہ تھی اور امیری کا ساز و سامان بھی بہ افراط موجود تھا اگر ان دونوں میں مفاہمت ہو جاتی تو نجف خاں کے درست کردہ نظام میں کوئی خرابی پیدا نہ ہوتی لیکن نجف خاں کو ہمشیر نے اتحاد و اتفاق کی مصلحت سے بالکل بے پروا ہو کر اپنے متبنّیٰ کو آگے بڑھانے پر کمر باندھ لی۔ سوءِ اتفاق سے میرزا شفیع اس وقت دہلی میں موجود تھا چناں چہ افراسیاب خاں کو امیر الامرائی کا منصب دلایا گیا۔ گویا وہی نجف خاں کا وارث قرار پایا۔

میرزا شفیع فوج لے کر دہلی پہنچا تو شاہ عالم ثانی کا بڑا بیٹا اور ولی عہد شہزادہ جواں بخت اس کا حامی بن گیا۔ بادشاہ نے افراسیاب کی جگہ میرزا شفیع کو امیر الامرای کا منصب دے دیا۔ اس طرح کش مکش کا آغاز ہو گیا۔

شفیع اور افراسیاب کا قتل:

دربار کی حالت عجیب تھی۔ بڑے امراء میں سے کوئی شخص کسی مہم پر دہلی سے باہر جاتا تو اس کی غیر حاضری میں نئے جوڑ توڑ شروع ہو جاتے۔ وہ ابھی کوئی کام نہ کرنے پاتا کہ اپنے بچاؤ کے لیے اسے دہلی کا رُخ کرنا پڑتا۔ ایسے ہی ایک موقع پر میرزا شفیع ستمبر ۱۷۸۳ء میں مارا گیا۔ مشہور ہے کہ اس پر گولی چلانے کا ذمہ دار یا تو محمد بیگ ہمدانی تھا یا اس کا بھتیجا اسمٰعیل خاں لیکن اس حقیقت میں کوئی شبہہ نہیں کہ یہ قتل افراسیاب خاں کے ایما و اشارہ سے ہُوا چناں چہ وہ پھر بے خلش امیر الامرای بن گیا۔

اب افراسیاب خاں اور محمد بیگ ہمدانی میں اختلاف شروع ہو گئے۔ ہمدانی نے بہ طور خود قلعہ آگرہ پر قبضہ کر لیا۔ افراسیاب خاں فوج لے کر آگرہ پہنچ گیا اور مادھو جی سندھیا والی گوالیار کو بھی اپنی امداد کے لیے بلا لیا۔ یہ اکتوبر ۱۷۸۴ء کا واقعہ ہے۔ ابھی ہمدانی کے خلاف کوئی کارروائی شروع نہیں ہوئی تھی کہ میرزا شفیع کا بھائی، میرزا زین العابدین ایک روز سندھیا کی لشکر گاہ سے افراسیاب کے خیمے میں پہنچا اور اسے خنجر مار کر ہلاک کر ڈالا۔ کہنے کو یہ بھائی کے خون کا انتقام تھا لیکن صحیح یہ ہے کہ اس باب میں انگیخت کا ذمہ دار سندھیا تھا اور افراسیاب خاں کے قتل کے بعد خود سندھیا کے لیے دربار میں مختاری کا درجہ حاصل کر لینے کا اچھا موقع پیدا ہو گیا تھا۔

سندھیا کی مختاری:

چناں چہ سندھیا آگرہ کا محاصرہ چھوڑ کر دہلی پہنچا اور اس نے شاہ عالم ثانی سے دو فرمان حاصل کیے۔ ایک فرمان کے مطابق پیشوا کو نائب السلطنت بنایا گیا اور دوسرے فرمان کے مطابق سندھیا کو پیشوا کے نائب کی حیثیت میں فوج اور نظم و نسق کا مختار قرار دیا گیا۔ پہلے فرمان کی غرض محض یہ تھی کہ سندھیا کے خلاف دوسرے مرہٹہ سرداروں یا خود پیشوا کے لیے اعتراض کی گنجایش نہ رہے حقیقتاً اس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

افراسیاب خاں کے اہل و عیال علی گڑھ کے قلعے میں رہتے تھے اور نجف خاں کے عہد کی ساری

دولت بھی اسی قلعے میں محفوظ تھی۔ سندھیا نے مختاری کا درجہ حاصل کرتے ہی علی گڑھ پر بھی قبضہ کر لیا اور تمام مال واسباب بھی سمیٹ لیا۔

سندھیا کی اصطلاحات:

اب سندھیا کو ضرورت پیش آئی کہ فوج نئے اصول پر مرتب کرے اور پُرانا جاگیردارانہ نظام توڑ دے۔ اس طرح ان تمام امیروں اور سالاروں کی جاگیریں یکے بعد دیگرے واپس ہونے لگیں جنھیں فوجی خدمات کے صلے میں یہ دی گئی تھیں۔ یہ لوگ مسلمان اور زیادہ تر مغل تھے۔ ممکن ہے سندھیا کے پیش نظر یہ مصلحت بھی ہو کہ جب تک ان فوجیوں کو بے دست و پا نہ کیا جائے گا یا ان کے جیش نہ توڑے جائیں گے، مختاری کا سلسلہ بے خلش جاری نہ رہ سکے گا۔ یہ اندیشہ بھی ہوگا کہ ممکن ہے بعض رسالدار کسی موقع پر افراسیاب خاں کی اولاد میں سے کسی کے طرف دار بن جائیں یا کسی اور امیر و رئیس کے زیرِ علم جمع ہو جائیں اور اس طرح سندھیا کی مختاری پر ضرب لگے۔ اس انتظام نے ہندو مسلم کا سوال بھی پیدا کر دیا۔ مسلمان مغلوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ سلطنت ان کی ہے لیکن ایک مرہٹے کی مختاری نے انھیں ہر شے سے بے دخل کر دیا ہے۔ غلام قادر خاں روہیلے نے ابتداء میں جو کامیابی حاصل کی تھی۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ وہ مسلمان امیروں اور رسال داروں کی حمایت و ہمدردی کا مدعی بن گیا تھا۔

لال سُوت کی لڑائی:

سندھیا کی ایک مصلحت یہ تھی کہ وہ دکن کے ساتھ اپنا سلسلۂ ربط وضبط قائم رکھے، جہاں مرہٹوں کا مرکز تھا۔ اس ضمن میں اسے راجپوتانے کے مشہور قلعے رگھوگڑھ کی تسخیر ضروری معلوم ہوئی چناں چہ اس نے محمد بیگ ہمدانی کو رگھوگڑھ بھیج دیا۔ ہمدانی اپنے مقصد میں کام یاب نہ ہو سکا۔ راجپوتانے کے بڑے بڑے راجاؤں مثلاً جے پور، جودھ پور، میواڑ وغیرہ نے ایکا کر کے ایک لاکھ فوج تیار کر لی اور سندھیا کے مقابلے پر آمادہ ہو گئے۔ سندھیا کو بھی فوج لے کر نکلنا پڑا۔ لال سوت کے مقام پر مئی ۱۷۸۷ء میں خونریز لڑائی ہوئی۔ یہ مقام جے پور سے تینتالیس میل مشرق میں واقع ہے۔ محمد بیگ ہمدانی کے بھتیجے اسمٰعیل بیگ نے تین سو سواروں کے ساتھ راجپوتوں پر حملہ کیا اور ان کے چھکے چھڑا دیے لیکن

مرہٹوں نے اس کی اعانت نہ کی اور حملہ بے نتیجہ رہا۔ فریقین کی طرف سے گولہ باری ہوتی رہتی تھی۔ دوسرے یا تیسرے دن سخت آندھی چلی۔ اس میں ایک گولہ محمد بیگ ہمدانی کے لگا اور وہ ہاتھی سے نیچے گر گیا۔ افراتفری میں ہاتھی کا پاؤں محمد بیگ کی کنپٹی پر پڑا اور وہ جاں بحق ہو گیا۔ اسمٰعیل بیگ نے اسی موقع پر پکار کر کہا کہ اب چچا کی جگہ میں فوج کا سپہ سالار ہوں۔

مغلوں کی بغاوت:

عین اسی حالت میں چودہ ہزار مغلوں نے سندھیا کے خیمے کو گھیر لیا اور تنخواہ کا مطالبہ پیش کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ ان میں بہت سے وہ لوگ بھی شامل تھے جن سے جاگیریں واپس لے لی گئی تھیں۔ ان مغلوں نے ساتھ ہی مہاراجا جے پور کے پاس پیغام بھیج دیا کہ اگر دو لاکھ روپے فوراً ادا کر دو تو ہم سندھیا کو چھوڑ کر تمھارے ساتھ ہو جائیں گے۔ مہاراجا جے پور نے بے تامل روپیہ دے دیا یا دینے کا وعدہ کر لیا۔ سندھیا نے یہ حالات دیکھے تو میدان چھوڑ کر گوالیار چلا گیا اور عارضی طور پر اس کی مختاری بھی ختم ہو گئی۔ یہی حالات تھے جن سے فائدہ اٹھا کر غلام قادر خاں روہیلے اور اسمٰعیل بیگ ہمدانی نے دہلی پر یورش کی اور شاہ عالم ثانی کو نورِ بینائی سے محروم کیا گیا۔ یہ واقعات پیشِ نظر موضوع سے خارج ہیں۔

لال سُوت کے میدان میں چودہ ہزار مغلوں کی بغاوت ۳۱ مئی یا یکم جون ۱۷۸۷ء کا واقعہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسی موقع پر میرزا قوقان بیگ خاں نے جے پور کی ملازمت اختیار کی اور سکونت کے لیے دہلی کے بجائے آگرہ کو منتخب کیا۔ آگرہ ہی کے قیام میں خواجہ غلام حسین خاں سے تعارف کا موقع بہم پہنچا اور میرزا عبداللہ بیگ خاں کی شادی خواجہ کی صاحبزادی عزت النساء بیگم سے ہُوئی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ ۱۷۹۰ء کے بعد کا واقعہ ہے۔

اربابِ علم و نظر سے گزارش:

مجھے اس اعتراف میں تامل نہ ہونا چاہیے کہ یہ نقشہ قیاس پر مبنی ہے تاہم ہندوستان کے اربابِ علم و نظر مزید تحقیق و کاوش کی زحمت اٹھائیں تو کیا عجب ہے، زیادہ محکم معلومات حاصل ہو جائیں۔ مثلاً آگرہ کے قدیم خاندانوں سے کچھ نہ کچھ سراغ مل جانے کا امکان ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دربارِ جے پور کے پُرانے کاغذات سے میرزا قوقان بیگ کی ملازمت اور اس کی نوعیت و حیثیت کے متعلق

پتا چل جائے۔ اس طرح میرزا غالبؔ کے سوانح حیات کی ایک گم شدہ کڑی ہاتھ آ جائے گی اور ہم زیادہ وثوق و اعتماد سے سوانح کے اس حصے کو مکمل کر سکیں گے۔

اسی طرح بعض دُوسرے پہلوؤں کے متعلق بھی میرے سامنے چند غور طلب امور ہیں جنھیں بہ شرطِ حیات پیش کرتا رہوں گا۔ ان شاءاللہ تعالیٰ

(آجکل۔ دہلی۔ فروری ۱۹۵۷ء)

حیاتِ غالبؔ

(چند گزارشیں)

حضرت نادؔم سیتاپوری تمام اہل علم کی طرف سے عموماً اور غالبؔ کے ساتھ رابطۂ عقیدت رکھنے والوں کی طرف سے خصوصاً دلی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے غالبؔ کے متعلق ایک نئے ماخذ کا نہ محض پتا دیا بل کہ اس کے ضروری مطالب بھی شائع فرما دیے۔ کم از کم میں اس ماخذ کے وجود سے بھی آگاہ نہ تھا۔ ایسے ماخذ کے سلسلے میں غور طلب سوال محض یہی نہیں ہوتا کہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس میں نئی معلومات کس قدر ہیں؟ بل کہ یہ بھی ہوتا ہے کہ جن امور و مسائل کے متعلق ہم خاص آراء قائم کر چکے ہیں، آیا کوئی ایسی روشنی مہیا ہوئی کہ ہم ان پر نظر ثانی ضروری سمجھیں؟

اس طرح حضرت نادؔم نے ”نجم الاخبار“ سے میرزؔا کی وفات کے قطعات تاریخ بھی شائع فرمائے لیکن اصل کتاب میں ایک دو نہیں، متعدد ایسی چیزیں آ گئیں جو صحیح نہ تھیں۔ بہتر ہوتا کہ حواشی میں ان کی توضیح کر دی جاتی تاکہ خوانندگان کرام حقیقت سے آگاہ رہتے۔

عرفؔی اور غالبؔ:

میں حضرت نادؔم کے ایک نیاز مند کی حیثیت میں بعض تصریحات ضروری سمجھتا ہوں اگر کوئی امر رہ جائے تو لطفاً اس سے مطلع فرما دیا جائے۔

۱۔ میرزؔا نے اپنے زمانے کے مستند شاعر عرفؔی کے قصاید پر بھی نظر ڈالی (”ماہ نو“۔ اشاعت خاص، مارچ ۱۹۶۴ء، ص ۲۹)۔

فقرے کے ابتدائی لفظ سے شبہہ ہو سکتا ہے کہ عرفؔی میرزا غالب کا معاصر تھا۔ میرا خیال ہے کہ ”حیاتِ غالب“ کے فاضل مصنف کا مدعا ہرگز یہ نہ تھا۔ وہ صرف یہ کہنا چاہتے تھے کہ عرفؔی کو میرزؔا کے عہد میں فارسی کا مستند ترین شاعر مانا جاتا تھا اور یہ حقیقت ہے بھی۔

دادا کا ترکِ وطن:

۲۔ جس وقت حکومت دہلی کی لگام شاہ عالم کے ہاتھ میں تھی۔ اس وقت میرزا کے دادا گھر چھوڑ کر نکلے (ص ۲۸)۔

خود میرزا غالب کے ایک بیان کا مفاد بھی یہی ہے لیکن یہ اس وجہ سے قابل قبول نہیں کہ بعض دوسری تفصیلات جو خود میرزا ہی نے بیان کی ہیں، اس کی صحت میں مخل ہیں۔ میرزا کا دادا پہلے لاہور میں معین الملک عرف میرزا منو کے پاس ملازم ہوا تھا اور میرزا منو کا انتقال ۱۷۵۳ء میں ہوا۔ جو شخص ۱۷۵۳ء سے پیش تر ترکِ وطن کر چکا تھا۔ اس کے بارے میں یہ دعویٰ کیوں کر قابل پذیرائی سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ شاہ عالم ثانی کی بادشاہی کے وقت میں وطن سے نکلا؟ شاہ عالم ثانی کی بادشاہی کا رسمی آغاز ۱۷۵۹ء میں ہوا اور وہ غریب کم وبیش تیرہ سال مشرقی خطوں میں امیدوں کے نقشے بناتا اور بگاڑتا ہوا ۱۷۷۲ء میں دہلی پہنچا تھا۔

ایک اور تعبیر:

اس بیان میں سے ایک پہلو کھینچ تان کر نکالا جاسکتا تھا اور وہ یہ کہ مغلوں کے زمانے میں خاص ہند سے مقصود وہ خطہ تھا جو شمال میں سرہند سے جنوب میں ست پڑا تک تھا۔ پنجاب کو عموماً خاص ہند سے باہر سمجھا جاتا تھا اور یہی کیفیت دکن نیز بنگال و سندھ کی تھی لیکن پیشِ نظر معاملہ یہ نہیں کہ میرزا کے دادا نے شاہی ملازمت کب اختیار کی، یہ ہے کہ اس نے وطن کب چھوڑا؟ لہٰذا یہ بیان قابل قبول نہیں چوں کہ میرزا کا دادا ذوالفقار الدولہ نجف خاں سے وابستہ رہا۔ اس لیے یقین ہے کہ ذوالفقار الدولہ ہی کی وساطت سے شاہ عالم کی ملازمت کا انتظام ہوا۔ میرزا غالب کا دائرۂ فضل وکمال شعر وادب تک محدود تھا۔ تاریخ میں انھیں قطعاً دسترس حاصل نہ تھی۔ انھوں نے عہدِ طفلی میں جو خاندانی روایتیں سُنیں بلا تحقیق بیان کر دیں۔ ہم انھیں آنکھیں بند کر کے قبول نہیں کر سکتے۔ جہاں کوئی غلطی نظر آئے گی، اس کی تصریح کر دیں گے۔

شاہِ دہلی کی طرف سے مشاہرہ:

۳۔ میرزا کے چچا کے مرنے کے بعد بادشاہ دہلی نے ان کے لیے پچاس روپے مقرر کر دیے۔ (ص ۲۹) میرزا کے چچا نصر اللہ بیگ خاں کا انتقال ۱۸۰۶ء میں ہوا (۴- مارچ اور ۶- مئی کے

درمیان) لیکن شاہ دہلی کی طرف سے میرزا کے لیے پچاس روپے ماہ وار کی رقم ۱۸۵۰ء میں مقرر ہُوئی اور یہ تاریخ نگاری کا مشاہرہ تھا۔

تاریخ نگاری کی کیفیت یہ تھی کہ حکیم احسن اللہ خاں مختلف کتابوں سے مطالب اقتباس کر کے میرزا کے پاس بھیج دیتے اور وہ اپنے خاص اسلوب تحریر کے مطابق ان مطالب کو فارسی کا لباس پہنا دیتے۔

نصراللہ بیگ خاں کے انتقال کے بعد ان کے متعلقین کے لیے جو رقم نواب احمد بخش والیِ لوہارو کی تجویز اور لارڈ لیک کے دست خط سے مقرر ہوئی تھی اس میں سے میرزا غالب کے حصّے کی رقم ساڑھے باسٹھ روپے ماہانہ تھی۔ یہ رقم پہلے نواب احمد بخش خاں کی ریاست سے ملتی رہی۔ ان کے ولی عہد شمس الدین احمد خاں کے جھگڑے شروع ہُوے تو میرزا نے اپنے حصّے کی رقم سرکاری خزانے میں منتقل کرالی۔ دہلی میں انھیں یہ رقم سرکاری خزانے سے ملتی تھی لیکن شاہ دہلی کی رقم کو اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔

”ساطع برہان“ اور ”نامۂ غالب“:

۴۔ ”قاطع برہان“ کا جواب حافظ عبدالرحیم نے بنام نہاد ”ساطع برہان“ لکھا۔ میرزا نے اس کا جواب الجواب لکھ کر ”نامۂ غالب“ نام رکھا (ص ۳۰)۔

ساطع برہان کے مصنف کا نام حافظ عبدالرحیم نہیں بل کہ میرزا رحیم بیگ تھا۔ وہ یقیناً بینائی سے محروم تھا جیسا کہ خود لکھتا ہے...... سراپا تقصیر، رحیم اثیم ساطع برہان کے مقدمے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل رسالہ ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۳ء) میں مرتب ہو چکا تھا۔ مصنف نے ”بدائع النظائر“ سے اس کی تاریخ نکالی ہے:

چوں گشت مرتب ایں رسالہ
باجملہ دلیل و بحثِ نادر
وانگہ بہ رحیم گفت ہاتف
تاریخ ”بدائع النظائر“

تاہم یہ ۱۲۸۲ھ میں طبع ہُوا جیسا کہ رام جس، متخلص بہ اقبال کے تاریخی قطعوں سے واضح ہے:۔

مطبوع شد چو ”ساطع برہان“ میرزایم
از اہتمامِ ملا ہاشم بہ طرزِ دل کش

اقبآل بے تردّد از فیضِ ہاتفِ غیب
"مرغوبِ دل" نوشتم تاریخِ انطباعش

(۱۲۸۲ھ)

شدہ ایں نامۂ نامی چو مطبوع!!
من اے اقبال دیدم بالکل او را
ز روی برتری گفتم بلا جہد
سنِ طبعش "تفرّج گاہِ شعرا"

(۱۲۸۲ھ)

(روی برتری یعنی "ب" کے دو جمع کر کے)

پہلے قطعۂ تاریخ کے لفظ "میرزایم" سے واضح ہوتا ہے کہ جناب اقبآل میرزا رحیم بیگ کے شاگرد تھے لیکن شاگرد کے اشعار سے آپ خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ خود میرزا رحیم بیگ کے ذوق شعر کا کیا حال تھا۔ جن لوگوں نے "قاطع برہان" کے جواب لکھنے میں خاص سرگرمی کا اظہار فرمایا ان میں سے شاید ہی کسی کا ذوق شعر درخور اعتنا ہو۔

جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں "ساطع برہان" کا اسلوب تحریر، اس صنف کی دوسری کتابوں کے مقابلے میں غالباً کم سے کم دل آزار تھا۔

"ساطع برہان" اور سیّد عبداللہ:

۵۔ "ساطع برہان" کے آخر میں چند ورق سیّد عبداللہ کے نام سے مشہور ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو میرزا ہی کے معلوم ہوں گے (ص ۳۱)۔

گزارش ہے کہ "ساطع برہان" کے آخر میں سیّد عبداللہ کے نام سے کوئی تحریر موجود نہیں۔ غالباً فاضل مصنف کا مقصد یہ ہے کہ میرزا نے "قاطع برہان" کے آخر میں جو بعض فوائد اپنے محترم استاد ملّا عبدالصمد سے منسوب کر کے لکھے ہیں وہ میرزا ہی کے ہیں۔

ظاہر ہے کہ تحریر بہ ہر حال میرزا ہی کی ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ اصل نکتے میرے نہیں، ملّا

عبدالصمد کے بتائے ہُوئے ہیں۔

ملاّ عبدالصمد اس ملک کے اہلِ علم خصوصاً فارسی داں حضرات میں کوئی معروف و معتمد علیہ شخص نہ تھے کہ میرزا نے ان کے دامن میں پناہ لینے کی کوشش کی ہو۔ انھوں نے سادگی سے ایک بات کہہ دی اگر اسے قبول کرلیا جائے تو کون سی قیامت آ جائے گی؟ لیکن ہمارے بعض نہایت واجب الاحترام دوستوں کی طرح ردوانکار ہی کو مقتضائے دانش و تحقیق قرار دے لیا جائے تو الگ بات ہے۔

میرزا کا قطعہٴ وفات:

۶۔ میرزا نے اپنا قطعہٴ وفات خود کہا تھا یعنی:

من که باشم که جاوداں باشم
چوں نظیریؔ نماند و طالبؔ مرد
ور پرسند در کدامیں سال
مُرد غالبؔ بگو که ”غالبؔ مُرد“

(ص ۳۳)

”غالبؔ مرد“ سے ۱۲۷۷ھ نکلتے ہیں لیکن اپنے مرنے کا صحیح وقت کون جان سکتا ہے؟ میرزا نے اندازے کی بنا پر کہہ دیا تھا اور یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ جب ان کی وفات ہُوئی تو خواجہ حالیؔ کے قول کے مطابق دس بارہ آدمیوں نے ”غالب مرد“ ہی میں اضافہ سے صحیح تاریخ نکال لی یعنی ”آہ غالب بمرد“۔

ابتلاءِ اسیری:

۷۔ غالبؔ کی اسیری کے متعلق غلط فہمی پہلے بھی موجود تھی۔ ”حیاتِ غالب“ نے بھی اس کی توثیق ہی کی یعنی:

”میرزا آفتِ ناگہانی سے ایک مرتبہ جیل خانے گئے۔ جس دن وہاں سے نکلنے لگے تو وہ کُرتا جو کہ پہنے ہوئے تھے وہیں پھاڑ کر اور یہ پڑھ کر پھینک دیا“:

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

(ص ۳۳)

یہ پورا بیان سراسر غلط ہے۔ خواجہ حالیؔ فرماتے ہیں:

> ”اگرچہ من جُملہ چھ مہینے، تین مہینے جو اُن کو قید خانے میں گزرے، ان کو کسی طرح کی تکلیف نہیں ہُوئی وہ بالکل قید خانے میں اسی آرام سے رہے جس آرام سے گھر میں رہتے تھے۔ کھانا اور کپڑا اور تمام ضروریات حسب دل خواہ گھر سے ان کو پہنچتی تھیں۔ ان کے دوست ان سے ملنے جاتے تھے اور وہ صرف بہ طور نظر بندوں کے جیل خانے کے ایک الگ کمرے میں رہتے تھے“۔

ظاہر ہے کہ ان حالات میں جیل کا لباس پہنائے جانے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ پھر حکم سزا کے مختلف اجزا تھے۔

ا۔ چھ ماہ کی قید بامشقت اور دو سو روپے جرمانہ۔
ب۔ جرمانہ ادا نہ ہو تو مزید چھ ماہ کی قید بامشقت۔
ج۔ پچاس روپے ادا کر کے مشقت معاف کرائی جا سکتی ہے۔

یقین ہے کہ دو سو روپے جرمانہ بھی ادا کر دیا ہو گا اور پچاس روپے دے کر مشقت بھی معاف کرا لی ہو گی۔ محض چھ ماہ کی سادہ قید رہ گئی، جس کی کیفیت نظر بندی کی تھی۔ لباس، کھانا اور دُوسری ضروریات گھر سے جاتی تھیں۔ آخر حکام نے خود تین ماہ کے بعد باقی قید معاف کر دی اور میرزاؔ آزاد ہو گئے۔

فرض کیجیے کہ مشقت معاف نہ ہُوئی اور میرزاؔ نے جیل میں قیدیوں کا لباس پہنا مگر رہائی کے وقت جیل کا لباس پھاڑ دینا کیوں کر ممکن تھا؟ لمبی قید والے قیدیوں کے لباس بدلے جاتے ہیں لیکن کسی کو جیل کا لباس حسبِ منشاء پھاڑنے کی اجازت کب حاصل ہُوئی کہ میرزا غالبؔ نے اس سے فائدہ اٹھا کر اپنے ایک شعر کے لیے گنجایش پیدا کر لی؟ ایسی بے تکلفی تو اس دور میں بھی کسی سے سرزد نہ ہُوئی جب انگریزی قید کو جاں بازوں نے مذاق بنا دیا تھا۔ میرزا کے زمانے میں تو قید کی کیفیت یہ نہ تھی۔ اسی طرح ایک اور شعر میرزاؔ کی اسیری سے منسوب کیا گیا ہے:

ہم غم زدہ جس وقت سے زنجیر بپا ہیں
کپڑوں میں جُوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

یہ واقعہ بھی بالکل بے اصل ہے اور مجھے یقین ہے کہ شعر میرزا غالبؔ کا نہیں۔

مصطفیٰ خاں شیفتہ:

تحقیقی طور پر معلوم نہیں کہ جیل خانے میں میرزا سے ملنے کے لیے کون کون جاتا تھا اور ابتلائے اسیری میں غم خواری کا حق کس کس دوست نے ادا کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں کہ دوستوں، جلیسوں بل کہ عزیزوں نے بھی آنکھیں پھیر لی تھیں لیکن بے مہری و حق فراموشی کے اس عام منظر میں صرف ایک شخص کا چہرہ درخشندہ نظر آتا ہے یعنی نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ۔

خواجہ حالی فرماتے تھے کہ جوں ہی انھیں اس واقعے کی خبر ملی فوراً ایک ایک حاکم سے ملے اور میرزا کی رہائی کے لیے پیہم کوششیں کیں۔ پھر مقدمہ چلا اور اس کی اپیل کی گئی تو تمام مصارف اپنے پاس سے ادا کیے۔ جب تک میرزا قید میں رہے شیفتہ کا معمول تھا کہ ہر دوسرے دن سوار ہو کر قید خانے میں جانا اور ملاقات کرنی۔ وہ لوگوں کو کہتے تھے، مجھے میرزا سے عقیدت ان کے زہد و اتقا کی بنا پر نہیں فضل و کمال کی بنا پر تھی۔ جوئے کا علم تو اب ہُوا۔ شراب پینا تو پہلے سے سب کو معلوم ہے۔

میرزا خود فرماتے ہیں:

بہ بادہ گر بودم میل، شاعرم نہ فقیہ
سخن چہ ننگ ز آلودہ دامنی دارد

میرزا نے ”حبسیہ“ میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی اس محبت، عقیدت اور دوست نوازی کا ذکر جس انداز میں کیا ہے وہ اس وقت تک ایک درخشاں وثیقے کی شکل میں موجود رہے گا جب تک میرزا غالب کا فارسی کلام دنیا میں باقی ہے، فرماتے ہیں:

خود چرا خوں خورم از غم کہ بہ غم خواریِ من
رحمتِ حق بہ لباسِ بشر آمد گوئی

خواجۂ ہست دریں شہر کہ از پرسشِ وے
پایۂ خویشتنم در نظر آمد گوئی

مصطفیٰ خاں کہ دریں واقعہ غم خوارِ من است
گر بمیرم چہ غم از مرگ، عزادارِ من است

یعنی مصطفیٰ خاں کی محبت کا اتنا اثر تھا کہ ان کے کمال غم خواری کی بنا پر موت کے غم سے بھی فارغ ہو گئے تھے اور سمجھتے تھے کہ جس شان سے اسیری میں دوست نے دوستی کا حق ادا کر دیا، اسی شان سے عزاداری ہو گی۔ پھر مرنے کا غم کیوں کیا جائے؟

''سبد چیں'':

۸۔ اس میں میرزا کے چند خطوط، رقعے اور کچھ فارسی کے قصاید ہیں جو میرزا کے دیوان میں درج نہیں۔ (ص ۳۰)۔

یہ بھی صحیح نہیں ''سبد چیں'' میں قصیدے ہیں، ''حبسیہ'' ہے۔ قطعات ہیں۔ غزلیات و رباعیات ہیں۔ ''خطوط، رقعات'' وغیرہ قطعاً نہیں۔ ظاہر ہے کہ مصنف ''حیات غالب'' نے ''سبد چیں'' دیکھی ہی نہ تھی۔

ایک افسوسناک غلطی:

۹۔ سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ شیخ ابراہیم ذوقؔ کا ایک مشہور شعر میرزا غالبؔ سے منسوب کر دیا یعنی:

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

لطف یہ کہ اس پر جو کچھ لکھا وہ اسی تحریر کا چربہ ہے جو اس غزل کے سلسلے میں مولانا محمد حسین آزادؔ نے ''دیوانِ ذوق'' میں شائع کی (ملاحظہ ہو دیوانِ ذوق ص ۲۰۶)۔

فرماتے ہیں:

> ''استاد نے یہ غزل میرزا خدا بخش شہزادے کے مشاعرے میں پڑھی تھی۔ حکیم آغا جان عیشؔ استاد کے پاس بیٹھے تھے انھوں نے اپنی غزل میں یہ شعر پڑھا''۔

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لیے
تھوڑی سی رہ گئی ہے، اسے بھی گزار دے

استاد کے ہاں بھی یہی مضمون تھا۔ والد محترم استاد کے پہلو میں بیٹھے تھے ان سے استاد نے کہا کہ مضمون لڑ گیا ہے اب میں وہ شعر نہ پڑھوں؟ انھوں نے کہا ضرور پڑھنا چاہیے۔ طبیعتوں کا انداز معلوم ہوتا ہے کہ ایک نکتے پر دو فکر پہنچے اور کس کس انداز میں پہنچے۔ حکیم صاحب کے بعد استاد کے

آگے شمع آئی۔ جب یہ شعر پڑھا تو حکیم صاحب کی خدا مغفرت کرے، نیک نیت اور منصف مزاج تھے۔ شعر مذکور سُن کر خوش ہوئے۔ رسائی کی تعریف کی اور کہا آپ فی الواقع استاد ہیں۔

بہ ہر حال یہ شعر میرزا غالبؔ کا نہیں۔

''آغا جان عیشؔ اور میرزاؔ کی شعر گوئی'':

۱۰۔ سب سے آخر میں یہ کہ حکیم آغا جان عیشؔ نے میرزا غالبؔ کی شعر گوئی کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس پر یہاں بحث چھیڑنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ مولانا محمد حسین آزادؔ نے اس قسم کی کچھ چیزیں ''آبِ حیات'' میں بھی بیان کی ہیں۔ بعض اور مقامات پر بھی ایسے اشارے ملتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی بات محلِ تعجب نہ ہونی چاہیے۔ جو آنکھیں خیرہ ذوقی کی تیرگی کی خوگر ہو چکی تھیں، روشنی کی ہر کرن اور نور کی ہر لکیر دیکھ کر اس طرح گھبرا اُٹھتی تھیں گویا ان کی بینائی زائل ہو جائے گی۔ ان سے میرزا غالبؔ کی شاعری کے بارے میں صحیح اندازے کی کیا امید ہو سکتی تھی؟ اگر میرزاؔ نے کہا:

نہ ستایش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

تو یہ اپنے عہد پر طعن یا طنز نہ تھا۔ ناقدری کی شکایت بھی نہ تھی کیوں کہ شکایت وہاں کی جاتی ہے جہاں کوئی اُمید ہو اور وہ پوری نہ ہو سکے۔ میرزاؔ کے ظہور کے لیے قدرت نے جو ماحول مقرر کر دیا تھا، اس کی کون سی شے سے وہ ناواقف تھے؟ یہ صرف حکایت تھی۔ ایک صدائے حال جو سازِ غالبؔ کے پردوں سے بے اختیار اٹھی اور اس کے سوا کہا بھی کیا جا سکتا تھا:

نارَوا بود بہ بازارِ جہاں جنسِ وفا
رونقے گشتم و از طالعِ دکاں رفتم

یہ حالت محض میرزا غالبؔ ہی کو پیش نہ آئی، اکثر اہلِ کمال اسی کا مرجع بنے رہے:

حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجے
ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے

(ماہِ نو۔ کراچی۔ جولائی ۱۹۶۴ء)

میرزا غالب کی والدہ ماجدہ

ایک ضروری سوال:

میرزا غالب کے دادا قوقان بیگ خاں کی تین بیٹیاں تھیں اور چار بیٹے۔ بیٹوں میں سے ہمیں صرف دو کے نام معلوم ہیں: اوّل میرزا کے والد عبداللہ بیگ خاں جن کی وفات ۱۸۰۲ء میں ہوئی۔ دوسرے میرزا نصر اللہ بیگ خاں، جو ۱۸۰۶ء میں گھر سے ہاتھی پر سوار ہو کر نکلے، اچانک سواری سے گرِ کر فوت ہو گئے۔ میرزا کے باقی دو چچاؤں کے نہ نام معلوم ہیں اور نہ یہ بتایا جا سکتا ہے کہ کب ان کا انتقال ہوا۔ اندازہ یہ ہے کہ وہ ۱۸۰۲ء سے پیش تر ہی مر چکے تھے۔

پنشن کے کاغذات سے واضح ہوتا ہے کہ نصر اللہ بیگ خاں کے پس ماندوں کے لیے جو پنشن مقرر ہوئی تھی اس میں سے نواب احمد بخش خاں مرحوم کی قطع و برید کے بعد، جس کی کوئی وجہ ذہن میں نہیں آتی، تین ہزار روپے بچے تھے جن میں سے ڈیڑھ ہزار روپے نصر اللہ بیگ خاں کی والدہ اور تین بہنوں کے لیے تھے۔ بقیہ ڈیڑھ ہزار روپے نصر اللہ بیگ خاں کے بھتیجوں کے لیے تھے۔

ددھیالی اقربا:

غرض والد کی وفات کے بعد میرزا کے ددھیالی اقربا میں سے دادی کے علاوہ تین پھوپھیاں تھیں۔ ایک بہن تھی جو میرزا غالب سے اتنی بڑی تھی کہ اس کی شادی ہو چکی تھی۔ غالباً اسی وجہ سے پنشن کے کاغذات میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ ایک بھائی تھا یعنی میرزا یوسف خاں، جس کے متعلق غالب نے ایک غزل کے مقطع میں کہا تھا:

دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالب یوسفِ ثانی مجھے

’’از سرِ نو زندگی‘‘ اس لیے کہا کہ میرزا یوسف علی خاں خاصی مدت تک دیوانگی میں مبتلا رہے

کے بعد تندرست ہوئے تھے لیکن کچھ عرصہ تندرست رہ کر دیوانگی کا مرض پھر عود کر آیا یہاں تک کہ اسی حالت میں انھوں نے بہ زمانہ ”غدر“ وفات پائی۔ (۱۹- اکتوبر ۱۸۵۷ء)

میرزا کی والدہ ماجدہ:

میرزا کی والدہ ماجدہ کا نام عزت النساء بیگم تھا۔ وہ خواجہ غلام حسین کمیدان کی صاحب زادی تھیں جو آگرہ کے اکابر رؤسا میں سے تھے۔ عزت النساء بیگم اتنی تعلیم یافتہ ضرور تھیں کہ دستاویزیں پڑھ کر دست خط فرما سکتی تھیں۔

میرزا غالبؔ کا ایک غیر مطبوعہ خط نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کے جمع کیے ہوئے نوادر میں سے تھا جو رسالہ ”زمانہ“ (جولائی ۱۹۳۶ء) میں چھپ بھی گیا تھا۔ یہ خداداد خاں اور اس کے بیٹے ولی داد خاں کے نام تھا جو آگرہ میں غالباً ساہوکارے کا کاروبار کر رہے تھے اور میرزا غالبؔ کے خاندان کا بھی ان سے لین دین تھا۔ میرزا نے انھیں لکھا تھا کہ میری والدہ پڑھی لکھی ہیں۔ جس دستاویز پر ان کے دست خط ہوں گے، صرف وہ مستند مانی جائے گی۔ قیاس ہے کہ یہ خط ۱۸۲۴ء میں لکھا گیا تھا اور اس پر میرزا کی جو مُہر ثبت تھی وہ ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۶ء) کی بنی ہوئی تھی۔

اس خط سے واضح ہے کہ ۱۸۲۴ء تک میرزا کی والدہ ماجدہ زندہ تھیں۔ اس وقت سے پیش تر بھی میرزا کی خط کتابت کا سلسلہ جاری تھا۔ وہ پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں کلکتہ گئے۔ واپس آ کر بھی خط کتابت کا وسیع سلسلہ جاری رکھا لیکن کسی خط میں والدہ کی وفات کا کوئی ذکر نہیں آیا اور میرزا معمول کے مطابق آگرہ جاتے آتے بھی رہے۔

والدہ کی طرف سے مالی امداد:

والدہ ماجدہ آگرہ سے کوئی نہ کوئی رقم میرزا غالبؔ کو بھیجتی رہتی تھیں کیوں کہ انھیں اپنے والد ماجد کی جایداد سے خاص حصّہ ملا ہوگا۔ میرزا نے نواب علاء الدین احمد خاں کے نام ۲۸- جولائی ۱۸۶۲ء کے ایک مکتوب میں لکھا تھا کہ بھائی (یعنی امین الدین احمد والیِ لوہارو) سے کہنا:

> ”صاحب! وہ زمانہ نہیں، ادھر متھرا داس سے قرض لیا ادھر درباری مل کو مارا۔ ادھر خوب چند چین سنگھ کی کوٹھی لوٹی۔ ہر ایک کے پاس تمسک مہری موجود، شہد لگائے چاٹو، نہ مول نہ سود........

بایں ہمہ کبھی خان (غالباً نواب احمد بخش خاں) نے کچھ دے دیا۔ کبھی الور سے کچھ دلوا دیا۔ کبھی ماں نے آگرہ سے کچھ بھیج دیا..........''

مجھے میرزا کی تحریرات میں والدہ ماجدہ کا ذکر اور کہیں نہیں ملا۔

پھوپھی کا انتقال:

۱۸- ربیع الاول ۱۲۷۰ھ (۲۰- دسمبر ۱۸۵۳ء) کو میرزا کی ایک پھوپھی کا انتقال ہوا جس کی شادی دہلی میں غالباً نواب احمد بخش خاں کے خاندان کے کسی فرد سے ہوئی تھی مگر بہ ظاہر وہ بیوہ ہو گئی تھی اور اس کی اولاد کوئی نہ تھی۔ مندرجہ بالا خط میں غالباً اسی پھوپھی کے بارے لکھتے ہیں:

''اس سے بڑھ کر یہ کہ روٹی کا خرچ بالکل پھوپھی کے سر......''

اس پھوپھی کو خاندانی پنشن میں سے بھی حصہ ملتا تھا اور غالباً اس کے شوہر کی جایداد سے بھی کچھ نہ کچھ آمدنی ہوگی اور وہ برابر اپنے جلیل القدر بھتیجے سے سلوک کرتی رہتی تھی۔

اس پھوپھی کے انتقال پر میرزا نے منشی نبی بخش حقیر کو ایک خط لکھا (مرقومہ ۲۲- دسمبر ۱۸۵۳ء)

''منگل کے دن ۱۸- ربیع الاول کو شام کے وقت وہ پھوپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اس کو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھی، مر گئی۔ آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے۔ تین پھوپھیاں اور تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادی اور ایک دادا۔ یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اس کے مرنے سے میں نے جانا کہ نو آدمی آج یک بار مر گئے''۔ (نادراتِ غالب صفحہ ۴۹-۵۰)

ایک غور طلب سوال:

اس سلسلے میں غور طلب سوال یہ ہے کہ میرزا نے تین پھوپھیاں، تین چچاؤں، ایک والد، ایک دادا اور ایک دادی کا ذکر کیا لیکن والدہ کا کوئی ذکر نہ کیا۔ کیا میرزا ذکر کرنا بھول گئے۔ یہ بہ ظاہر قرینِ قیاس نہیں کیوں کہ تمام رشتہ داروں کو یاد کیا مگر والدہ کو یاد نہ کیا جو حقیقتاً والد سے بھی پہلے آنی چاہیے تھی اگر کہا جائے کہ صرف آبائی سلسلے کے رشتہ داروں کا ذکر پیشِ نظر تھا تو دادی کا ذکر کیوں کیا؟ وہ بھی تو

خالص آبائی سلسلے میں محسوب نہ تھی۔ دادا کی بیگم، والد، چچاؤں اور پھوپھیوں کی والدہ ہی تھی یا کیا یہ سمجھا جائے کہ اس خط میں والدہ کا ذکر سہواً حذف ہو گیا؟

سب سے آخر میں یہ کہ آیا اس وقت تک میرزا کی والدہ ماجدہ زندہ تھیں؟ لہٰذا متوفی افراد خاندان میں ان کا ذکر نہ کیا۔ ۱۸۵۳ء میں والدہ کی عمر زیادہ سے زیادہ پچھتر برس کی ہوگی اور اس عمر تک زندہ رہنا نادرات میں سے نہ تھا اگر اس مفروضے کو درست مانا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ بعد میں تو والدہ ماجدہ کی وفات کے ذکر کا زیادہ سے زیادہ امکان تھا۔ تاہم کہیں ایسی کوئی بات نہیں ملی۔ کیا اہل علم اس ضروری معاملے پر خاص توجہ مبذول فرمائیں گے؟

(دبستان۔ شمارۂ غالبؔ جولائی ۱۹۶۹ء)

گورنمنٹ انٹر میڈیٹ کالج لاہور

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اور قلعہ معلّٰی سے تعلق

قلعہ معلّٰی سے تعلق:

میرزا کی زندگی کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں، جسے انگریزوں کے زمانے میں ”غدر“ قرار دیا گیا، قلعہ معلّٰی کے ساتھ تعلق کی کیا حیثیت رہی؟ زیادہ عام روایت کے مطابق آغاز ہنگامہ ہی میں خانہ نشیں ہوگئے تھے اور قلعے سے کوئی تعلق نہ رکھا تھا یا وقتاً فوقتاً مختلف تقریبات میں شریک ہوتے رہے اور انھوں نے قصیدے بھی پڑھے جیسا کہ ایک مرتبہ پڑھنے کا ذکر ایک روزنامچے میں بھی ہوا ہے۔

ابتدا میں میرا خیال بھی یہی تھا کہ میرزا ہنگامہ شروع ہوتے ہی خانہ نشین ہوگئے تھے اور وہ اس وقت تک باہر نہ نکلے جب تک انگریزوں نے دہلی کو دوبارہ فتح نہ کرلیا لیکن مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور نے اس رائے کو نادرست قرار دیا اور فرمایا کہ دہلی میں جس قسم کے حالات پیدا ہوچکے تھے انھیں پیشِ نظر رکھتے ہوئے قلعے سے یک قلم بے تعلقی سمجھ میں نہیں آتی۔

میں جتنا غور کرتا ہوں یہ رائے ہر اعتبار سے درست و محکم معلوم ہوتی ہے۔ بلاشبہہ ہم مان سکتے ہیں کہ میرزا پر سکّے کہنے کا جو الزام لگا تھا وہ بے بنیاد تھا۔ یہ بھی مان سکتے ہیں کہ میرزا نے بعد میں بے تعلقی ہی پر زور دیا اور ہنگامے کے اختتام پر انگریزوں کے بے پناہ ظلم و جور نے جو حالات پیدا کردیے تھے ان کا تقاضا یہی ہوسکتا تھا مگر یہ کیوں کر مانا جاسکتا ہے کہ میرزا نے ہنگامے کے اس دور میں بھی پیوند تعلق منقطع رکھا جب انگریزی حکومت دہلی سے ناپید ہوچکی تھی؟ اطراف ملک میں جابجا انگریزوں کے خلاف رزم و پیکار کی خبریں آرہی تھیں اور زیادہ تر لوگوں کو خیال ہوگیا ہوگا کہ تاریخ اپنا ورق اُلٹ چکی ہے یعنی انگریزی اقتدار دوبارہ قائم نہیں ہوسکتا۔

دربار میں میرزا کا مقام:

ظاہر ہے کہ میرزا فارسی اور اُردو کے ممتاز ترین شاعر تھے۔ قلعے سے ملازمت کا تعلق پیدا ہوئے

کم از کم سات سال گزر چکے تھے۔ شیخ ابراہیم ذوقؔ کی وفات کے بعد بادشاہ نے میرزا ہی سے مشورۂ سخن کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ ہنگامے کے ابتدائی دور میں عام طور پر یہی سمجھا جاتا تھا کہ بادشاہی از سرِ نو اپنی اصل شکل میں قائم ہو چکی ہے۔ لہٰذا دربار سے میرزا جیسے شخص کی غیر حاضری چھپی نہیں رہ سکتی تھی بل کہ وہ سب سے پہلے یاد آئے ہوں گے۔ اس لیے کہ اس عہد کے درباروں کی زیب و زینت میں شعراء کو اولین حیثیت حاصل تھی اور ان کی حاضری کے بغیر انعقادِ دربارِ عام کے تقاضے پورے ہی نہ ہو سکتے تھے۔

خود میرزا بھی غیر حاضر رہ کر اپنی امیدوں کے درخشاں مستقبل کو برباد نہیں کر سکتے تھے جو انگریز پچپن سال سے دہلی میں کارفرمائی کے درجے پر فائز تھے۔ وہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء ہی کو یا تو مارے جا چکے تھے یا دہلی کو چھوڑ کر باہر نکل گئے تھے۔ پھر اس وقت کسے خیال آ سکتا تھا کہ وہ اپنی قوت کو مجتمع کر کے چھنا ہوا اقتدار دوبارہ حاصل کر لیں گے؟ ہو سکتا ہے کہ بعض دُور اندیش اور محتاط آدمی چند روز تک تذبذب میں مبتلا رہے ہوں یعنی انھیں خیال ہو کہ انگریز بہت بڑی طاقت اور تنظیم کے مالک ہیں اور وہ جلد سے جلد دہلی پر حملہ آور ہوں گے لیکن جب خاصی دیر تک ایسی کوئی صورت نظر نہ آئی تو اس کے سوا کیا سمجھا جا سکتا تھا کہ جو انقلاب بپا ہُوا، اسے مستقل سمجھنا چاہیے؟

ہنگامے کا ابتدائی دور:

یہ بھی ظاہر ہے کہ کم از کم ہنگامے کے دورِ عروج و کمال میں کسی ایسے شخص کے لیے دہلی میں محفوظ رہنا ممکن نہ تھا جو ظواہر میں کسی ہنگامہ آرائی کا معاون نہ تھا۔ جس شخص کی روش ہنگامہ آراؤں کے نزدیک اطمینان بخش نہ تھی، اسے انگریزوں کا جاسوس اور خیر خواہ سمجھ لیا جاتا تھا۔ میرزا عام شخص نہ تھے دہلی کے چند مشہور ترین افراد میں سے تھے اور دربار سے ان کا تعلق بہت گہرا تھا۔ ان حالات میں کیوں کر ممکن تھا کہ وہ الگ تھلگ بیٹھے رہتے یا انھیں الگ تھلگ چھوڑ دیا جاتا؟ یہ طرزِ عمل تو وہ رؤسا اکابر بھی اختیار نہ کر سکے جن کے پاس حفاظت کے لیے فوجی دستے موجود تھے، میرزا غالب کیوں کر اختیار کر سکتے تھے جو نہ خود سپہ گری جانتے تھے اور نہ ان کے پاس دس بیس یا دو چار قرابین دار موجود تھے محض گھر کا دروازہ بند کر لینے سے تو ان لوگوں کی دستبرد کو معطّل نہیں کیا جا سکتا تھا جو باہر سے آ کر انگریزی اقتدار کو ختم کر چکے تھے۔

غرض کامل بے تعلقی کا معاملہ واقعی فہم سے باہر ہے اور ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایسی روش پر قائم رہنا میرزا کے لیے ممکن نہ تھا۔

دو صورتیں:

ان کے سامنے دو صورتیں تھیں: اوّل یہ کہ قلعہ سے کم از کم ظاہری روابط اس انداز میں قائم رکھتے کہ کسی کو ان کے اخلاص و وفا پر حرف گیری کی گنجایش نہ رہتی، خواہ انھیں یہ صورت دل سے پسند ہوتی یا نہ ہوتی۔ یعنی ان کے لیے ضروری تھا کہ معمول کے مطابق قلعے میں جاتے اور تمام واجبات معمول کے مطابق بجالاتے "دستنبو" میں انھوں نے اپنا معمول یہ بتایا ہے کہ ہفتے میں ایک دو مرتبہ قلعے جایا کرتا تھا۔ بادشاہ حرم سرا سے برآمد ہوتے تو ان کی پیش گاہ میں تھوڑی دیر ٹھہرتا۔ برآمد نہ ہوتے تو چند لمحے قیام کر کے واپس چلا آتا۔ اس معمول میں فرق نہ آ سکتا تھا اور خیال یہی ہے کہ فرق نہ آیا ہوگا۔

یہ بھی یقینی ہے کہ خاص تقریبات پر انھوں نے قصیدے پیش کیے ہوں گے۔ دوران ہنگامہ میں دو عیدیں آئیں۔ پہلے عید الفطر بعد ازاں عید الاضحیٰ، ممکن نہیں کہ ان عیدوں پر انھوں نے قصیدے پیش نہ کیے ہوں۔

دوسری صورت یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو ان تمام افراد کے عتاب کا نشانہ بنا لیتے جو دہلی میں کارفرمائی کا مقام حاصل کر چکے تھے۔ جن لوگوں نے امین الدین احمد خاں رئیس لوہارو، ان کے بھائی ضیاء الدین احمد خاں یا حکیم احسن اللہ خاں اور محبوب علی خواجہ سرا جیسے بااقتدار آدمیوں کے گھر لوٹے اور ان کے لیے قتل کا خطرہ پیدا کر دیا۔ ان سے میرزا غالبؔ کیوں کر محفوظ رہ سکتے تھے؟

میرزا کا اپنا بیان:

بہ ہر حال صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ میرزاؔ نے دوران ہنگامہ میں قلعے سے پیوند تعلق بالکل قطع نہیں کیا۔ وہ خود ایک مکتوب میں نواب یوسف علی خاں والیِ رام پور کو اس دور کی کیفیت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> دریں ہنگامہ خود را بہ کنار کشیدم، و بدیں اندیشہ کہ مبادا اگر یک قلم ترک آمیزش کنم، خانۂ من بہ تاراج رود و جاں در معرضِ تلف افتد، بہ باطن بیگانہ و بہ ظاہر آشنا ماندم
>
> اس ہنگامے سے میں الگ تھلگ رہا لیکن اس اندیشے کی بنا پر کہ اگر ایک دم میل جول ترک کر دوں گا تو میرا گھر لُٹ جائے گا اور جان سے مارا جاؤں گا دل سے بے تعلقی اور بہ ظاہر آشنائی کا طریقہ اختیار کر لیا۔

گردوپیش کے حالات کا تقاضا یہی تھا اور اسی پر میرؔزا نے عمل کیا۔ ممکن ہے ہنگامے کے ابتدائی دور میں میرزا نے سمجھ لیا ہو کہ انگریز ہمیشہ کے لیے جا چکے اور دہلی کی بادشاہی مستقل طور پر بحال ہو چکی۔ جب حالات بدلے تو انھوں نے بھی رائے بدل لی۔ جس مکتوب کا حوالہ اُوپر دیا گیا ہے وہ ہنگامہ ختم ہونے سے چار مہینے بعد جنوری ۱۸۵۸ء میں لکھا گیا تھا۔ اس وقت میرزا سے یہ امید نہیں رکھی جاسکتی تھی کہ وہ اپنی رائے کے مختلف دوروں کی کیفیت بیان کریں گے۔

مولانا ابوالکلام آزادؔ کے ارشادات:

مولانا ابوالکلام آزادؔ مرحوم و مغفور فرماتے تھے کہ میں نے ایک مرتبہ نواب سعید الدین احمد خاں طالبؔ سے اس بارے میں گفتگو کی تھی۔ وہ کہتے تھے یہ بات میرے سننے میں بھی آئی ہے کہ غدر کے بعد جب عید آئی تو میرزا غالبؔ نے حسبِ معمول تہنیت کا قصیدہ لکھا اور پیش کیا۔ یہ قصیدہ ان کے فارسی دیوان میں موجود ہوگا مگر معلوم نہیں کہ کون سا قصیدہ ہے۔ یہ بھی کہتے تھے کہ جب شہزادوں اور فوجی سرداروں نے مجبور کر کے دیوانِ عام کا دربار کرایا اور ایک سو ایک توپیں شہنشاہ ہندوستان کی سلامی کے لیے چھوڑی گئیں تو شعراء کو حکم ہوا کہ تہنیت کے قصاید پیش کریں۔ مجبوراً میرزا غالبؔ کو بھی ایک قصیدہ لکھنا پڑا مگر یہ قصیدہ یا قطعہ (انھیں شک تھا) اردو کا تھا چوں کہ اس میں وقت و تقریب کی خصوصیات کی طرف اشارہ تھا اس لیے میرؔزا نے بعد کو ضائع کر دیا۔

(رسالہ ''قند'' مردان)

غالب کی خاندانی پنشن

میرزا غالب کے خاندانی احوال اور ذاتی سوانح کا ہر گوشہ پوری طرح روشنی میں آچکا ہے اور اب ان میں سے کسی چیز کو معرض بحث وتحریر میں لانا مفید مشغلہ معلوم نہیں ہوتا لیکن اس سلسلہ میں بعض ایسی چیزیں شائع ہو چکی ہیں جن کو میرے محدود علم کے مطابق اب تک انتقاد کی میزان میں نہیں تولا گیا اس لیے ان کی حقیقی حیثیت واضح نہیں ہو سکی۔ ان میں ایک مضمون میرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم کا ہے جو خواجہ بدرالدین عرف خواجہ امان کے متعلق اپریل ۱۹۳۱ء کے رسالہ ''اُردو'' میں چھپا تھا۔

خواجہ امان میرزا غالب کے عزیزوں میں شمار ہوتے تھے اور میرزا فرحت اللہ بیگ کے بیان کے مطابق ان کا اور میرزا غالب کا رشتہ دو تین پشت اُوپر جا کر مل جاتا تھا اس لیے زیرِ غور مضمون میں میرزا کے اب وجد کا ذکر بھی آ گیا۔ نیز خاندانی پنشن کا مسئلہ بالکل نئے رنگ میں پیش ہوا۔ مجھے خیال آیا کہ ان بیانات کی حیثیت کا اندازہ کر لینا چاہیے اگر میرزا فرحت اللہ بیگ کے دعاوی درست ہیں تو میرزا غالب کے سوانح میں مناسب ترمیمات ضروری ہیں اگر درست نہیں تو پھر ان کی نادرستی کے وجوہ سامنے آ جانے چاہئیں۔

میرزا فرحت اللہ بیگ دورِ حاضر کے جلیل القدر اصحابِ تحریر میں سے تھے۔ ان کے رشحاتِ قلم کو عام مضمون نگاروں کے بیانات کی طرح بہ آسانی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

میرزا فرحت اللہ بیگ کے ارشادات:

میں نے میرزا فرحت اللہ بیگ کے ارشادات کو سہولتِ بحث کی غرض سے دو حصوں میں بانٹ لیا ہے۔ ایک حصہ خاندانی حالات کے متعلق ہے اور دوسرا حصہ پنشن کے متعلق۔ خاندانی حالات کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے، اس کا خلاصہ ذیل میں درج ہے۔

۱۔ میرزا غالب اور خواجہ امان کے اجداد سمرقند سے بدخشاں آئے، اس وقت اس خاندان میں دو

بھائی رہ گئے تھے۔ بڑے کا نام ترسم خاں اور چھوٹے کا رستم خاں تھا۔

۲۔ ترسم خاں کی شادی بدخشاں ہی کے ایک امیر کے ہاں ہوگئی۔ ان کے ہاں تین اولادیں ہُوئیں: دو بیٹے نصر اللہ بیگ خاں اور عبد اللہ بیگ خاں اور ایک بیٹی۔

۳۔ اس خاندان کو ذرا فراغت نصیب ہوگئی تھی کہ ترسم خاں کا وقت آ لگا اور وہ بدخشاں ہی میں فوت ہوگئے۔ بھائی کے مرنے کا رستم خاں کو کچھ ایسا صدمہ ہُوا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ پھرتے پھراتے بخارا پہنچے اور وہیں حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کے خاندان میں شادی کرلی۔ اس شادی کی وجہ سے رستم خاں کے خاندان میں بہ لحاظ اعزاز خواجگی کا خطاب آ گیا۔

۴۔ اس بیوی کے بطن سے صرف ایک لڑکا خواجہ قطب الدین خاں پیدا ہوا۔ رستم خاں کا انتقال ہوگیا۔ ننھیال میں قطب الدین کی پرورش ہوئی، جوان ہوکر شادی کی۔ ان کا لڑکا حاجی خاں تھا۔

۵۔ خواجہ حاجی خاں پوری طرح جوان نہیں ہوا تھا کہ اس کے والدین بھی دنیا سے رخصت ہوگئے۔ جب یہ خبر ان کے چچا نصر اللہ بیگ خاں کو پہنچی تو وہ اپنے بھائی عبد اللہ بیگ خاں کے ساتھ بدخشاں سے بخارا گئے۔ کچھ دنوں بھتیجے کے پاس رہے۔ پھر ہندوستان میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ بدخشاں سے برلاس قوم کے ایک امیرزادے میرزا جیون بیگ سبز پوش بھی ساتھ ہوگئے۔

۶۔ پہلے یہ قافلہ اٹک میں ٹھہرا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک یہ لوگ لاہور میں رہے پھر دہلی پہنچے۔ اس زمانے میں شاہ عالم ثانی دہلی کا بادشاہ اور ذوالفقار الدولہ نجف خاں سلطنت کا وزیر تھا۔

۷۔ ان سب نے ملازمت کرلی۔ پرگنہ پہاسو مدد خرچ کے لیے ملا۔ پھر کسی بات پر نواب سے چیخ گئی اور یہ نوکری چھوڑ کر اکبرآباد چلے گئے۔

۸۔ اکبرآباد پہنچ کر مادھوجی سندھیا والیِ گوالیار کے نوکر ہوگئے۔ نصر اللہ بیگ خاں کمانڈر، خواجہ حاجی خاں رسال دار اور میرزا جیون بیگ پلٹن کے کمیدان۔

۹۔ پھر مرہٹوں نے شکست کھائی۔ نجف خاں سے نصر اللہ بیگ خاں اور اس کے ساتھیوں کی صلح ہوگئی اور اول الذکر کی شادی نواب احمد بخش خاں کی ہمشیر سے ہوئی۔

۱۰۔ عبد اللہ بیگ خاں مذہبی آدمی تھے۔ پھر اچانک گھر بار چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے اور آصف الدولہ کے ہاں ملازم رہے۔ بعد میں حیدرآباد چلے گئے۔ واپس آ کر راجا بختاور سنگھ والیِ الور کی ملازمت

میں گڑھی کے محاصرے میں کام آئے اور راج گڑھ میں سپردِ خاک ہُوئے۔

غور طلب امور:

ظاہر ہے کہ اگر ان ارشادات کو درست سمجھا جائے تو میرزا غالب کے ان بیانات کو غلط ماننا پڑے گا کہ ان کا دادا پہلے پہل ہندوستان آیا یا ان کے والد دہلی میں پیدا ہوئے یا نصر اللہ بیگ خاں ان کے چچا نہیں بل کہ تایا تھے۔ ہمیں یہاں میرزا غالب کے پشنگی افراسیابی اور سلجوقی ہونے کے متعلق بحث چھیڑنے کی ضرورت نہیں۔ میرزا کا عقیدہ یہ تھا، اس میں کلام نہیں۔ انھوں نے اپنے خاندان کے متعلق یہی سنا ہوگا لیکن محققین کے متعلق تو یہ بھی ثابت شدہ بات نہیں کہ سلجوقی سلاطین انھی تورانیوں کی نسل تھے جن کی سطوت و شوکت کا افسانہ فردوسی نے شاہ نامہ میں سنایا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ یہ نسب نامہ اس وقت بنایا گیا جب سلطان طغرل سلجوقی نے بغداد کے عباسی خلیفہ کی صاحب زادی سے نکاح کی خواہش کی تھی اور مقصد یہ تھا کہ سلجوقی خاندان کو قدیم و باجبروت تاج داروں کا خاندان دکھلایا جائے۔

ترسم خاں اور رستم خاں کے حقیقی بھائی ہونے کا مسئلہ طے کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی مستند ذریعہ معلومات موجود نہیں لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ نصر اللہ بیگ خاں اور عبد اللہ بیگ خاں ترسم خاں کے بیٹے تھے اور بدخشاں میں پیدا ہوئے تو کئی ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کا کوئی حل سمجھ میں نہیں آتا۔

لاینحل الجھنیں:

مثال کے طور پر مندرجہ ذیل باتیں پیشِ نظر لائیے:

۱۔ رستم خاں بھائی کی وفات سے اس درجہ متاثر و متالم ہوا کہ بدخشاں کی سکونت ترک کرنے کے سوا اطمینان کی کوئی صورت نظر نہ آئی لیکن اسے یہ خیال نہ آیا کہ کم سن اور یتیم بچوں کا نگراں کون ہوگا؟

۲۔ بخارا پہنچ کر اس نے شادی کی جس سے ایک بچہ ہُوا اور رستم خاں فوت ہوگیا۔ پھر اس بچے نے جوان ہو کر شادی کی اور اس کے بیٹے خواجہ حاجی نے عالم وجود میں قدم رکھا۔ وہ جوانی کے قریب پہنچا تو اس کے باپ رستم خاں کے اکلوتے فرزند کا بھی انتقال ہوگیا اگر یہ ساری مدّت تیس برس بھی فرض کی جائے اور سمجھا جائے کہ رستم خاں کی علیحدگی کے وقت نصر اللہ بیگ خاں اور عبد اللہ

بیگ خاں علی الترتیب چار سال اور دو سال کے تھے تو خواجہ حاجی کے باپ کی وفات کے وقت ان کی عمریں چونتیس اور بتیس برس کی ضرور ہونی چاہئیں۔

٣۔ پھر وہ لوگ بدخشاں سے بخارا گئے۔ خواجہ حاجی کو ساتھ لے کر ہندوستان کا قصد کیا۔ پہلے اٹک بعد ازاں لاہور ٹھہرے۔ اس وقت میر معین الملک عرف میر منو پنجاب کا گورنر تھا جس نے اخیر ١٧٥٠ء میں وفات پائی گویا نصر اللہ بیگ اور عبداللہ بیگ کی ولادت ١٧١٤ء، ١٧١٦ء کے لگ بھگ ہُوئی۔

٤۔ ١٧٧١ء کے بعد وہ دہلی پہنچ کر نجف خاں سے وابستہ ہوئے جو ١٧٨٢ء میں فوت ہوا۔ غرض میرزا غالب کی شادی جب اکبر آباد میں ہُوئی تو ان کی عمر کم و بیش ستر برس کی ہوگی اور غالب کی ولادت کے وقت انھیں کم از کم اسّی برس کا ماننا پڑے گا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون ان بدیہی نتائج کو مستحق قبول اور شایانِ تسلیم سمجھے گا؟

میرزا غالب کے بیانات:

اس کے برعکس میرزا غالب کے بیانات بالکل واضح غیر مشتبہ اور ہر لحاظ سے قابل یقین ہیں:

١۔ وہ کہتے ہیں کہ میرا دادا ہندوستان آیا تھا۔ یہ بھی بتلاتے ہیں کہ باپ سے ناراض ہو کر آیا تھا۔ ان کے الفاظ ہیں: ''از پدرِ خود رنجیدہ آہنگِ ہند کرد'' اگر اس کا نام ترسم خاں تھا تو وہ میرزا کے دادا کی آمد کے وقت تک زندہ تھا۔

٢۔ خود میرزا کے بیان کے مطابق ان کے دادا کا نام قوقان بیگ خاں تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ''دادا قوقان بیگ خاں شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے (نہ کہ بخارا یا بدخشاں سے) دہلی آیا۔ پچاس گھوڑے اور نقارہ و نشاں سے پادشاہ کا نوکر رہا۔ پہاسو کا پرگنہ جو سمرو بیگم سے ملا ہوا تھا وہ اس کی جایداد مقرر رہوا''۔

٣۔ پھر خواجہ حالؔی مرحوم کا بیان ہے کہ غالب کے دادا کی زبان ترکی تھی اور ان کی دو نہیں متعدد اولادیں تھیں۔ میرزا غالب کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد کے تین بھائی اور تین بہنیں تھیں۔

٤۔ میرزا کا بیان ہے کہ ان کے والد دہلی میں پیدا ہُوئے: ''پدرم عبداللہ بیگ خاں بہ شاہ جہاں آباد بہ وجود آمد و من بہ اکبر آباد''۔

یہی بیانات معیار صحت پر پورے اُترتے ہیں چوں کہ والد کی وفات کے وقت میرزا کی عمر زیادہ

سے زیادہ چار برس کی تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی دو برس کے تھے اور بہن آٹھ دس برس کی ہوگی۔ اس لیے قیاس یہی ہے کہ عبداللہ بیگ جوانی کے عالم میں فوت ہُوئے۔

اب اس امر پر غور کیجیے کہ نصراللہ بیگ، عبداللہ بیگ خاں سے بڑے تھے یا چھوٹے، تو اس بارے میں بھی ابتداء سے کبھی کوئی اختلاف نہیں کیا گیا۔ سب نصراللہ بیگ خاں کو میرزا کا تایا نہیں چچا ہی سمجھتے رہے اور خود میرزا نے بھی لکھا ہے کہ:

”کمابیش پنج سال بعد گزشتن برادر، پی، مہین برادر برداشت و مرا دریں خرابہ تنہا گزاشت“۔

خواجہ حاجی کا معاملہ:

اب صرف ایک بات رہ جاتی ہے کہ آیا خواجہ حاجی اور میرزا غالبؔ کا خاندان ایک تھا؟ اگر خواجہ حاجی خاں رستم خاں کا پوتا تھا تو پھر تسلیم کرنا پڑے گا کہ رستم خاں، ترسم خاں کا بھائی نہ تھا۔ وہ میرزا قوقان بیگ خاں کا بھائی ہوگا اگر ترسم خاں اور رستم خاں ناموں کے ہم صورت ہونے کے باعث بھائی فرض کیے جائیں تو خواجہ حاجی کے سلسلہ نسب میں کم از کم ایک کڑی کا اضافہ ضروری ہے۔

نیز سمجھ لینا چاہیے کہ خواجہ حاجی، میرزا غالبؔ کے دادا کے ساتھ ہندوستان نہیں آیا تھا بل کہ کم از کم چالیس برس کی عمر کے بعد آیا۔

ہمیں اوپر کے سلسلہ نسب کے متعلق یقینی معلومات حاصل نہیں ہیں البتہ یہ معلوم ہے کہ میرزا غالبؔ کی ہمشیر کی شادی میرزا جیون بیگ برلاس کے فرزند میرزا اکبر بیگ سے ہوئی اور میرزا جیون بیگ کی صاحبزادی امیرالنسا بیگم خواجہ حاجی سے بیاہی گئیں۔ اس طرح میرزا غالبؔ، میرزا جیون بیگ اور خواجہ حاجی کے خاندانوں میں رشتہ پیدا ہوگیا۔ اس سے پیش تر کے تعلق کا ہمارے سامنے کوئی قطعی ثبوت موجود نہیں۔ میرا خیال ہے کہ میرزا غالبؔ کی ہمشیر نصراللہ بیگ خاں کی وفات کے بعد بیاہی گئی جب کہ اس خاندان کا دور ریاست و جاگیرداری ختم ہو چکا تھا اور وہ محض وظیفہ خوار رہ گیا تھا۔

خواجہ حاجی کون تھا؟

میرزا غالبؔ کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ خواجہ حاجی کے ساتھ کوئی قریبی خاندانی تعلق پہلے سے موجود نہ تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔

۱۔ خواجہ حاجی پسر بارگیر (سائیس) جد من و پسرانش از دو پشت خانہ زاد و از سہ پشت نمک خوار من۔

۲۔ فلاں بیگ (اشارہ ہے میرزا افضل بیگ ابن میرزا جیون بیگ کی طرف جو شاہ دہلی کی طرف سے کلکتہ میں وکیل تھا اور میرزا فرحت اللہ بیگ کے بیان کے مطابق اسے مقرب الدولہ، معزز الملک دلاور جنگ کے خطابات حاصل تھے) و شوہر خواہرش (خواجہ حاجی) ہر دو در رسالہ، نصر اللہ بیگ بی چارہ نوکر بودند۔ ایں ہا از سہ پشت نمک پروردۂ آبای من اند و آں کافر غدار (خواجہ حاجی) پس از مردن عم من پراگندۂ چندرا کہ فلاں بیگ از آناں بود با خود گرد کردہ نقد و جنس و اسپ و فیل و خیمہ و خرگاہ عم مرا پاک خورد۔

۳۔ حاجی فلاں بہ خاندان نصر اللہ بیگ آں کردہ است کہ یزید بہ آلِ رسولؐ۔ تنہا من نمی گویم عالمی گواہ ایں دعویٰ است۔ از دہلی تا اکبر آباد صد ہزار کس دریں جز زماں موجود اند کہ می دانند آنچہ کہ من می گویم۔

۴۔ خواجہ حاجی را، خواجہ حاجی ''خاں'' مرحوم بہ کدام تمسک و کدام علاقہ تواں گفت، احمد بخش خاں بہ آں کہ برای خواجہ حاجی پدری کرد و او را زنا کسی بہ کسی رسانید، پیوستہ خواجہ حاجی نبشت و خواجہ حاجی گفت۔

حقیقت کا سراغ:

ان بیانات میں خاصی تلخی پائی جاتی ہے جو مقدمے کی کش مکش کے باعث پیدا ہوئی لیکن خواجہ حاجی اور میرزا غالبؔ کا نسبی تعلق ثابت ہونے کے بجائے زیادہ مشتبہ ہو جاتا ہے۔ جوشِ عداوت مسلّم مان لینے کے باوجود یہ بات قیاس میں نہیں آ سکتی کہ میرزا نے دانستہ خاندان کے قدیمی رشتے کو یوں بے تکلفی سے نظر انداز کر دیا ہو۔ ان میں سے آخری بیان (نمبر۴) اس خط سے ماخوذ ہے جو میرزا احمد بیگ خاں تپاںؔ کو لکھا گیا تھا اور وہ نواب احمد بخش مرحوم کے نسبتی بھائی یعنی امین الدولہ احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کے ماموں تھے چوں کہ نواب احمد بخش خاں کے ہم خاندان تھے اس لیے میرزا غالبؔ اور خواجہ حاجی کے خاندانی حالات سے پوری طرح واقف ہوں گے یقین نہیں آ سکتا کہ میرزا غالبؔ نے ان کی زبان سے اپنے ایک ہم جد کے نام کے ساتھ ''خاں'' کا لفظ سُن کر بے وجہ تردید کی جرأت کی ہو۔ ان حالات میں میرا اندازہ یہی ہے کہ خواجہ حاجی اور میرزا غالبؔ کا خاندان ایک نہ تھا یا اگر ان میں کوئی تعلق ہوگا تو بعید سا ہوگا۔ البتہ یہ درست ہے کہ جب جھگڑے مٹ گئے۔ پنشن کے مقدمہ کا فیصلہ میرزا غالبؔ کے خلاف صادر ہو گیا تو خواجہ حاجی کے بیٹے بدر الدین امان کے ساتھ ربط وضبط نئے سرے سے پیدا ہو گیا اور میرزا انھیں اپنا بھتیجا کہنے لگے۔

پنشن کا معاملہ:

پنشن کے سلسلہ میں میرزا فرحت اللہ بیگ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ بھرت پور سے صلح کے بعد اپریل ۱۸۰۵ء کو جدید بھرتی کی ہوئی فوج توڑ دی گئی۔ اس میں میرزا نصر اللہ بیگ خاں کی فوج بھی موقوف ہوگئی لیکن میرزا اور ان کے خاندان والوں کو جن میں خواجہ حاجی بھی شامل تھا پانچ ہزار روپیہ سالانہ کے دو پرگنے سونگ سونا (کذافی الاصل) اور پونا ہانا مضافات ہوڈل تحصیل فیروز پور جھرکا میں بہ طور جاگیر عطا ہوئے۔

۲۔ ۱۲ھ (۱۸۰٦ء) میں نصر اللہ بیگ خاں نے وفات پائی۔ ان کے بعد خواجہ حاجی نے جو خاندان میں سب سے بڑے تھے، جاگیر کا دعویٰ کیا۔ نواب احمد بخش خاں نے شہادت دی اور جاگیر اس شرط پر خواجہ حاجی کے نام بحال ہوئی کہ نصر اللہ خاں کے پس ماندوں کی پرورش کی جائے۔

۳۔ نواب احمد بخش خاں نے خواجہ حاجی سے کہا کہ آپ کا علاقہ میرے علاقے سے ملا ہوا ہے اور آپ کو مال گزاری وصول کرنے میں مشکلیں پیش آتی ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ علاقہ میرے سپرد کر دو، میں اس کی آمدنی پہنچا دیا کروں گا۔

۴۔ قرار پایا ہے کہ ان پرگنوں کی آمدنی میں سے تین ہزار روپے سالانہ میرزا نصر اللہ بیگ کے پس ماندوں کو اور دو ہزار روپے سالانہ حاجی خاں کو ملیں۔

۵۔ خواجہ حاجی کا انتقال ۱۸۲٦ء میں ہُوا۔ ان کی معاش ان کے بیٹوں خواجہ جان اور خواجہ امان کو ملی۔ میرزا غالبؔ کو خیال پیدا ہُوا کہ سرکار نے جو پرگنے دیے تھے وہ دس ہزار سالانہ کے تھے اور صرف ان کے چچا نصر اللہ بیگ کو دیے گئے تھے۔ انھوں نے اپنی طرف سے اپنے دونوں بھتیجوں (خواجہ جان اور خواجہ امان) پر دعویٰ دائر کر دیا۔

٦۔ کول بروک ریذیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ صاحب سیکریٹری گورنمنٹ انگریزی نے میرزا غالبؔ کے موافق رپورٹ مرتّب کی لیکن گورنر جنرل نے یہ تصفیہ کیا کہ یہ سند سر جان میلکم کے ہاتھ کی لکھی ہُوئی ہے جو اس زمانے میں لارڈ لیک کے سیکرٹری تھے اور اس کے متعلق نواب احمد بخش خاں کی شہادت ہونی ضروری ہے چناں چہ نواب کی شہادت ہُوئی اور فیصلہ میرزا غالبؔ کے خلاف ہوا۔

۷۔ نواب احمد بخش کی وفات پر ان کے فرزند نواب شمس الدین احمد خاں کو بہ سلسلۂ قتل فریزر پھانسی کی

سزا ملی اور ریاست ضبط ہوگئی تو خواجہ جان اور خواجہ امان کے نام پچاس پچاس روپیہ ماہانہ اور ان کی والدہ کے نام بیس روپے ماہانہ کا وظیفہ جاری ہُوا۔

اصلیّت کیا تھی؟

لیکن یہ پوری داستان معلوم و مسلّم واقعات کے سراسر خلاف ہے مثلاً:

۱۔ نصر اللہ بیگ خاں کو سونکھ (Sonekh) اور سونسا (Sonsa) جاگیر میں ملے تھے اور ان کی آمدنی میرزا غالبؔ کے قول کے مطابق لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی تھی۔ جب انگریزوں نے ۱۸۰۳ء میں ضلع متھرا پر قبضہ کیا تو سونسا جنرل پیروں (Perron) کی جاگیر میں تھا جو سندھیا کی فوج میں ملازم تھا۔ اس وقت صرف سونسا کی آمدنی کا اندازہ بیس ہزار روپے تھا (ملاحظہ ہو متھرا گزٹیر مطبوعہ ۱۹۱۱ء ص ۲۰۶)۔

۲۔ سونکھ اور سونسا تحصیل متھرا میں بھرت پور کی ریاست سے متصل واقع ہیں۔ متھرا سے ایک سڑک دیگ کو اور دوسری بھرت پور کو جاتی ہے۔ ان دونوں سڑکوں کے درمیان یہ پرگنے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انھیں فیروز پور جھرکا سے متصل کیوں کر مانا جائے؟

۳۔ پونا ہانہ نواب احمد بخش خاں کی جاگیر میں شامل تھا جیسا کہ اس جاگیر کے کاغذات سے ظاہر ہوتا ہے۔ ضلع گوڑگاؤں کے گزٹیر (صفحہ ۲۴) میں بھی یہی مرقوم ہے۔ اس کے علاوہ نواب احمد بخش خاں کو سانگرس، بچھور اور نگینہ کے پرگنے دیے گئے تھے۔

۴۔ فیصلہ یہ ہُوا تھا کہ نواب فیروز پور جھرکا اور سانگرس کے لیے سالانہ پانچ ہزار، پونا ہانہ، بچھور اور نگینہ کے لیے سالانہ بیس ہزار سرکار انگلشیہ کو دیا کریں۔

۵۔ نصر اللہ بیگ کے انتقال کے ساتھ ہی سونکھ سونسا کی جاگیر انگریزوں نے سنبھال لی۔ ۴۔ مئی ۱۸۰۶ء کو لارڈ لیک نے نواب احمد بخش کے پچیس ہزار روپے اس شرط پر معاف کر دیے کہ وہ دس ہزار روپے سالانہ نصر اللہ بیگ کے پس ماندوں کو دیں۔ مرحوم کے رسالے کے پچاس سواروں کو جن کا افسر خواجہ حاجی تھا، اپنے انتظام میں لے لیں اور قیامِ امن کے لیے حکومت سے کوئی امداد نہ مانگیں۔

۶۔ ایک مہینہ تین دن بعد یعنی ۷ جون ۱۸۰۶ء کو نواب احمد بخش نے لارڈ لیک سے ایک اور حکم حاصل کیا جس کا مضمون یہ تھا کہ پانچ ہزار روپے سالانہ نصر اللہ بیگ کے پسماندوں کو دیے جائیں اور ان میں خواجہ حاجی بھی شامل ہو گا۔

میرزا غالب کا دعویٰ:

نصر اللہ بیگ خاں کا انتقال یقیناً ۴-مئی ۱۸۰۶ء سے پہلے ہوا۔ خواجہ حاجی اگر اس مرحوم کی جاگیر کا دعویٰ کر سکتا تھا تو سونکھ اور سونسا کے لیے کر سکتا تھا جو نواب احمد بخش خاں کی جاگیر سے متصل نہ تھے لیکن ایسا کوئی دعویٰ ہمارے سامنے نہیں۔ ۴-مئی ۱۸۰۶ء اور ۷ جون ۱۸۰۶ء کے درمیان اگر کوئی دعویٰ پیش ہوا تو اس کا بھی کوئی سراغ نہیں ملتا۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ ۴-مئی والے حکم میں نصر اللہ بیگ کے پس ماندوں کے لیے دس ہزار روپے مقرر ہوئے تھے اور خواجہ حاجی کے پچاس سواروں کو نواب سے متعلق کر دیا گیا تھا۔ ۷-جون کے حکم کی رو سے دس ہزار کی رقم گھٹا کر آدھی کر دی گئی اور خواجہ حاجی کو نصر اللہ بیگ کے متعلقین میں شامل کر دیا گیا۔

۱۸۲۶ء میں خواجہ حاجی کا انتقال ہُوا۔ فیروز پور جھرکا کی ریاست نواب احمد بخش خاں نے اپنے فرزند شمس الدین احمد خاں کے حوالے کر دی اور خود قطب صاحب میں اپنے مرشد حضرت مولانا فخر الدین فخر عالم کے مزار کے پاس مشغول ذکر و عبادت ہو گئے۔ اس وقت میرزا غالب کو پنشن کے لیے مقدمے کا خیال آیا اور وہ دہلی سے کلکتہ گئے۔ راستے ہی میں تھے کہ نواب احمد بخش کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد مقدمہ کلکتہ میں دائر ہُوا اور مدعا علیہ والیِ فیروز پور تھا۔ خواجہ حاجی کے بیٹوں پر نہ دعویٰ کیا گیا اور نہ ان سے میرزا غالب کو براہِ راست سروکار تھا۔ دعویٰ یہ تھا کہ والیِ فیروز پور نے پہلے منظور شدہ حکم کے خلاف پنشن کی رقم آدھی کر دی۔ پھر اس آدھی میں خواجہ حاجی کو شامل کر لیا۔ ان دونوں باتوں کا ذمہ دار والیِ فیروز پور تھا نہ کہ خواجہ حاجی یا اس کے فرزند۔

گواہوں کا معاملہ:

اس سلسلے میں احمد بخش خاں سے شہادت لینے کا معاملہ نا قابل فہم ہے۔ جب تک وہ زندہ تھا مقدمہ پیش ہی نہیں ہوا تھا اور جب مقدمہ پیش ہوا، گواہوں کی ضرورت پڑی اس وقت تک نواب احمد بخش خاں جوارِ رحمتِ الٰہی میں پہنچ چکے تھے۔

کول بروک نے میرزا غالب کے حق میں رپورٹ کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ بلا کا رشوت خور تھا اور مقدمہ پیش ہونے سے پہلے ہی موقوف ہو گیا۔ اینڈریو اسٹرلنگ میرزا کے حق میں رپورٹ پیش کرنے سے پیشتر فوت ہو گیا۔ سر جان میلکم سے صرف یہ پوچھا گیا تھا کہ ۷-جون ۱۸۰۶ء والا حکم جسے میرزا

غالب جعلی قرار دے رہے تھے، لارڈ لیک کی مُہر و دست خط سے جاری ہوا یا نہیں؟ میلکم نے گواہی دی کہ اس پر مُہر اور دست خط لارڈ لیک کے ہیں گویا حکم جعلی نہیں لیکن میرزا غالب کے دعوی کی بنا محض یہ نہ تھی کہ یہ حکم جعلی ہے بل کہ اصل بنا یہ تھی کہ پہلا حکم (دس ہزار والا) سرکار کی منظوری سے جاری ہُوا اور اس کی نقل دفتر میں موجود ہے لیکن ۷- جون والا حکم نہ سرکار کی منظوری سے جاری ہوا، نہ اس کی نقل دفتر میں موجود ہے، لہٰذا اسے منسوخ کیا جائے، آیندہ دس ہزار روپے سالانہ ملا کریں اور مئی ۱۸۰۶ء سے جتنی رقم کم ادا ہوئی، وہ یک مشت دی جائے۔

مزید سوالات:

پھر اس سلسلہ میں بعض اور باتیں بھی غور طلب ہیں اگر نصراللہ بیگ کے انتقال کے بعد خواجہ حاجی خاندان میں سب سے بڑا رہ گیا تھا اور مزعوم جاگیر اس کے نام بحال ہوئی تھی تو کیا وجہ ہے کہ پانچ ہزار میں اس نے صرف دو ہزار لیے اور تین ہزار نصراللہ بیگ خاں کے پس ماندوں کو دیے؟ اگر وہ واقعی خاندان کا سرخیل اور اس وجہ سے جاگیر اپنے نام بحال کرانے کا حق دار تھا تو یا تو پوری رقم خود لے کر سارے خاندان کے افراد و طبقات کے گزارے کا ذمہ اٹھاتا یا بڑا حصہ خود لیتا اور کم تر دوسروں کے حوالے کرتا۔

نیز کیا وجہ ہے کہ اس کی وفات پر دو ہزار روپے اس کے پس ماندوں کو نہ ملے اور صرف ایک سو بیس روپے اس کے دو بیٹوں اور بیوی کو دیے گئے؟ اگر اصل جاگیر اس کے نام تھی تو محض اسی کے حصہ میں کیوں ایک دم خاصی کمی ہوگئی جب کہ نصراللہ بیگ کے حقیقی متعلقین کی رقم بہ دستور باقی رہی۔

بہ ہر حال واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ حاجی کو بھی نصراللہ بیگ کے پس ماندوں میں شامل کرنا غلط تھا اگرچہ کسی ذریعے سے اسے ہم جد بھی ثابت کر دیا جائے حالاں کہ ثابت نہیں کیا جا سکتا اسے دو ہزار روپے صرف اس وقت تک ملتے رہے جب تک پچاس سوار نواب احمد بخش کی ملازمت میں تھے۔ جب وہ فوت ہُوا، سوار الگ ہو گئے تو تنخواہ بھی جاتی رہی۔ نصراللہ بیگ کے حقیقی پس ماندوں کا وظیفہ کسی خدمت پر موقوف نہ تھا، اس لیے اس میں کوئی قطع و برید نہ ہوئی۔

مخالفوں کا زور و اثر:

بلاشبہہ نواب احمد بخش خاں مرحوم نے میرزا غالب کے خاندانی وظیفہ میں کمی کرائی۔ نہیں کہا

جاسکتا کہ کیا کچھ کہہ کر لارڈ لیک سے دُوسرا حکم جاری کرایا اور کس بنا پر خواجہ حاجی کو نصر اللہ بیگ کے متعلقین میں شامل کیا؟

یہ بھی حقیقت ہے کہ نواب شمس الدین احمد خاں میرزا غالبؔ کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ ذی وسائل تھے۔ وہ انگریز ریزیڈنٹوں پر اثر ڈال سکتے تھے۔ میرزا افضل بیگ کلکتہ میں شاہ دہلی کا وکیل تھا اور نواب شمس الدّین کے لیے نہیں لیکن اپنے بھانجوں (ابناء خواجہ حاجی) کے لیے تمام ممکن تدبیریں کرتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ میرزا غالبؔ کے خلاف ''جام جہاں نما'' (کلکتہ) میں کوئی تحریر شائع کرادی تھی چناں چہ میرزا ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

> ''امروز تازہ حالی بہ مشاہدۂ اوراق ''جام جہاں نما'' روے دادہ کہ صبر برآں بی آبروی نتوانستم کرد۔ غالبؔ کہ شما ہم درآں اوراق نگرستہ باشید۔ واللہ، باللہ، ثم تاللہ، آنچہ از حالِ من مسکیں درآں ورق مندرج است، ہم کذب و بہتان و گزاف است''۔

صرف طلب حق:

میرزا نے مقدمہ اس لیے دائر کیا تھا کہ اپنا حق حاصل کریں اور وہ ضرورت مند بھی تھے چناں چہ خود لکھتے ہیں:

> ''من مرد حق جوی حق پرستم۔ راست می گویم و حق می جویم۔ نہ عدوی شمس الدین خاں صاحبم و نہ دشمن خواجہ حاجی و پسرانش۔ شمس الدین خاں برادرزن من است و خواجہ حاجی پسر بارگیر جد من و پسرانش از دو پشت خانہ زاد و از سہ پشت نمک خوارِ من۔ از احمد بخش خاں کہ برادرزن عم من (نصر اللہ بیگ) و برادر پدرزن من (الہٰی بخش معروف) بود، دو شکایت داشتم و دارم:
>
> یکی تقلیل مقدار وجہ پرورش بی وقوعِ جرم و گناہ، دوم شمول خواجہ حاجی بی ثبوت وجہ استحقاق''۔

ان امور میں شبہہ کی قطعاً گنجایش نہیں اور میرزا فرحت اللہ بیگ نے غالبؔ کے خاندانی حالات نیز پنشن کے معاملات میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ میرے نزدیک نہ درست ہے اور نہ قابلِ قبول۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۱۔ علی گڑھ میگزین۔ غالب نمبر ۴۹۔ ۱۹۴۸ء

۲۔ (احوال غالبؔ۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ۔ ۱۹۵۳ء)

میرزا غالب کا مقدمہ

غالب کی علمی و ادبی زندگی کا نہایت اہم واقعہ وہ ہنگامہ ہے جو ''قاطع برہان'' کی اشاعت سے شروع ہُوا اور مختلف مرحلوں سے گزرتا ہوا میرزا کی وفات سے تھوڑے دن پہلے اختتام کو پہنچا۔ اس ہنگامے کے اسباب و عوامل کا استقصا تو میرے نزدیک بجائے خود ایک کتاب نہیں تو خاصے بڑے رسالے کا طلب گار ضرور ہے۔ میرا خیال ہے کہ ''قاطع برہان'' کی تسوید سے بہت پہلے موجباتِ انفجار جمع ہونے لگے تھے۔ شاید ابتدا یوں ہُوئی کہ غالب کو آغازِ شباب ہی میں فارسی شاعری میں وہ بلند رتبہ حاصل ہو گیا تھا جو بڑے بڑے اساتذہ کو ریاضت فکر و نظر میں عمریں بسر کر چکنے کے بعد بھی کم تر میسر آیا۔ اس حالت میں میرزا ہندوستان کے ان فارسی گو شاعروں اور نثر نگاروں کو کب خاطر میں لا سکتے تھے جو عوام کے نزدیک استاد مشہور ہو چکے تھے اور ان کے کلام کو دستاویز سند و توثیق مانا جاتا تھا۔

میرزا کا سفر کلکتہ:

غالب کی عمر تیس برس کی تھی جب وہ خاندانی پنشن کے مقدمہ کی پیروی کے لیے کلکتہ گئے اگرچہ کلکتہ اصلاً انگریزی شہر تھا اور اس کی بنیادی خصوصیت، دہلی و لکھنؤ کی طرح مشرقیت نہ تھی بل کہ مغربیت تھی۔ اطوار و رسوم میں بھی ہندوستانیت کے بجائے افرنجیت کا رنگ غالب تھا اور انگریزی حکومت ہندوستان کے بڑے حصے پر چھا چکی تھی لیکن مشرقیت کے دورِ انحطاط کے بعض مشغلے پوری شان کے ساتھ وہاں جلوہ گر تھے۔ ان میں سے ایک چیز یہ تھی کہ انگریزی مہینے کے پہلے اتوار کو مدرسہ کلکتہ میں مشاعرے ہوتے تھے اردو اور فارسی کے شعرا ان میں اپنا کلام سناتے تھے۔ بعض انگریز حاکموں کو بھی اس زمانے میں فارسی کا خاصا ذوق تھا۔

کم ظرف شاعروں کا حسد:

میرزا بھی ان مشاعروں میں شریک ہونے لگے چوں کہ ان کا کلام بہت بلند اور اس عہد کے

ہندوستان میں یگانہ تھا بل کہ پیش تر کے دوروں میں بھی ویسا کلام شاذ و کم تر تھا۔ اس لیے اہل ذوق نے بڑی کشادہ دلی سے داد دی۔ اس پر عام مجلس طراز شعرا کے دل میں رقابت کی آگ شعلہ زن ہو گئی۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر عیب نکالنے لگے۔ سندوں کا معاملہ سامنے آیا تو میرزا نے ان ہندوستانی شعراء کی سندوں کو حقارت سے ٹھکرا دیا جو اس عہد کے اہلِ سخن یا عوام میں مقبول تھے۔

میرزا قتیلؔ:

اس زمانے میں میرزا محمد حسن قتیلؔ بڑے مشہور تھے اور عام طور پر مسلم الثبوت استاد مانے جاتے تھے۔ کلکتہ میں ان کے کئی شاگرد موجود تھے۔ میرزا نے قتیلؔ کو پایۂ اعتبار سے ساقط قرار دیا تو کئی لوگ بگڑ گئے اور ایک گونہ جنگ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ میرزا، حزیںؔ، طالبؔ، عرفیؔ اور نظیریؔ کی ہم پائیگی کا دم مارتے تھے۔ قتیلؔ کے پیچھے چلنا کیوں کر گوارا کر سکتے تھے؟ کیا خوب کہہ گئے ہیں:

غالبؔ سوختہ جاں راچہ بہ گفتار آری
بہ دیارے کہ ندانند نظیریؔ ز قتیلؔ

”قاطع برہان“:

میرزا کی رائے ہندوستان کے عام فارسی شعراء کے متعلق پہلے بھی اچھی نہ ہو گی اور اپنے ذوق صحیح کا دامن داغدار کیے بغیر ان کی رائے کیوں کر اچھی ہو سکتی تھی؟ لیکن میرا خیال ہے کہ اس رائے میں رزم و نبرد اور معارضت و جنگ کی روح کلکتہ کی اسی ادبی کش مکش کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ پھر وہ مخالفت میں تیز سے تیز تر ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ زبان فارسی کے قواعد و اصول استناد کے لیے یک و تنہا میدانِ جنگ میں کھڑے ہو گئے۔ ”قاطع برہان“ اس سلسلے میں ان کی طرف سے ایک الٹی میٹم تھا جس نے دماغ سوختگان تدریس و تعلیم کے پورے لشکر کو ان کے مقابلے پر صف آرا کیا۔

کتاب کی ترتیب:

”برہان قاطع“ فارسی لغت کی متداول کتاب تھی جو محمد حسین برہان نے ۱۰۶۲ھ (۱۶۵۱ء) میں مرتب کی تھی۔ محمد حسین دکن میں رہتا تھا اور اپنے آپ کو آبا کی نسبت سے ”تبریزی“ کہتا تھا۔ میرزا غالبؔ اسے جا بجا ”دکنی“ لکھتے ہیں۔

’’غدر‘‘ کے زمانہ میں میرزا گوشہ نشیں ہو گئے تو ان کے صرف دو مشغلے تھے۔ اوّل ’’غدر‘‘ کے حالات خالص فارسی زبان میں لکھتے رہے۔ دوم ’’برہان قاطع‘‘ کا ایک نسخہ موجود تھا اسے دیکھتے رہے اور جہاں جہاں انھیں سقم نظر آئے کتاب کے حاشیے پر رقم کرتے گئے۔ اس طرح ایک رسالہ کا مضمون فراہم ہو گیا جسے اپنے شاگردوں اور عام فارسی دانوں کے فایدے کے لیے ایک کتاب کی شکل میں مرتب کر دیا اور ’’برہان قاطع‘‘ کی رعایت سے اس کا نام ’’قاطع برہان‘‘ رکھا۔

موافق ومخالف کتابیں:

یہ ۱۸۶۰ء میں مکمل ہوئی۔ ۱۸۶۲ء میں منشی نولکشور کے مطبع میں چھپی۔ اس کے بعد مخالف وموافق جو کتابیں لکھی گئیں ان کی کیفیت یہ ہے:

۱۔ ’’محرق قاطع‘‘ مولفہ مولوی سعادت علی (خلاف)۔
۲۔ ’’ساطع برہان‘‘ مولفہ میرزا رحیم بیگ (خلاف)۔
۳۔ ’’قاطع القاطع‘‘ مولفہ مولوی امین الدین پٹیالوی (خلاف)۔
۴۔ ’’موید برہان‘‘ مولفہ مولوی احمد علی (خلاف)۔
۵۔ ’’شمشیر تیز تر‘‘ مولفہ مولوی احمد علی (خلاف)۔
۶۔ ’’دافع ہذیان‘‘ مولفہ مولوی نجف علی (موافق)۔
۷۔ ’’لطائف غیبی‘‘ مولفہ غالب بنام سیف الحق سیاح (موافق)۔
۸۔ ’’سوالات عبدالکریم‘‘ مولفہ غالب بنام عبدالکریم (موافق)۔
۹۔ ’’نامۂ غالب‘‘ مؤلفہ غالب۔
۱۰۔ ’’تیغ تیز‘‘ مؤلفہ غالب۔

جنگِ منظومات:

میرزا نے ’’موید برہان‘‘ کے جواب میں اکتیس شعر کا ایک قطعہ کہا تھا۔ اس پر منظومات کی جنگ چلی جس میں مولوی احمد علی کے شاگرد عبدالصمد فدا سلہٹی، سیّد شاہ باقر علی باقر بہاری، خواجہ فخر الدین حسین سخن، جواہر سنگھ جوہر لکھنوی اور محمد امیر صاحب امیر لکھنوی نے حصہ لیا۔ موافق ومخالف کئی سو اشعار کہے گئے۔ یہ سارا مجموعہ پہلے ’’تیغ تیز‘‘ کے نام سے پھر ’’ہنگامہ دل آشوب‘‘ کے نام سے چھپ گیا۔

اصل مقصد سے اعراض:

سوچنے اور غور کرنے کی بات یہ نہ تھی کہ غالب نے جو کچھ لکھا تھا، وہ سارے کا سارا صحیح و درست تھا یا نہیں۔ محض یہ امر پیشِ نظر رکھنا چاہیے تھا کہ جن اصول و قواعد کی رعایت پر میرزا زور دے رہے ہیں ان کی حیثیت کیا ہے؟ وہ کس حد تک درست ہیں؟ ان کو نظر انداز کرنے سے فارسی زبان کے متعلق کیا کیا خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں؟ لیکن تقلید جامد ایسی بلا ہے کہ جس میں مبتلا ہونے کے بعد حق و انصاف کی پاسداری کی کسی اُمید کا پورا ہونا محال ہے۔ اصل مقصد و مدعا کو کسی نے پیشِ نظر نہ رکھا۔ جو شخص اٹھا صرف یہ ڈھونڈنے اور تلاش کرنے میں لگ گیا کہ صاحب ''برہان قاطع'' نے جو غلطیاں کی تھیں، ان کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کوئی سہارا مل سکتا ہے یا نہیں۔ گویا مقصود یہ نہ تھا کہ زبان فارسی کی خدمت انجام پائے صرف یہ تھا کہ محمد حسین دکنی دو برس پیش تر جو کچھ کہہ گیا تھا، اسے ہر لحاظ سے منزہ عن الخطا ثابت کر دیا جائے۔

تقلید جامد کی مصیبتیں:

یہ بیماری غالب سے پہلے بھی عام تھی۔ غالب کے عہد میں بھی عام رہی اور آج بھی عام ہے۔ اصول و مقاصد کا لحاظ ہمیشہ بہت کم رکھا گیا۔ فروع و زواید کی رعایت میں جانیں لڑاتے رہنے کا جنون پہلے بھی ہمہ گیر تھا اور آج بھی ہمہ گیر ہے۔ مذہب ہو یا سیاست، تاریخ ہو یا فلسفہ، شعر ہو یا ادب، بس کوئی بات شیوۂ عام اور رغبت عوام سے ہٹ کر کہیے یا لکھیے، غیر ممکن ہے کہ غیظ و غضب کا طوفان نہ امنڈ آئے۔ غیر ممکن ہے کہ لوگ بھالے اور خنجر، برچھیاں اور تلواریں لے کر میدان میں نہ آ جائیں۔ غیر ممکن ہے کہ سچ کے جھوٹ اور جھوٹ کے سچ ثابت ہونے پر اس رنگ میں شادمانی کی بساط نہ بچھائی جائے کہ گویا ایک بہت بڑا کام انجام پا گیا ہے۔

افسوسناک طرزِ عمل:

میرزا سے بھی تحقیق میں غلطیاں ہوئی ہوں گی اور غلطیاں کس سے نہیں ہوتیں؟ لغزشوں اور خطاؤں سے کس کا دامنِ تحقیق لازماً پاک رہا ہے؟ لیکن دیکھنے کی بات تو یہ اور صرف یہ تھی کہ جن اصول و قواعد کو لے کر وہ کھڑے ہوئے تھے، ان کا مقام و مرتبہ کیا ہے؟ محض فارسی زبان ہی نہیں بلکہ ہر زبان کی تحقیق کے مآخذ و مبانی کیا ہو سکتے ہیں؟ پھر ان مآخذ و مبانی کے حدود و حیثیات پر بحثیں کی

جا سکتی تھیں۔ یہ طے کیا جا سکتا تھا کہ ان سے کہاں کہاں، کس کس طریق پر اور کس حد تک کام لیا جائے۔

لیکن اس اصل کو چھوڑ کر صرف یہ چیز مقصد تحریر و نگارش بنالی گئی کہ میرزا غالب نے جو کچھ لکھا ہے، اسے ہر حال میں غلط ثابت کیا جائے اور ''برہان قاطع'' کے ایک ایک لفظ کے لیے توثیق کے سامان پیدا کیے جائیں۔

مولانا آزاد کی رائے:

مولانا ابوالکلام آزاد نے ''قاطع برہان'' کے متعلق کیا خوب تحریر فرمایا ہے کہ میرزا غالب نے یہ چند اجزا لکھ کر علم و تحقیق کی بڑی خدمت انجام دی ہے:

''برہان قاطع'' کے جو خرافات انھوں نے نقل کیے ہیں انھیں پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ کوئی اہل علم و بصیرت کیوں کر ان کی تائید کر سکتا ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ سارا معاملہ ایک طرح کا منطقی مصادرہ تھا اعتراض ہندی لغت نویسوں پر تھا اور ہندی لغت نویسوں ہی کا کلام بہ طور دلیل کے پیش کیا جاتا تھا''۔

اس ضمن میں بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن میرا موضوع غالب کا مقدمہ ہے۔ ''قاطع برہان'' کے سلسلے کی کتابوں کا رشتہ بیان نہیں کھول سکتا تاہم ایک مثال ضرور ملاحظہ فرمالیجیے:

ایک مثال:

صاحب ''برہان قاطع'' نے ''آب دہ دست'' کے متعلق لکھا ہے:

بہ کسر دال ابجد و ہائے ہوز اشارہ بہ حضرت رسول صلوٰۃ اللہ علیہ است خصوصاً و شخصی را نیز گویند کہ بزرگ مجلس بود و آرایش صدر و زینت از و باشد عموماً۔

میرزا غالب لکھتے ہیں کہ ''آب دہ دست'' مرکب ہے ''آب'' و ''دہ'' و ''دست'' سے۔ ''دہ'' ''دادن'' کا امر ہے۔ ''دست'' کے معنی دوسرے معانی کے علاوہ مسند کے بھی ہیں۔ اس طرح ''آب دہ دست'' کے معنی ''رونق دہندۂ مسند'' ہوئے۔ جب تک اسے نبوت یا رسالت یا ہدایت کا مضاف نہ بنائیں گے اس سے وہ معنی کیوں کر پیدا ہوں گے جو صاحب ''برہان قاطع'' نے نقل کیے ہیں؟ تنہا اس کے معنی تو ہوں گے ''ہاتھ دُھلانے والا''۔

معلوم ہوتا ہے کہ ''صاحب برہان'' نے کہیں ''آب دہ دست رسالت'' دیکھ لیا ہے اور آدھے مضمون کو لغت سمجھ لیا ہے۔

اہلِ نظر اعتراف فرمائیں گے کہ میرزا نے جو کچھ لکھا ہے وہ ہر لحاظ سے صحیح اور درست تھا لیکن مخالفوں کی جس کتاب کو اٹھا کر دیکھیں گے، یہ درج ہوگا کہ ''مدار الافاضل''، ''موید الفضلا'' اور ''فرہنگ رشیدی'' میں وہی مرقوم ہے جو ''برہان قاطع'' میں ہے۔

بہ سوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

مولوی امین الدین پٹیالوی مولف ''قاطع القاطع'' تو اس حد پر جا پہنچے کہ جب ''دست'' کے معنی مسند کے علاوہ ''جانشین اکابر و بزرگاں'' بھی ہیں تو:

''دریں صورت معنی آب دہ دست: رونق دہندہ جانشین اکابر خواہد بود۔ پس کنایہ از ذات مبارک سرور کائنات صلعم چرا نہ باشد''۔

کتاب کی حیثیت:

میرزا نے ''قاطع'' کے آغاز میں ''برہان'' کے متعلق تحریر فرمایا تھا۔

کتاب آسمانی نیست کہ چون و چرا در آں نہ گنجد، گفتار آدمی است ہر کہ خواہد بہ میزانِ نظر سنجد۔

لیکن برہان کے حامیوں نے اسے آسمانی کتاب کا درجہ دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور ''قاطع برہان'' کی طباعت و اشاعت سے لے کر میرزا غالب کی زندگی کے آخری ایام تک اس مرحوم پر وہ تمام تکلیفیں، مصیبتیں اور مشقتیں عائد کی جاتی رہیں جو اہل علم و نظر پر جامد مقلدوں کی طرف سے ہمیشہ عاید ہوتی رہی ہیں۔ یہاں تک کہ خواجہ حالی مرحوم کے بیان کے مطابق لوگ ان کے نام گمنام خط بھیجتے رہتے تھے جو سراسر گالیوں سے لبریز ہوتے تھے۔ میرزا جیسے حساس آدمی پر جو گزرتی ہوگی اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جنھیں خود اس قسم کے حالات سے سابقہ پڑ چکا ہو۔

میرزا کی لطافت طبع:

میرزا غالب بلا کے شوخ طبع، بذلہ سنج اور نکتہ نواز تھے۔ ''برہان قاطع'' کی غلطیوں پر بحث کرتے ہوئے ان کی تحریر میں شوخی اور ظرافت بھی آ گئی۔ وہ خود اپنے قطعہ میں مولوی احمد علی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

زشت گفتم، لیک دادِ بذلہ سنجی دادہ ام — شوخیِ طبعی کہ دارم ایں تقاضا کردہ است
من سپاہی زادہ ام، گفتارِ من باید درشت — وائے بروے گر بہ تقلیدِ من اینہا کردہ است

بہرِ من توہین و بہرِ خویش تحسیں جابجا ہم مراہم خویش را در دہر رسوا کردہ است

مخالفوں کو انداز تحریر کی یہ شگفتگی و دلپذیری میسّر نہ تھی اس لیے سخیفانہ تعریضات پر اتر آئے۔ مولوی امین الدین پٹیالوی صاحب ''قاطع القاطع'' سب سے آگے نکل گئے۔

''قاطع القاطع'':

یہ کتاب ۲۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ علمی متانت اور شائستگی کے معیار سے گِری ہوئی ہے۔ جا بجا غیر مہذّب فقرات اور ارشادات موجود ہیں۔ میرزا کو اسے دیکھ کر یقیناً بڑا رنج ہُوا ہوگا لیکن نہ انھوں نے اس کا کوئی جواب دیا اور نہ غالباً کسی قانونی کارروائی کے لیے تیار تھے۔ وہ خود ''تیغ تیز'' میں لکھتے ہیں کہ میاں امین الدین نے جواب پٹیالہ میں ملقوب بہ مدرس ہیں ''قاطع القاطع'' چھپوائی۔ انھوں نے مجھ کو:

وہ مغلظ گالیاں دی ہیں جو کنجڑے اور بھٹیارے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ یا رب میاں امین الدین کس بُری قوم کے اور کس پاجی گروہ کے ہیں کہ مولوی کہلائے۔ مدرس بنے مگر الفاظ مستعملۂ قوم نہ چھوڑے اگر میری طرف سے ازالۂ حیثیت عرفی کی نالش ہو جاتی تو میاں پر کیسی بنتی؟ مگر میرے کبر نفس نے ازالۂ حیثیت کے لفظ کو گوارا نہ کیا۔ ان کی تحریر ان کے پاجی پن پر سجل ہے۔

مقدمہ ازالہ حیثیت:

دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ میں اگر شاعر نہیں، عالم نہیں، آخر شرافت و امارت میں ایک پایہ رکھتا ہُوں۔ عالی خاندان ہوں۔ امراء، رؤسا اور مہاراجگان مجھے جانتے ہیں۔ پادشاہ کی سرکار سے نجم الدولہ خطاب ملا۔ گورنمنٹ کے دفتر میں ''خان صاحب بسیار مہربان دوستاں'' القاب ہے۔ اس کی ہتک خوب انعلام (کذا) اہانت المولی کے مطابق گورنمنٹ کی ہتک ہے۔

میں نے معلم امین بے دین کو شیطان کے حوالے کیا۔ احمد علی (صاحب موید برہان) کے الفاظ مذموم سے قطع نظر کیا اور ان کے مطالب علمی کا جواب اپنے ذمّہ لیا۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ کے دوستوں اور نیاز مندوں نے انھیں مولوی امین الدین کے خلاف استغاثہ کے لیے تیار کر لیا تھا چناں چہ ۲ دسمبر ۱۸۶۷ء کو انھوں نے مقدمہ دائر کیا ۲۳ مارچ ۱۸۶۸ء کو فریقین کے درمیان راضی نامہ ہو جانے پر یہ جھگڑا ختم ہُوا۔

پورے مقدمے کی کارروائی پانچ چھ برس ہوئے انجمنِ ترقی اُردو کو مل گئی تھی اور اسے اپریل ۱۹۴۳ء کے رسالہ اردو میں چھاپ دیا گیا تھا لیکن ترتیب ٹھیک نہیں رہی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ اگر اسے مرتّب صورت میں پیش کر دیا جائے تو پڑھنے والے غالباً زیادہ فائدہ اٹھا سکیں گے۔ میں تمام کاغذات کی عبارتیں یہاں نقل نہیں کروں گا صرف حالات بتاؤں گا یا بعض ضروری اقتباسات دوں گا البتہ میرزا غالب کی کوئی تحریر نظر انداز نہیں کروں گا۔

میرزا کی پہلی درخواست:

اوبرائن صاحب اس زمانے میں دہلی کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ میرزا نے ۲ دسمبر ۱۸۶۷ء کو صاحب کے نام مندرجہ ذیل عرضی لکھی:

صاحب والا مناقب عالی شان سرچشمۂ لطف و احسان جناب صاحب ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر دہلی دام اقبالہ،

بعد عرض مدارج تعظیم و تسلیم گزارش کرتا ہوں کہ مجھے ایک شخص پر ازالۂ حیثیت عرفی کی نالش کرنی منظور ہے۔ اس واسطے اگرچہ میرے مدارج عزّت آپ کو خوب معلوم ہیں لیکن چوں کہ اس دعوے کے بیان میں کچھ بیان اپنی عزّت کا ضروری ہے لہٰذا عرض کیا جاتا ہے کہ:

میں قوم ترک ہوں اور دادا میرا شاہ عالم کے عہد میں ترکستان سے آیا۔ باپ اور چچا بہ سبب ضعف سلطنت (مغلیہ) مرہٹوں کی نوکری کرتے رہے۔ باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر سرکاری عمل داری سے پہلے یعنی دہلی اور آگرہ پر انگریزوں کا قبضہ ہونے سے پہلے ایک لڑائی میں مارا گیا۔ حقیقی چچا میرا نصراللہ بیگ خاں بہادر جرنیل لیک بہادر کا رفیق مع چار سو سوار کے سرکشانِ ہند (یعنی جو انگریزوں کے خلاف سرکش تھے) کی لڑائیوں میں شریک رہا۔ چار سو سوار کا برگیڈیر اور لاکھ روپیہ کے پرگنے کا جاگیردار تھا۔ جرنیل صاحب کے سامنے بہ مرگ ناگاہ مر گیا۔ جاگیر موافق قرارداد سرکار میں بازیافت ہوئی اور میرے واسطے بہ عوض جاگیر کچھ نقدی سرکار سے مقرر ہو گئی۔

پس میں رئیس زادہ بہ عوض جاگیر نقدی پانے والا ہوں۔ جاگیرداروں کے بعد میرا نمبر ہے اور باقی آپ کے دفتر سے لے کر دلّی کی کمشنری اور لاہور کی لفٹنٹ گورنری، کلکتہ کے گورنر جنرل بہادر کے دفتر تک میرے مدارج عزت بہ خوبی ثابت ہیں۔

ایک شخص امین الدین نام دلّی کا رہنے والا کہ اب وہ پٹیالہ میں راجا کے مدرسے کا مدرس ہے۔ اس نے ایک کتاب لکھی اگرچہ بناء کتاب کی بحث علمی پر ہے لیکن اس نے بحث علمی میں میرے واسطے وہ الفاظ ناشائستہ اور ایسی گالیاں دی ہیں کہ کوئی شخص 'کولی' چمار کو بھی یہ الفاظ نہ لکھے اور ایسی گالیاں نہ دے گا۔ ناچار میں نے منشی عزیز الدین کو اس مقدمہ میں وکیل کیا ہے۔ امیدوار ہوں کہ بعد تصدیق وکالت نامہ سررشتۂ فوج داری میں پیش ہو اور خاص آپ کی تجویز سے اوّل سے آخر تک یہ مقدمہ فیصل ہو اور کسی محکمۂ ماتحت میں یہ مقدمہ سپرد نہ ہو۔ فقط

راقم اسد اللہ خاں غالبؔ، مرقوم دوم دسمبر ۱۸۶۷ء

وکالت نامہ:

اوبرائن صاحب نے اس عرضی پر حکم لکھا کہ فوج داری مقدمات اسسٹنٹ کمشنر کے پاس پیش ہوتے ہیں لہٰذا یہ مقدمہ بھی وہیں جانا چاہیے چوں کہ اسسٹنٹ کمشنر بھی جس کا نام اسٹاکڈن تھا۔ اوبرائن کے قول کے مطابق میرزا کو جانتا تھا اس لیے عرضی بھی اس کے پاس بھیج دی گئی۔

وکالت نامہ پہلے ہی تیار کرلیا ہوگا لیکن میرزا نے اس پر ۴- دسمبر کی تاریخ ثبت کی ہے۔ گویا سمجھنا چاہیے کہ عرضی کے بعد وکالت نامہ ۴- دسمبر کو داخل کیا گیا۔ عزیز الدین صاحب میرزا کے وکیل تھے۔ وکالت نامہ کا متن یہ تھا:

جو مجھ کو بہ نام امین الدین ساکن دہلی، مدرس مدرسہ پٹیالہ بابت ازالہ حیثیت عرفی حسب دفعہ ۵۰۰,۵۰۱ تعزیرات ہند بہ صیغۂ فوج داری نالش کرنی منظور ہے لہٰذا میں نے اپنی طرف سے عزیز الدین وکیلِ سررشتہ کو واسطے گزارنے عرضی اور پیروی کرنے مقدمہ کے وکیل کیا۔ وکیل مذکور جو کچھ سوال و جواب مقدمہ ہذا میں کرے جملہ ساختہ پرداختہ اس کا مثل ذات خاص اپنی کے قبول و منظور ہے اس واسطے یہ مختار نامہ لکھ دیا گیا۔ فقط

گواہ شد	العبد	گواہ شد
دیبی پرشاد	محمد اسد اللہ خاں	منشی وزیر علی

مرقوم ۴ر دسمبر ۱۸۶۷ء

عرضی دعویٰ:

چناں چہ ۱۵- دسمبر کو عزیز الدین وکیل میرزا نے ایک عرضی مسٹر اسٹاکڈن کے پاس پیش کی جس کا متن یہ تھا:

جناب عالی!

جو حال عزت و اقتدار میرے موکل (غالب) کا گورنمنٹ میں ہے اس کی تصریح دفاتر سرکاری اور آمد خطوط و چٹھیات حکام، خصوصی سیکرٹری گورنمنٹ پنجاب و نواب گورنر جنرل بہادر کشور ہند سے بخوبی ہو سکتی ہے۔ مسمیٰ امین الدین ساکن دہلی حال مدرس مدرسہ پٹیالہ نے ایک کتاب ’’قاطع القاطع‘‘ بہ جواب ’’قاطع برہان‘‘ مصنفہ موکلم تصنیف کی۔ اس میں ایسے الفاظ ناشائستہ بل کہ دشنام مغلظہ نسبت موکلم تحریر کیے ہیں اور اس کتاب کو چھپوا کر مشتہر کیا کہ جس سے نیک نامی کو نقصان پہنچنے کا باعث ہوا اور ازالۂ حیثیت کہ جس کی تعریف دفعہ ۴۹۹ تعزیرات ہند میں درج ہے وقوع میں آوے۔ پس مدعا علیہ مرتکب اس جرم کا ہوا جس کی سزا تعزیرات ہند کے ۵۰۰ اور ۵۰۱ میں قرار پائی ہے لہٰذا امیدوار ہوں کہ بعد تحقیقات معروضہ فدوی کے مدعا علیہ کی سزا مندرجہ دفعات مذکورہ فرمائی جاوے کہ آیندہ عزت داراں سرکار کا کوئی مزیل حیثیت کا نہ ہووے۔ زیادہ حد آداب۔

قابل اعتراض عبارتیں:

جن الفاظ و فقرات کو باعث ازالۂ حیثیت قرار دیا گیا تھا وہ تعداد میں اٹھارہ تھے۔ ان کی کیفیت واضح کرنے کے لیے میں ’’برہان قاطع‘‘ اور ’’قاطع القاطع‘‘ کی عبارتیں بالمقابل لکھتا ہوں۔

عبارت ’’برہان قاطع‘‘ محمد حسین دکنی	عبارت ’’قاطع برہان‘‘ میرزا غالب	عبارت ’’قاطع القاطع‘‘ مولوی امین الدین
’’آب زیر کاہ‘‘...... کنایہ از خوبی و نیکی مخفی و رواج و رونق خس پوش ہم است۔	......رواج و رونق از نیروہاے باطنی نیست، اندام نیز نیست کہ آں را نہانی تواں گفت۔	......نیروے باطنی بہ گزارش مدعا کافی نہ بود کہ اندام را بہ نظر تماشائیاں جلوہ دادہ است۔ ص ۱۱

’’آبِ سیہ‘‘......شراب انگوری وعلت کوری باشد۔	......شراب انگوری و علت کوری کدام ترتیب است؟ آرے آبِ مروارید و آبِ سیہ دوگونہ آب است کہ در چشم فرود آید و بینائی رازیاں دارد۔ آبِ سیہ بہ چشم مخصوص نیست درپاے اسپ نیز ازیں نام نشاں یافتہ اند۔ ہمانا رنگِ شراب از سہ بیش نیست: ریحانی، زعفرانی وارغوانی۔ آبِ سیہ گفتن و شراب انگوری مراد داشتن ہماں علت کوری است۔ (ص۵)	نیک حیرانم و سخت پریشاں کہ صاحب کتاب ’’برہان‘‘ بدیں بیچارہ (غالب) چہ حرکت ناکردنی کردہ است......باید کہ پیش حاکم وقت رفتہ زخم نہانی خویش درنماید تا فریادش کارگر آید۔ (ص۱۳)

آذرم:......اسپے را گویند کہ نمدزین آں دونیم باشد و بہ معنی نمدزین ہم آمدہ۔	آذرم رنگے از رنگ ہاے اسپ نیست......چیزے است کہ بہ پشت اسپ نہند......نمدزین را گویند کہ اسم دیگر آں تکلتو است و در عرف اہل ہند ’’خوگیر‘‘ اسم اوست۔ دراصل خوگیر نیز فارسی است اما نہ بدیں صورت بل کہ خوئے گیر بواوٗ معدولہ و تحتانی۔ (ص-۸)	......ایں خرعیسیٰ نمدزین را بر پشت خود نہادہ است۔ می خواستم کہ در جواب ایں لغویات بہ دشنام پردازم و ایں سودازدہ را بہ سزاے معقول، معقول سازم اما بہ خاطر رسید کہ بہ دشنام پرداختن زبان خودرا بہ لوث بدگوی ملوث ساختن است۔ (ص۲۳)

اروند:......شان و شوکت و فروشکوہ را گویند۔	اروند بہ فتح الف والوند بہ لام نیز نام کوہی است و نام دریاے نیز۔ اما باشد کہ آروند بہ الف ممدودہ و اراوند بروزن رضامند نیز گفتہ باشد۔ اُروند بہ ضمہ الف خلاصہ وزبدہ و بسیط را گویند کہ مقابل مرکب است......آموزگار ہرمزدم عبد الصمد گاہ گاہ در مکاتبات خود را اروند بندہ نوشتے۔ چوں پژوہش رفت فرمود کہ ”اروند بندہ“ مضاف و مضاف الیہ مقلوب است یعنی بندۂ اروند، بندہ ترجمہ عبد اروند ترجمہ صمد (ص-۱۰) (عبدالصمد ہرمزد کا اسلامی نام تھا)	......معترض در شرح آرنگ در گلِ لالے فرو رفتہ بود و در بیان آروند میان خون حیض غوطہ خورد۔ (ص-۲۸)

آویزہ: بروزن پاکیزہ گوشوارہ را گویند۔	حاشا کہ آویزہ گوشوارہ یکے تواند بود۔ گوشوارہ چیزے است زرنگار یا مرصع بہ جواہر آبدار کہ بردستار پچیند و آویزہ پیرایہ است یعنی (زیور) کہ در نرمہ گوش سوراخ کنند و آں پیرایہ را درآں اندازند تا آویزاں باشد۔ (ص ۱۴)	ظریفاں را مژدہ باد کہ کلال اکبرآباد (غالب) در ایں جا تمسخرہا بہ کار بردہ است و مضحکہا برائے خود آوردہ رقص میمونی می نماید و شتر غمزہ را کارے فرماید تا بزم سور و سرور را ساز دہند و بعد خندہ و بازی سیلی وگردنہا را بروئے او بنیاد نہند۔ (ص ۴۲)
ارتنگ: بروزن فرہنگ نگار خانۂ مانی نقاش باشد و نام بت خانۂ چیں ہم است و نام کتابے است کہ اشکال مانوی درآں نقش است۔	مگر نگار خانہ مانی دیگر است و کتابے کہ اشکال مانوی درآں نقش است دیگر؟ نازم بایں حسن بیاں۔ ......ارتنگ بہ معنی مرقع تصویر مطلق مگر چوں آں را بہ سوے مانی مضاف گردانند۔ ارتنگ مانی و ارتنگ مانوی خوانند......	نگار خانہ مانی دیگر است یعنی علم خانہ و نگار خانہ مانی دیگر است یعنی کتاب مانوی دریں صورت معترض راچہ انعام باید داد مگر فصد باید کشاد تا جنونش فرو گردد۔ (ص ۵۱)

	ارژنگ بہ زاے فارسی اسم است سہ مسمیٰ دارد...... نخست دیوے کہ رستم آں راکشت دوم گردے کہ طوس آں راکشت۔ سہ دیگر نقاشے کہ ہم چوں مانی و بہزاد دریں فن صاحب دستگاہ و نام آور بود۔ (ارژنگ کا ذکر اس لیے کیا کہ صاحب ''برہان'' نے ارتنگ کے بعد ارثنگ، ارجنگ اور ارژنگ کے بھی یہی معنی لکھے)۔ (ص ۱۶-۱۷)	
افشار: بروزن دستار بہ معنی افشردن باشد یعنی آب و ز چیزے بہ زور دست گرفتن و ریزندہ و ریختن پی در پی را نیز گویند و بہ معنی خندیدن ہم آمدہ است و امر بدیں معنیٰ نیز ہست۔	صیغۂ امر را بہ معنی مصدر و فاعل آوردن و پایان کار بہ سوے معنی امر ایما کردن سکہ اوست...... افشردن و فشردن بہ معنی ریختن و خلانیدن زینہار نیست وبیش از سہ معنی نہ دارد۔ یکے از جامہ نمناک یا ازمیوہ تازہ آب گرفتن ہندی آں	ایں خبطی را حقیقت ہر در لغت از فرہنگ دیگر نشاں می دہم تا در خبط نہ ماند...... الخ (ص ۶۱)

	’’نچوڑنا‘‘۔ دوم بہ زور در آغوش گرفتن یا بہ شکنجہ کشیدن ہندی آں ’’بھینچنا‘‘۔ سہ دیگر چوں باقدم یا پاے استعمال کنند معنی استوار کردن و ہندی آں ’’گاڑنا‘‘۔ تنبیہ: اُل بہ ضم اول بہ معنی اونشاں می دہد۔ اسکندر را مخفف ’’الاساندرا‘‘ یا معرب ’’الاسانندرا‘‘ می...... الخ (آلاساندرا یعنی ایلکساندر) (ص ۱۹)	
	تنبیہ: اُنگَبَہ: بہ معنی برزی گر سامان خداوند، جاہ مندور یک فصل ے نویسد و در فصل دیگر انگشتبہ بروزن خرپشتہ ہم بدیں معنی رقم می زند...... کاش از بوم دکن دگرے برخیز دو گوید کہ صحیح اِنگَیہ است بروزن خصیہ۔ (ص ۲۱)	آرے از خرابہ اکبرآباد بوے بہ دہلی رسیدہ است کہ انکیہ و بے خصیہ را بہ صداے منحوس سرائیدہ است۔

	تنبیہ: در بحث ہمزہ با تحتانی ''ابر'' بہ الف مفتوح بہ تحتانی زدہ آلت تناسل را می گوید۔ و در بحث ہمزہ باباے موحدہ ''اَبَر'' بہ فتحتین کہ ترجمہ علی و مزید علیہ مشہور است نیز نام آلت تناسل مے گیرد گوی ہر جا ہمیں عضو را می بیند۔ (ص۴۲)	معترض ازیں عضو صدمتی دیدہ است کہ بہ ذکر آں بر خود لرزیدہ است۔

مزید فقرات:

یہ چند فقرے بہ طور مشتے از خروارے پیش کر دیے گئے تھے لیکن کتاب میں ایسے فقرات کی کمی نہ تھی مثلاً:

۱۔ چہ کند بے چارہ معذور است و از مطالعۂ کتب فرسخ ہا دور است۔

۲۔ ایں سگ دیوانہ را باید دید کہ بہ فحواے ان تحملہ یلھث و ان تترکہ یلھث (اصل آیت یوں ہے: اِن تحمل علیہ یلھث او تترکہ یلھث) عفعفے می کند۔ (ص۱۱۳)

۳۔ فی الواقع دگر ایں چنیں تہمت را حاکم متصف می دید بنی چہ گویم گوشش می برید۔ (ص۱۲۷)

۴۔ بضاعت خواجہ ہمیں ازار است، ہر کس را نشاں می دہد تا خریداری نماید و گرہ از کار او کشاید۔ (ص۱۴۱)

۵۔ معترض خایہ را چرا گرفت مگر براے نانخورش گرفتہ باشد۔ (ص۱۴۲)

۶۔ گوئی جستن خرس را یاد کردہ است و رقص بوزینہ را بہ اظہار آوردہ۔ نہ فارسی را آموختہ است و نہ در عربی مایہ اندوختہ است۔ (ص۱۶۴)

۷۔ بہ سزاے آں گوش و بنی چرا گویم دست خواہد برید۔ (ص۱۷۲)

ان میں سے بعض مثالیں مقدمہ کے دوران میں بھی پیش ہوئیں۔

میرزا کی دوسری درخواست:

بہ ہر حال ۱۵ دسمبر ۱۸۶۷ء کو مندرجہ بالا عبارات وفقرات انگریزی ترجمہ سمیت عدالت میں پیش ہوئے لیکن میرزا غالب کو پسند نہ تھا کہ ان کا مقدمہ اسسٹنٹ کمشنر کی عدالت میں جائے شاید اس لیے کہ اسسٹنٹ کمشنران کے حالات سے زیادہ واقف نہ تھا لہٰذا ۲۳۔ جنوری کو انھوں نے پھر ایک درخواست مسٹر او برائن ڈپٹی کمشنر کے پاس پیش کی، جس کا مضمون یہ تھا:

صاحب والا مناقب عالی شان، سرچشمہ لطف واحسان جناب ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر دہلی زاد شوکتہ۔

بعد تعظیم وتکریم واظہار آرزو بہ مواصلت کثیر الافادت التماس یہ ہے کہ تخمیناً تیسرا مہینہ ہے (حقیقتاً ایک مہینہ اکیس دن) کہ میں نے بہ وکالت منشی عزیز الدین صاحب، صاحب کی عدالت فوج داری میں ازالۂ حیثیت پیش کیا۔ وکالت نامہ تصدیق ہوگیا اور میرا خط مع وکیل کے حضور میں گزرا اور آپ نے وہ مقدمہ تجویز کے واسطے صاحبِ والا قدر راسٹا کڈن صاحب بہادر کے سپرد کیا۔

میری خوشی تو اسی میں تھی کہ وہ مقدمہ آپ تجویز کرتے۔ اب بہ صد گونہ عجز وزاری استدعا کرتا ہوں کہ کاغذات مقدمہ وہاں سے منگائے جائیں اور حضور کے سامنے پیش کیے جائیں تاکہ امین الدین مدعا علیہ کی طلبی کا حکم پٹیالہ کو جائے اور بعد اس کے حاضر ہونے کے بہ مواجہہ اس کے اور میرے وکیل کے مقدمہ تجویز ہوکر میری دادرسی ہو اور مدعا علیہ کو سزائے سخت ملے تاکہ پھر کوئی چھوٹا آدمی بڑے آدمی کو ایسے کلمات فحش وناسزا نہ لکھے۔

مجھے یقین ہے کہ آپ اس اپنے تابع دار قدیم کی عرض قبول کرلیں گے اور بہ ذات خود میری دادرسی فرمائیں گے۔ فقط

راقم اسد اللہ خاں غالب

۲۳ جنوری ۱۸۶۸ء

صاحب نے اس پر اسی روز حکم لکھوایا کہ ''یہ ممکن نہیں''۔

میرزا غالب کی طبیعت کے بعض عجیب وغریب رجحانات اس درخواست میں بھی نمایاں ہیں مثلاً:

۱۔ اپنی خاندانی بڑائی اور مقابل کی فروتری کا شدید احساس۔

۲۔ حاکم کے ساتھ تعلق کی بناء پر سادہ لوحی سے یہ امید قائم کر لینا کہ درخواست دیکھتے ہی وہ فوراً ازالۂ حیثیت کے متعلق اس نقطۂ نگاہ کو قبول کر لے گا جو خود میرزا کا تھا۔

۳۔ حاکم کے ساتھ تعلق کی بنا پر سمجھ لینا کہ فیصلہ ضرور اُن کے (میرزا کے) حق میں ہوگا اور مقابل کو سخت سزا ملے گی۔

یہ رجحانات امارت و ریاست کی اس فضا کے لوازم میں سے تھے جن میں میرزا غالب نے تربیت پائی تھی اگرچہ وہ بڑے منکسر اور فروتن تھے لیکن پہلی فضا اور ماحول کی تربیت کے اثرات سے کاملاً پاک نہ رہ سکے۔

۲۳ رجنوری کو حکم کے بعد مقدمہ بہ دستور اسسٹنٹ کمشنر ہی کی عدالت میں رہا لیکن چند روز بعد اس کی تبدیلی دوسری جگہ ہوگئی۔ لہٰذا اس نے ۳۰ رجنوری کو مقدمہ کی مثل پر حکم لکھوایا کہ آیندہ یہ مقدمہ ڈپٹی کمشنر کے روبرو پیش ہو۔ مسٹر او برائن نے ۵ رفروری کو مولوی امین الدین مدعا علیہ کے نام سمن جاری کیے۔ مولوی صاحب نے ۸ رفروری کو پیش ہو کر ایک عرضی دی۔

مقدمہ شروع ہو گیا:

۲۰ رفروری ۱۸۶۸ء کو پہلی پیشی شروع ہوئی جس میں فریقین حاضر ہُوئے۔ میرزا غالبؔ کے وکیل عزیز الدین کا بیان قلم بند ہُوا جس میں انھوں نے ''قاطع القاطع'' میں سے مزید موجبات ازالہ حیثیت پیش کیے۔ یہ بیان اُردو میں تھا، اسے سنا دیا گیا۔ مولوی امین الدین نے کوئی سوال نہ کیا۔

پھر صاحب نے حکم دیا کہ ''قاطع القاطع'' کے علاوہ جو کتابیں عدالت میں داخل کی گئی تھیں وہ سب واپس کر دی جائیں مدعی یعنی میرزا غالبؔ کا وکیل گواہوں کی فہرست پیش کرے۔

مولوی امین الدین نے درخواست دے کر مدعی کے تمام پیش کردہ الفاظ و عبارات کی نقل عدالت سے حاصل کی۔ انبہ سہائے مولوی صاحب کی طرف سے وکیل تھا، مدعا علیہ کو بھی گواہ پیش کرنے کا حکم دیا گیا۔

فریقین نے گواہیوں کی جو فہرستیں پیش کیں، وہ یہ تھیں:

میرزا کے گواہ:

۱۔ ماسٹر (بعد میں رائے بہادر) پیارے لال آشوب (شاگردِ غالب عم مصنف "خمخانہ جاوید") ولد رام نرائن ہیڈ ماسٹر نارمل اسکول، سیکرٹری دہلی لیٹریری سوسائٹی عمر تیس برس۔

۲۔ لطیف حسین ولد حکیم محمد حسین قوم شیخ فرسٹ اورینٹل ماسٹر دہلی کالجیٹ سکول ساکن کوچہ حکیم بقاء اللہ عمر پینتیس برس۔

۳۔ نصیر الدین ولد علیم الدین قوم سیّد ساکن کوچہ پنڈت عمر تینتیس برس مدرس فارسی وریاضیات دہلی نارمل اسکول۔

۴۔ حکیم چند ولد رام دیال قوم اہیر ساکن کھاری کوٹی عمر چھتیس برس (یہ مشہور مضمون نگار اور فارسی دان تھے)۔

۵۔ منشی سعادت علی خاں مدرس مدرسہ سرکاری (یہ وہی سعادت علی ہیں جن کا نام "تیغ تیز" کے سوالات کے جواب میں آتا ہے)۔

ان میں سے صرف پہلے چار آدمیوں نے گواہی دی۔ پانچویں کی گواہی نہ ہوئی۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہوئی کہ صاحب نے چار آدمیوں کی گواہی کو اثباتِ دعویٰ کے لیے کافی سمجھا یا خود میرزا غالب کے وکیل نے منشی سعادت علی کو پیش کرنا ضروری نہ سمجھا۔

مولوی امین الدین کے گواہ:

مولوی امین الدین کے گواہ یہ تھے:

۱۔ ضیاء الدین ولد محمد بخش اسسٹنٹ پروفیسر عربی مدرسہ سرکاری۔

۲۔ سدید الدین ولد رشید الدین قوم شیخ، ساکن گلی امام عمر تخمیناً ساٹھ برس (یہ ولیم میور کے استاد رہ چکے تھے اور عربی کے پروفیسر تھے) سابق پروفیسر عربی ہائی کالج دہلی۔

۳۔ حشمت اللہ خاں ولد غلام نقش بند خاں قوم مغل ساکن مٹیا محل، عمر بیالیس سال پیشہ حکمت۔

۴۔ حمید اللہ عرف عبد الحکیم ولد محمد عبد اللہ قوم سید، عمر اُنتالیس برس، ساکن کلاں محل دہلی پیشہ روزگار۔

۵۔ مولوی ابراہیم۔

۶۔ مولوی محمد حسین۔

۷۔ مولوی قمر الدین۔

ان میں سے آخری تین گواہ پیش نہ کیے گئے غالباً اس لیے کہ فریقین میں راضی نامہ کی بات

چیت شروع ہو گئی تھی۔

مولوی امین الدین کا بیان:

میرا خیال ہے کہ فروری کے اواخر میں مولوی امین الدین مدعا علیہ کا بیان ہُوا۔ مولوی صاحب نے بتایا کہ میرے والد کا نام زین الدین ہے۔ قوم شیخ اور پٹیالہ کا باشندہ ہُوں۔ انسٹھ برس کی عمر ہے اور مدرسی میرا پیشہ ہے۔

پھر کہا کہ میں نے علمی بحث کے سلسلے میں کتاب چھپوائی ہے۔ میرزا غالبؔ کی حیثیت عرفی کا ازالہ مقصود نہ تھا۔ اس کے ساتھ تمام اعتراض کردہ الفاظ کی توجیہ کی مثلاً:

۱۔ ’’زخم نہانی‘‘ سے مراد دلی رنج ہے۔

۲۔ ’’میان خون حیض غوطہ زد‘‘ کا مطلب یہ ہے کہ کیوں گناہ گار ہوتے ہو۔

۳۔ ’’کلال‘‘ کے معنی مست کے لیے ہیں۔

۴۔ ’’فصد باید کشاد تا جنونش فرو گردد‘‘۔ یہ الفاظ ایسے مقام پر کہے جاتے ہیں جب کوئی شخص بے جا اعتراض کرتا ہے۔

۵۔ خبطی کے معنی ہیں ’’برگشتہ مزاج‘‘۔

۶۔ ’’از خرابہ اکبر آباد بومے بہ دہلی رسیدہ است‘‘۔ بوم کے معنی زمین ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ زمین اکبر آباد سے ایک شخص آئے ہیں۔ اس پر سوال کیا گیا کہ خرابہ کا مضاف علیہ کون ہے۔ جواب ملا کہ ’’اکبر آباد بوم‘‘ چوں کہ بوم نہیں بومے لکھا تھا اس لیے کہا ’’ی‘‘ برائے تحسین ہے۔

۷۔ ’’بنی چہ گویم گوشش می برید‘‘ اسے اوپر کی عبارت سے ملا کر پڑھا جائے تو یہ معنی ہوتے ہیں کہ اگر حاکم اس تہمت کو دیکھتا تو سزا دیتا۔

۸۔ ازار کے معنی چادر کے ہیں اور میں نے یہی معنی لیے ہیں۔

۹۔ ’’خایہ‘‘ کے معنی بیضہ مرغ کے ہیں اور میری مراد یہی تھی۔

۱۰۔ ’’جستن خرس و رقص بوزنہ‘‘ سے مراد ہے کہ معترض نے بے کار باتیں کہی ہیں۔ ان توجیہات کا غلط اور بے بنیاد ہونا بالکل ظاہر ہے۔

مخالف گواہیوں کا اثر:

پھر گواہیاں شروع ہُوئیں۔ میرزا کے گواہ الفاظ کے فحش و ناسزا ہونے پر زور دیتے رہے۔ مولوی امین الدین کے گواہوں نے مدعا علیہ کے اختیار کردہ مسلک کی پیروی میں اس بات کا اہتمام کیا کہ تمام عبارتیں بے ضرر ثابت ہوں مثلاً:

مولوی ضیاء الدین نے ''خرِعیسیٰ'' کے متعلق کہا کہ ''خر'' اگرچہ بے وقوف کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن لفظ ''عیسیٰ'' سے عظمت و بزرگی ظاہر ہوتی ہے جیسے فرماں روائے رام پور کا نام ہے ''کلب علی خاں''، یعنی علی کا کُتا۔

ولیم فریزر کے قتل پر کسی نے کہا تھا:

چوں فریزر کمشنرِ دہلی   گشت مقتول از تفنگِ بلا
از فلک چارمیں ندا آمد   ''خرِ عیسیٰ'' نمود واویلا

غرض کسی لفظ کے معنوں میں کوئی نئی چیز نکال کر پیش کر دی۔ کسی فقرے کے متعلق کہہ دیا کہ اس میں صنعت ایہام رکھی گئی ہے۔

چوں کہ مولوی امین الدین کے گواہ علمی اعتبار سے زیادہ مستند و مشہور تھے، اس لیے ان کی گواہیوں کا اثر خاصا پڑا۔ وہ میرزا غالب کے مخالف نہ تھے لیکن انھیں یہ خیال ضرور ہو گیا تھا کہ اگر مولوی امین الدین کے خلاف ازالۂ حیثیت کا الزام ثابت ہو گیا تو انھیں سزا ملے گی۔ بس مولوی صاحب کو سزا سے بچانے کے لیے انھوں نے گواہیاں دینی منظور کیں۔

خواجہ حالی لکھتے ہیں کہ اِن حضرات سے میرزا کا ملنا جلنا تھا۔ کسی نے پوچھا کہ حضرت! انھوں نے آپ کے خلاف کیوں شہادت دی؟ میرزا نے اپنا یہ شعر جواب میں پڑھ دیا۔

بہ ہر چہ درنگری، جز بہ جنس مائل نیست   عیار بے کسیِ ما شرافتِ نسبی است

مولوی ضیاء الدین کا اعزاز:

جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں، میرزا کے دعویٰ کو ان گواہیوں ہی نے خاصا کمزور بنا دیا تھا اور خواجہ حالی کے بیان کے مطابق اغلب ہے، میرزا کو کام یابی کی امید نہ رہی ہو۔ اس دوران میں ایک

غیر معمولی واقعہ پیش آ گیا جس کی وجہ سے میرزا اور اُن کے حامیوں کو انصاف کی طرف سے بڑی حد تک مایوسی ہو گئی۔

مولوی ضیاء الدین بہ طور گواہ پیش ہُوئے تو غالباً محرر پیشی نے مجسٹریٹ کے کان میں کہہ دیا کہ مولوی صاحب بڑے صاحب اعزاز اور عالم ہیں اور گواہی لیتے وقت انھیں کرسی دینی چاہیے۔ ممکن ہے کہ محرر پیشی کو مولوی صاحب سے ذاتی تعلق ہو اور اس بنا پر ان کے غیر معمولی اعزاز کا خیال اسے آیا ہو۔ مجسٹریٹ نے جھٹ ایک کرسی منگا کر مولوی صاحب کو اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔

اس زمانہ میں دہلی سے ایک انگریزی اخبار ''مفصلائٹ'' کے نام سے نکلتا تھا۔ اس کے ایک مکتوب نگار نے جو یقیناً میرزا کے ملنے والوں سے ہو گا۔ ۱۲- مارچ ۱۸۶۸ء کی اشاعت میں لکھا۔

> ''سخت حیران و پریشان ہوں کہ مجسٹریٹ نے کس بنا پر مولوی ضیاء الدین کو کرسی دی؟ اس رعایت سے میرزا غالبؔ کے ساتھ بڑی بے انصافی ہُوئی ہے۔ وہ سوسائٹی میں بڑے معزز ہیں۔ گورنر کے دربار میں انھیں مولوی ضیاء الدین سے اوپر کے درجہ میں بٹھایا گیا تھا نیز ہندوستانی عدالتوں کے قوانین اور دستور کا مجھے علم ہے۔ کوئی گواہ کتنا ہی معزز ہو لیکن گواہی لیتے وقت اسے بیٹھنے کی اجازت کبھی نہیں دی گئی''۔

آخر میں مکتوب نگار نے لکھا:

میری تجویز یہ ہے کہ ''قاطع القاطع'' میں جو ہتک آمیز جملے اور فقرے آئے ہیں ان کے متعلق میجر لیز (Lees) یا کسی دوسرے یوروپی مستشرق کی رائے لے لینی چاہیے۔

راضی نامہ:

کچھ معلوم نہیں کہ اس تجویز پر غور ہوا یا نہیں ہوا۔ اس اثناء میں بعض مقامی رؤسا بیچ میں پڑ گئے اور انھوں نے فریقین میں راضی نامہ کرا دیا چناں چہ ۲۳/ مارچ ۱۸۶۸ء کو میرزا غالبؔ کی ہدایت کے مطابق ان کے وکیل نے مندرجہ ذیل درخواست مسٹر او برائن کی عدالت میں پیش کر دی:

جناب عالی!

جو کہ مجھ مدعی کا مقدمہ بنام مولوی امین الدین بابت ازالۂ حیثیت عرفی، حسب منشا دفعہ ۴۹۹

تعزیراتِ ہند دائر عدالت ہے چوں کہ بہ فہمائش چند گرامی رؤسائے شہر، باہم رضامندی ہوئی۔ اب مجھ کو کچھ دعویٰ بابت مقدمہ باقی نہیں۔ مقدمہ داخل دفتر ہووے“۔ او برائن نے اسی تاریخ کو حکم لکھوا دیا:

”مقدمہ خارج و کاغذ داخلِ دفتر“

اس طرح جو مقدمہ اوائل دسمبر ۱۸۶۷ء میں شروع ہوا تھا، وہ ۲۳- مارچ ۱۸۶۸ء کو راضی نامہ پر ختم ہو گیا۔

رضا قلی ہدایت کی شہادت:

”برہان قاطع“ کے متعلق رضا قلی ہدایت نے ”فرہنگ انجمن آرائے ناصری“ کے مقدمہ میں جو کچھ لکھا ہے، اتمامِ بحث کے لیے اس کا حوالہ دے دینا مناسب ہوگا۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

چہل پنجاہ سال ازیں پیش فرماں روائے ہندوستان جمعے از فضلائے ایران و ہندوستان و مسیحیان و زردشتیاں را ترتیب و جمع کردہ با کتب وافرہ و اسباب متکاثرہ بہ تصحیح لغات ”برہان قاطع“ مامور ساختہ بعد از رجوع بہ کتب معتبرۂ مختلف، تصحیح لغات ”برہان“ تنقیح یافتہ۔

پھر فرماتے ہیں کہ ”برہان قاطع“ میں جو لغات خالی از شواہد ہیں:

براں اعتبار ناشدہ و ہر یک از کنایات را لغت علیحدہ شمردہ و لغات غیر مستعمل دری بانی عربی و ترکی و ژند و مکررات لغت و تبدیلات تطویل لاطائل درمیان آوردہ و فقیر (رضا قلی ہدایت) تصدیق می کنم کہ حق با معترض است۔

اس کے بعد ہنگامے کے لیے کون سی وجہ جواز باقی رہ جاتی ہے جو میرزا غالبؔ کی ”قاطع برہان“ کے خلاف ہندوستان کے دعوے داروں نے بپا کیا تھا؟

صاحب ”مؤید برہان“ نے اپنی کتاب کے آخر میں بڑی تقریظیں اور تاریخیں درج کی تھیں۔ میرزا نے کیا خوب کہا تھا:

”غازیاں“ ہمراہ خویش آوردہ از بہر ”جہاد“
تا نہ پنداری کہ ایں پیکار تنہا کردہ است

(”علی گڑھ میگزین“ ۴۹-۱۹۴۸ء)

بیاضِ غالب کی دریافت

قدسی گہرم ہر کہ بسازد بہ من از مہر
باید کہ بنازد شرفِ ملّتِ ضم را
(غالبؔ)

میرزا غالبؔ کی صد سالہ برسی اس وسیع پیمانے پر منائی گئی کہ سرگزشت شعر و ادب میں اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ روئے زمین کا کوئی ملک، کوئی خطہ، کوئی قابلِ ذکر شہر اور قصبہ، کوئی علمی و ادبی ادارہ ایسا نہیں رہا، جس نے اس عالی منزلت اور بدیع الفکر شاعر و ادیب کی یاد میں کوئی مجلس منعقد نہ کی ہو۔ کلامِ میرزا کے ترجمے مختلف زبانوں میں ہوئے، اس کے اندازِ شعر گوئی کی پیروی شروع ہوگئی۔ فارسی اور اُردو کے علاوہ، جو میرزا کی زبانیں تھیں، دوسری زبانوں میں بھی بے شمار کتابیں چھپیں۔ ان سب کی تعداد کا صحیح اندازہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ رسالوں اور اخباروں نے صرف پاک و ہند میں جتنے خاص نمبر مرتب کیے، ان کا شمار ممکن نہیں۔ دورِ حاضر کے ترقی یافتہ وسائل نشر و اشاعت کے ذریعے سے جو کچھ ہوا، اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا تحصیل حاصل ہے۔ غرض اس سال کے لیل و نہار کا بیش تر حصہ میرزا ہی کے ذکر میں صرف ہوا۔ ان کے کمالِ فن سے دنیا بھر کے لیے شناسائی کا موقع بہم پہنچا۔ اُردو اور فارسی کے وقار و ہر دل عزیزی کو تقویت پہنچی۔ کرۂ ارض کا شاید ہی کوئی حصہ ہو جس کے ادبی ایوان میرزا کے ذکر کی گونج سے نا آشنا رہے ہوں۔ روسیوں نے ایک خاص وضع کا نیا اور نہایت خوبصورت پھول پیدا کر کے اس کا نام ”میرزا غالب“ رکھ دیا۔ وہ پھول اسی نام سے خیابانوں اور چمن زاروں میں نگاہوں کے لیے طراوت اور دل و دماغ کے لیے فرحت و شمیم انگیزی کا سر و سامان مہیا کرتا رہے گا۔

ہمارے ہمسایے ملک کے متعلق کہا گیا کہ اس نے اُردو سے اچھا سلوک نہ کیا حالاں کہ یہ زبان اسی کے دامن میں پیدا ہوئی، پھولی پھلی اور معراجِ کمال پر پہنچی تھی اور یہ مختلف اللسان طبقات کی یکجائی کا

ایک زندہ جاوید نشان تھی، جنھیں احوالِ روزگار نے ایک سرزمین میں جمع کر دیا تھا۔ یہ درست ہے لیکن آپ نے میرزا غالب کی عظمت و شوکت اور شان و شکوہ کی ندرت کاریاں دیکھیں؟ اس ملک میں میرزا کی برسی اس والہیت سے منائی گئی کہ شاید ہی کوئی ملک اس پر تفوق و برتری کا دعویٰ کر سکے!

سب سے آخر میں یہ کہ یہ سال میرزا سے متعلق بعض نوادر کی دریافت اور تہذیب و طباعت کے اعتبار سے بھی بڑا ہی بابرکت اور ثروت مند ثابت ہوا۔

آپ دیکھتے ہیں کہ برسات میں زمین سیراب و شاداب ہوتی ہے تو اپنے اندر کی پوری استعداد نمو اچھال کر سطح پر پھینک دیتی ہے اور دامنِ خاک سراسر ’’روکش سطح چرخ مینائی‘‘ بن جاتا ہے۔ میرزا غالبؔ تو برسات ہی کو ہندوستان کی بہار کہا کرتے تھے:

بہارِ ہند برد برشکال، ہاں غالبؔ
دریں خزاں کدہ ہم موسمِ شرابے، مست

فصلِ بہار کا ورود درختوں اور پودوں کے لیے نشاطِ تازہ کا پیغام ہوتا ہے۔ ان کی رگوں میں زندگی کا افسردہ اور پژمردہ مادہ یکا یک جاگ اٹھتا ہے بل کہ شوقِ نمود میں کھولنے اور جوش مارنے لگتا ہے:

در شاخ بود موج گل از جوش بہاراں
چوں بادہ بہ مینا کہ نہان است و نہاں نیست

معلوم ہوتا ہے کہ صد سالہ برسی کے سال کی ایسی ہی کوئی پُراسرار کشش اور ایسا ہی کوئی ناشناسا جاذبہ یہ نادر ادبی خزانے منظرِ عام پر لے آیا۔ ان میں سب سے زیادہ بیش قیمت اور بے بہا گنجینہ، جسے گنجِ شایگاں کہنا چاہیے، وہ ہے جس کی تقریبِ افتتاح آج ہم سب کو یہاں لائی ہے۔

باد بُرد آں گنجِ باد آورد و غالبؔ راہنوز
دیدۂ الماس پاش و چشم گوہر بار ہست

اس سال کا قافلۂ شوق گیارھویں منزلیں طے کر کے بارھویں میں قدم رکھ چکا ہے۔ جو اس کی آخری منزل ہے، اب ایسی کسی اور دریافت کے لیے دامنِ امید پھیلانے کی کون سی گنجایش باقی رہ گئی ہے؟

میرزا نے زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں، جب گم نامی کی تاریکی ان کے گردوپیش پر مسلّط تھی کہا تھا:

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

بہ ظاہر یہ شاعرانہ ادعا تھا اور کون سا شاعر ہے، جس کی زبان پر ایسے ادعا جاری نہ رہے؟ پھر میرزا نے حیاتِ مستعار کے آخری دور میں فرمایا تھا:

کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

یہ بھی محض ایک تعلّی اور اپنے دل کے لیے طفل تسلّی ہی سمجھی جاتی رہی۔

تاہم ایک سو سال کے اندر اندر دنیا پر آشکارا ہوگیا کہ یہ خالی اور خیالی دعوے نہ تھے۔ محض فکری تعلّیاں نہ تھیں۔ یہ پیش گوئیاں تھیں، جن کا مشاہدہ عملی شکل میں آج ہر جگہ کیا جاسکتا ہے اور ان کی تصدیق کے وثیقے صحیفۂ روزگار کے اوراق پر ایسے زریں حروف میں ثبت ہوچکے ہیں، جن کی درخشانی، ان شاءاللہ رہتی دنیا تک روزافزوں رہے گی:

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق   ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

(حافظؒ)

عالمی شاعروں کا ذکر جہاں بھی چھڑے گا۔ ان کی فہرست کتنی ہی محدود رہے، تاہم میرزا کا نام ان میں ضرور شامل ہوگا، جو نسلاً ترکستانی، مولداً اکبر آبادی، موطناً دہلوی اور بہ اعتبارِ کمالِ فن عالمی تھے۔ دیکھیے قدرت اربابِ کمال کو مختلف انتسابات سے نکالتی ہوئی کس طرح اس مقامِ بلند پر پہنچا دیتی ہے، جہاں محدود انتسابات کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ جہاں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کوئی کہاں کا ہے؟ کس نسل اور کس خاندان سے ہے؟ اس نے کہاں تربیت حاصل کی؟ کہاں زندگی گزاری؟ صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کے فطری جوہروں اور کمال ہنرمندی کا درجہ، مرتبہ اور کیفیت کیا ہے؟

گر تنزل نبود ابر بہاری غالبؔ
کہ دُر افشانی وز افشاندہ شمارے نہ دہی

جس نسخۂ نادرہ کا افتتاح ہمیں یہاں لایا ہے، اس کی تفصیلات میں جانے کا یہ موقع نہیں لیکن انتہائی تعجب کا مقام ہے کہ یہ نسخہ بھی بھوپال پہنچا۔ جہاں اس سے پہلے یا بعد وہ نسخہ پہنچ چکا تھا، جو اب ‘‘نسخۂ حمیدیہ’’ کہلاتا ہے۔ ‘‘نسخۂ حمیدیہ’’ ۱۹۲۱ء میں چھپ کر شائع ہو گیا لیکن یہ نسخہ، جس نے ‘‘نسخۂ امروہہ’’ کے نام سے شہرت پائی، بہ دستور گوشۂ خمول میں پڑا رہا۔

اس سے بھی بڑھ کر تعجب اس امر پر ہے کہ جس شخص کے پاس یہ نسخہ موجود تھا، وہ اس کی حقیقی حیثیت اور قدر و قیمت سے کاملاً نا آشنا رہا حالاں کہ جانتا تھا، یہ میرزا غالبؔ کا لکھا ہوا ہے، اس نے صرف پچیس روپے قیمت بتائی اور گیارہ روپے میں اسے فروخت کر دیا۔ جس نے اسے خریدا، وہ زیادہ ہوش مند تھا۔ اس نے چند ہی گھنٹے بعد دہلی پہنچ کر اس کی دریافت کا اعلان کیا تو قیمت کم از کم چھ ہزار روپے مقرر کی۔ گویا جو نسخہ پہلے مالک کے نزدیک محض پتھر کا ایک ٹکڑا تھا، وہ دوسرے مالک کے ہاتھوں میں پہنچتے ہی ‘‘کوہِ نور’’ بن گیا کیوں کہ وہ جوہری تھا یا جوہری ثابت ہوا۔

پھر تعجب کا آخری مرحلہ پیش آیا جس کے سامنے پہلے دونوں مرحلے بے حقیقت رہ گئے۔ جب اس نسخے کی دریافت کا اعلان ہوا تھا، اِس کی اشاعت کے لیے ہماری نگاہیں ہندوستان پر جمی ہوئی تھیں۔ انتظار میں تھے کہ دیکھیں یہ کب چھپے؟ کہاں چھپے؟ کون چھاپے؟ پھر اس کی زیارت سے کیوں کر شرف اندوز ہوں؟ کیوں کہ پاک و ہند کے تعلقات میں جو گرہیں پڑی ہوئی ہیں، ان کے پیشِ نظر ایک ملک میں کسی کتاب کا چھپ جانا ہی کافی نہیں۔ دوسرے ملک میں رہنے والوں کے لیے اس کا حصول بھی ہفت خوان رستم سے کم نہیں حالاں کہ اس مدت میں ہمارے عزیز دوست محمد طفیل صاحب مدیر ‘‘نقوش’’ نہایت اطمینان و دل جمعی سے بیٹھے ہوئے انتہائی اہتمام کے ساتھ اسے چھاپ رہے تھے۔

میرزا غالبؔ کا ایک مشہور شعر ہے:

سادہ پُرکار ہیں خوباں غالبؔ
ہم سے پیمان وفا باندھتے ہیں

ہمارے دوست محمد طفیل صاحب جو کبھی کبھی ایڈیٹری کی سرمستی میں اپنے آپ کو ‘‘محمد نقوش’’ بھی

کہتے رہتے ہیں، انھی اوصاف سے مُزین ہیں، جو میرزا کے نزدیک حسینوں سے مختص تھے۔ یعنی سادگی اور پُرکاری۔ پھر ان وصفوں میں انہوں نے بہ ظاہر کسی مشق کے بغیر ایسا کمال بہم پہنچالیا ہے، جو حسینوں کو فطری بخششوں اور عطیوں کے بعد عمر بھر کی ریاضت سے بھی شاید ہی حاصل ہوا ہو۔

اتنی بڑی دولت ان کے قبضے میں تھی مگر صاحب! ان کے ضبط و ہضم کی داد کے لیے الفاظ مساعدت نہیں کرتے بھنک تک سنائی نہ دی۔ لبوں پر مہرِ سکوت، دل و دماغ اور کام و زبان پر پورا قابو۔ اس کاروبار پر دبیز پردۂ خفا میں بھی اپنے آپ کو ان کے نیازمندوں یا بہ اعتبارِ عمر دعا گوؤں میں سمجھتا تھا اور اہلِ علم میں سے نہ سہی مگر مولانا شبلی مرحوم کے قول کے مطابق ہے۔

دوستاں تہمتِ ایں شیوہ بہ مانیز کنند

میں تو کلام نہ تھا۔ ایک روز یکا یک اخبار میں پڑھا کہ راولپنڈی میں اس نسخے کی طباعت پر ایک تقریب منائی گئی۔ یقین رکھیے کہ یقین نہ آیا کہ یہ وہی نسخۂ نادرہ ہوگا، جس کے انتظار میں نگاہ شوق ہمسایے ملک پر جمی ہوئی تھک کر لڑکھڑانے لگی تھی۔ تاہم آج یہ سب کچھ اسی طرح ہمارے سامنے حقیقتِ ثابتہ کی صورت میں پیش ہے، جس طرح اپنے متعلق میرزا غالبؔ کے پیش گو یانہ تصورات و تاثرات حقیقتِ ثابتہ بن چکے ہیں۔

میرا احساس یہ ہے کہ یہ میرزا غالب کے متعلق آخری بڑی دریافت ہے کیوں کہ بہ ظاہر یہ میرزا کے مستند اُردو کلام کا پہلا مجموعہ ہے، جس کے بعد وہ فارسی کی طرف متوجہ ہو گئے اور اُردو میں گنتی کی نئی غزلوں کے سوا کچھ نہ کہہ سکے۔ البتہ کہے ہوئے کلام میں جزوی ترمیمیں ضرور کرتے رہے یا ممکن ہے انہوں نے کہیں کہیں چند شعروں کا اضافہ کر دیا ہو۔ یہی نسخہ ”نسخۂ حمیدیہ“ کی اصل واساس بنا۔ اسی میں تھوڑا سا اضافہ ہوا تو وہ نسخۂ شیرانی کہلایا۔ پھر خاصی لمبی مدت تک وہ اپنے آپ کو اُردو کے بجائے فارسی ہی کا شاعر سمجھتے رہے۔ یہاں تک کہ بادشاہ کے دربار سے وابستگی کے بعد اُردو اشعار کہے۔

اس نسخے کی تاریخِ کتابت کا معاملہ میرے نزدیک مزید غور و فکر کا محتاج ہے۔ میرزا نے اختتامی تحریر میں صرف تاریخ، مہینہ اور دن بتایا، یعنی رجب کی چودھویں تاریخ اور سہ شنبہ، سال نہ لکھا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ تاریخ، مہینے اور دن کی بنا پر ۱۲۳۱ھ کا سال کیوں کر متعین کر لیا گیا؟ اس حقیقت کے اعادے کی ضرورت نہیں کہ رجب کے مہینے میں چودھویں تاریخ کو منگل اسی صورت میں آئے گا

کہ اس مہینے کا آغاز چہار شنبہ یعنی بدھ سے ہو۔ ۱۲۳۱ھ میں رجب کا آغاز سہ شنبہ یعنی منگل سے ہوتا ہے اور ۱۴ رجب کو چہار شنبہ یعنی بدھ نکلتا ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ اگر رجب سے پیش تر کے مہینے یعنی جمادی الاخری کو تیس دن کے بجائے انتیس دن کا مان لیا جائے تو ۱۴ رجب کو سہ شنبہ یعنی منگل ہوگا۔

عجیب امر یہ ہے کہ مروجہ تقویم میں جمادی الاخریٰ کو انتیس ہی کا مان کر رجب کا آغاز سہ شنبہ سے کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ دلیل تو کارآمد معلوم نہیں ہوتی۔ نیز پیشِ نظر حساب میں ایک دن گھٹا لینے سے پورے حساب میں اس دن کا وجود ختم نہیں ہو جائے گا۔ جمادی الاخری میں ایک دن گھٹایا جائے گا تو وہ جمادی الاولیٰ میں بڑھ جائے گا اور معاملہ بہ ہر حال وہیں رہے گا جہاں تھا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ مروجہ تقویم کو پیشِ نظر مقصد کے لیے ساقط الاعتبار قرار دے لیا جائے۔

میں نے خود چھان بین میں کچھ وقت صرف کیا تو معلوم ہوا کہ ۱۲۴۳ھ (جولائی ۱۸۲۷ء) سے پیش تر رجب کے صرف دو مہینے ایسے ہیں جن کا آغاز چہار شنبہ سے ہوا:

۱۔ رجب ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۳ء) جب میرزا غالبؔ کی عمر سولہ سال کی تھی۔
۲۔ رجب ۱۲۳۶ھ (یہ سال ۹-اکتوبر ۱۸۲۰ء سے شروع ہوا) جب میرزا زندگی کے چوبیس مرحلے طے کر چکے تھے۔

سولہ برس کی عمر تک میرزا کے پاس ایسے اُردو اشعار کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع نہ ہوا ہوگا کیوں کہ ان کے جو شعر محفوظ رہے اور مستند مانے جاتے ہیں، ان کی ابتدا پندرہ برس کی عمر سے ہوئی۔ لہٰذا تسلیم کر لینا چاہیے کہ زیرِ غور نسخۂ نادرہ کی تکمیل تحریر ۱۴ رجب ۱۲۳۶ھ کو بروز شنبہ ہوئی یعنی ۱۷-اپریل ۱۸۲۱ء کو، جب تک کوئی دوسرا مستند ثبوت بروئے کار نہ آئے۔ میرے نزدیک یہی تاریخ صحیح ہے۔

اصل نسخے کے حاشیے پر ایک جگہ میرزا غالبؔ نے لعل خاں نام کسی شخص کو ملازم رکھنے کی یادداشت لکھی ہے اور وہ تحریر صفر ۱۲۳۵ھ کی ہے۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ لعل خاں کو ملازم رکھنے کے وقت تک یہ نسخہ زیرِ تحریر تھا اور بالآخر یہ ۱۴ رجب ۱۲۳۶ھ کو مکمل ہوا۔

نزاعی مسائل چھیڑنے کا یہ محل نہیں لیکن تعجب ہوتا ہے کہ اب بھی سنجیدہ مذاق کے علم دوست اصحاب میرزا غالب اور میر تقی مرحوم والے قصے کو حقیقت سمجھتے ہیں!

میر تقی مرحوم کا انتقال ۲۰ شعبان ۱۲۲۵ھ (۲۰ ستمبر ۱۸۱۰ء) کو ہوا۔ اس وقت میرزا غالب کی عمر تیرہ سال ایک مہینے اور بارہ دن کی تھی۔ میر تقی مرحوم آخری دور میں بہت بیمار رہے۔ عام روایت کو درست فرض کیا

جائے تو میرزا کا جو کلام میر کے سامنے پیش کیا گیا ہوگا، وہ بارہ ساڑھے بارہ برس ہی کی عمر میں کہا گیا ہوگا۔

میرزا غالبؔ بڑے بلند پایہ شاعر تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بارہ سال کی عمر میں ایسے شعر کہتے تھے جیسے پیشِ نظر مجموعے میں ہیں۔ انھوں نے فارسی کی ابتدائی کتابیں ضرور پڑھ لی ہوں گی لیکن میرزا بیدلؔ کا کلام تو وہ سمجھنے کے قابل بھی نہ ہوئے ہوں گے چہ جائے کہ اس پیروی میں اُردو شعر کہتے۔ اس زمانے میں ایسے شعر کہتے ہوں گے:

ایک دن مثلِ پتنگ کاغذی
لے کے دل سررشتۂ آزادگی

وغیرہ ایسا کلام نہ میر تقی کے سامنے پیش ہو سکتا تھا، نہ وہ ویسی رائے ظاہر کر سکتے تھے، جیسی ان سے منسوب ہے۔ پھر اصل رائے حد درجہ تعجب انگیز ہے، جس کے کسی بھی حصے کو میر تقی کی مسلّمہ عظمت سے کوئی مناسبت نہیں۔ فرماتے ہیں:

اگر اس لڑکے کو کوئی استادِ کامل مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا، ورنہ مہمل بکے گا۔

اب غور فرمائیے:

۱۔ یہ رائے شاعری میں استادی شاگردی کے عام سلسلے کو مسلّم مان کر پیش کی گئی ہے حالاں کہ وہ غیر مسلّم ہے۔ مثلاً میرزا غالبؔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ اقبال کی اصل شاعری میں ان کا کوئی استاد نہ تھا۔ میرزا داغ کی شاگردی کے زمانے کی غزلیات میں سے شاید کوئی بھی اقبال کے مستند کلام میں شامل نہیں۔

۲۔ غالبؔ کو کوئی کامل یا غیر کامل استاد نہ ملا، جو اسے سیدھے راستے پر ڈال دیتا۔ فطرت نے خود اس کی رہنمائی کی۔

۳۔ معلوم ہے کہ غالبؔ لاجواب شاعر بن گیا اور مہمل نہ بکتا رہا حالاں کہ میرزا کو سیدھے راستے پر ڈال دینے والے کسی استاد کا سراغ آج تک نہیں مل سکا۔ اس سے میر تقی مرحوم کی شعری بصیرت اور حقیقت شناسی کے کون سے پہلو کو تقویت پہنچتی ہے؟ ہاں کوئی شخص روایات کو مسلّم مان کر توجیہات میں پڑا رہنا گوارا سمجھ لے اگرچہ وہ توجیہات بارِدہ ہوں تو ظاہر ہے کہ اس کا کوئی

علاج نہیں اس نادر نسخے کے ساتھ طفیل صاحب نے بعض اور نوادر بھی شامل کر دیے ہیں مثلاً مولانا عباس بھوپالی کے نام میرزا کے دو غیر مطبوعہ فارسی خط، بعض اور مکاتیب کے عکس، غالبؔ کے سات فارسی خط بنام تفضل حسین خان مع تصریحات و ترجمہ و عکس، یہ فاضل مکرم سید وزیر الحسن صاحب عابدی کے مرتبہ ہیں۔ جن کے ابر فیض سے جتنی زیادہ سعی کرم کی آرزو رہتی ہے، وہ پوری نہیں ہوتی یعنی ہماری تشنگی اور تفتہ لبی پر انھیں ترس نہیں آتا۔ ’’گل رعنا‘‘ کے بعض اوراق کے عکس۔

البتہ یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اصل نسخے میں انتہائی اہتمام کے باوجود غلطیاں رہ گئی ہیں۔ جن کا ذکر یہاں نہیں کروں گا یہاں تک کہ ’’ابو المعانی‘‘ بیدل کو الوالمعالی بنا دیا گیا ہے۔

اس نسخے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ۱۸۲۱ء تک میرزا غالبؔ پر بیدلؔ کا اثر بہت زیادہ تھا، شاید ایک دو سال اور بھی رہا ہو لیکن جب انھوں نے فارسی اختیار کر لی تو یہ اثر جلد زائل ہو گیا۔

اس تبدیلی کا ذکر مولانا شبلی مرحوم نے بھی ’’شعر العجم‘‘ میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ایرانی شاعری میں قاآنی نے انقلاب پیدا کیا، ساتھ ہی ہندوستان کی فارسی شاعری میں بھی انقلاب آیا۔

شاعری کا جو مذاق ناصر علی وغیرہ کی بہ دولت سیکڑوں برس سے بگڑا چلا آتا تھا، درست ہو چلا میرزا غالب نے شاعری کا انداز بالکل بدل دیا۔ ابتدا میں وہ بھی بیدلؔ کی پیروی کی وجہ سے غلط راستے پر پڑ گئے تھے لیکن عرفیؔ، طالبؔ آملی، نظیریؔ اور کلیمؔ کی پیروی نے انھیں سنبھالا...... میرزا غالبؔ کی طبیعت میں نہایت شدت سے اجتہاد اور جدت کا مادہ تھا اگرچہ قدما کی پیروی کی وجہ سے نہایت احتیاط کرتے ہیں۔ تاہم اپنا خاص انداز بھی نہیں چھوڑتے۔

پھر چند مثالیں دی ہیں۔

آخر میں اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ میرزا غالبؔ کے اس کلام میں بھی جو زیادہ سے زیادہ چوبیس برس کی عمر تک کا ہے۔ اُردو کے بہت سے شعر موجود ہیں جن کی مثالیں ہماری غزلیہ شاعری میں بہت کم ملیں گی مثلاً:

غافل بہ وہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طرہ گیاہ کا

۱۔ ’’نقوش‘‘ لاہور۔ جولائی ۱۹۷۰ء۔
۲۔ ’’نقوش‘‘ لاہور۔ (غالب نمبر ۳) ۱۹۷۱ء۔

جنگ آزادی کی کہانی

(غالبؔ کے مکاتیب میں)

سرزمین پاک و ہند میں انگریزوں کی حکمرانی کا سنگِ بنیاد پلاسی کے میدان میں رکھا گیا بعدازاں قریباً نوّے برس میں یہ اجنبی حکومت پورے ملک پر مسلط ہوگئی اور مزید سو برس تک عنانِ فرماں روائی اسی کے ہاتھ میں رہی۔ اس عہد کا ایک نہایت اہم واقعہ ۱۸۵۷ء کا وہ ہنگامۂ خونیں تھا جسے اہل وطن ابتداء ہی سے ”جنگ آزادی“ قرار دیتے رہے لیکن خود انگریزوں نے اسے غدر کا نام دیا۔ یہی نام مدّت تک تاریخ کی درسی کتابوں میں استعمال ہوتا رہا۔

میرزا غالبؔ نے اپنی فارسی اور اُردو تصانیف نظم ونثر میں اس واقعے پر جو کچھ لکھا اگر اسے الگ کتاب کی شکل میں مرتب کیا جائے تو یقین ہے کہ ایک ضخیم مجلّد تیار ہوجائے۔ فارسی نثر کی ایک کتاب جس کا نام ”دستنبو“ ہے صرف اسی واقعہ سے متعلق ہے لیکن میں آج جو نقشہ آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں وہ محض میرزاؔ کے مکاتیب سے جستہ جستہ اقتباسات لے کر تیار کیا گیا ہے۔

تمہید کے طور پر عرض کردینا چاہیے کہ اس ہنگامہ کا آغاز ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو پیر کے دن ہوا تھا۔ چار مہینے اور چار دن انگریز شہر سے بے دخل رہے۔ ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو وہ دوبارہ دہلی میں داخل ہُوئے۔ ۱۸ ستمبر کو شہر مکمل طور پر ان کے قبضے میں آ گیا۔ میرزاؔ اس پوری مدّت میں شاذ ہی گھر سے باہر نکلے۔ ان کا مکان بلّی ماراں میں تھا جہاں شریف خانی حکیموں کے مکانات تھے۔ اس خاندان کے بعض افراد سرکار پٹیالہ میں ملازم تھے۔ جب انگریزی فوج دوبارہ دہلی میں داخل ہوئی تو اہلِ شہر گھر بار چھوڑ کر دہلی دروازے، ترکمان دروازے اور اجمیری دروازے سے باہر نکل گئے۔ بلّی ماراں کے دروازے پر والیِ پٹیالہ نے شریف خانی خاندان کی حفاظت کے لیے اپنا پہرہ بٹھا دیا تھا۔ اس طرح میرزاؔ کی حفاظت کا بندوبست ہوگیا اور انھیں گھر بار چھوڑ کر باہر نہ نکلنا پڑا۔

میرزاؔ کے مکاتیب میں اس واقعے کے متعلق سب سے پہلی تحریر نومبر ۱۸۵۷ء کی ہے جب کہ

انگریز شہر پر قابض ہو چکے تھے۔ حکیم غلام نجف کو لکھتے ہیں:

> ''میاں! حقیقت حال اس سے زیادہ نہیں کہ اب تک جیتا ہوں، بھاگ نہیں گیا۔ نکالا نہیں گیا۔ لٹا نہیں۔ کسی محکمے میں اب تک بلایا نہیں گیا۔ معرض باز پرس میں نہیں آیا۔ آیندہ دیکھیے کیا ہوتا ہے''۔

> ''جو دم ہے غنیمت ہے۔ اس وقت تک مع عیال و اطفال جیتا ہوں۔ بعد گھڑی بھر کے کیا ہو؟ کچھ معلوم نہیں۔ قلم ہاتھ میں لینے پر بہت کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے مگر لکھ نہیں سکتا اگر مل بیٹھنا قسمت ہے کہہ لیں گے ورنہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ''۔

یہ اگرچہ چند فقرے ہیں جن میں کچھ نہیں لکھا گیا لیکن لفظ لفظ بتا رہا ہے کہ اس وقت حالات کتنے نازک تھے اور بے یقینی کس پیمانے پر پہنچی ہوئی تھی۔

یہ ہنگامہ درحقیقت ایک خوف ناک زلزلہ تھا جس نے سب کچھ تہ و بالا کر ڈالا۔ جس ماحول میں میرزا نے اپنی زندگی کے ساٹھ برس گزارے تھے اس کی بساط لپیٹی جا چکی تھی اور اس کی جگہ بالکل نیا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ میرزا کے دل پر اس وسیع اور ہمہ گیر انقلاب کا اتنا گہرا اثر تھا کہ وہ ۱۸۵۷ء سے پیش تر کے دور اور بعد کے دور کو الگ الگ عالم سمجھنے لگے تھے یا کہنا چاہیے کہ ہندوؤں کے طریق تعبیر کے مطابق ان کے نزدیک ایک جنم ختم ہو گیا تھا اور دوسرا جنم وجود میں آ گیا تھا۔ اپنے عزیز ہندو شاگرد ہرگوپال تفتہ کو تحریر فرماتے ہیں:

> ''صاحب! تم جانتے ہو کہ یہ کیا معاملہ ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں، تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے۔ دیوان جمع کیے۔ اس زمانے میں ایک بزرگ تھے اور ہمارے تمھارے دلی دوست تھے۔ منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر ان کا تخلص۔ نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط نہ وہ انبساط، بعد چند مدّت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے یعنی ایک خط میں نے منشی صاحب کو بھیجا۔ اس کا جواب آیا ایک خط تمھارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو، آیا اور میں جس شہر میں رہتا ہوں اس کا نام دلّی اور اس محلے کا نام بلّی ماروں کا محلہ لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں سے نہیں پایا جاتا''۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ انگریزی فوج کے داخلے کے ساتھ ہی اہلِ شہر باہر نکل گئے تھے اور پورا شہر بے چراغ ہو چکا تھا۔ انگریزوں نے اس کے بعد عام دار و گیر کا سلسلہ شروع کر دیا۔ میرزا فرماتے ہیں:

''مبالغہ نہ جاننا۔ امیر غریب سب نکل گئے جو رہ گئے وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنسن دار، دولت مند، اہلِ حرفہ کوئی بھی نہیں مفصل لکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ملازمانِ قلعہ پر شدّت ہے۔ بازپرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں''۔

پھر فرماتے ہیں:

''اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے۔ شہر میں ہے کون، جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پائے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست (یعنی مارشل لاء) یاز دہم مئی سے آج تک یعنی پنج شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بہ دستور ہے، کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم''۔

میرزا کے ایک شاگرد منشی شیو نرائن آرام نے آگرے سے ایک اخبار جاری کیا تھا۔ میرزا سے استدعا کی کہ اس کے لیے خریدار بہم پہنچایئے۔ جواب میں فرماتے ہیں:

''یہاں آدمی کہاں ہیں کہ اخبار کے خریدار ہوں۔ مہاجن لوگ جو یہاں بستے ہیں وہ یہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہیں۔ بہت سخی ہوں گے تو جنس پوری تول دیں گے۔ کاغذ (یعنی اخبار) روپے مہینے کا کیوں مول لیں گے؟

میر مہدی مجروح نے اس زمانے میں ایک غزل بھیجی جس کے مقطع کا آخری مصرع یہ تھا:

''میاں یہ اہلِ دہلی کی زباں ہے''

اس مصرع نے میرزا کے سازِ درد کا ہر تار ہلا دیا۔ فرماتے ہیں:

''اے میر مہدی! تجھے شرم نہیں آتی؟ ''میاں یہ اہلِ دہلی کی زباں ہے''۔ ارے اب اہلِ دہلی ہندو ہیں یا اہلِ حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں، ان میں سے تو کس کی تعریف کرتا ہے؟ اے بندۂ خدا! اُردو بازار نہ رہا، اُردو کہاں؟ دلّی کہاں؟ واللہ اب شہر نہیں ہے۔ کیمپ ہے۔ چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر۔ نہ بازار نہ نہر''۔

نواب علاء الدین خاں کو لکھتے ہیں:

> ''میری جان! یہ وہ دلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے...... ایک کیمپ ہے مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنود''۔

جنگ آزادی میں اگرچہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے یکساں حصہ لیا تھا لیکن انگریزوں کی نظروں میں اصل مجرم صرف مسلمان تھے چناں چہ وہی زیادہ تر دارو گیر کے ہدف بنے انھیں کو بالعموم پھانسیاں ملیں انھیں کی جایدادیں ضبط ہُوئیں شہر سے باہر نکلنے میں بھی ہندو اور مسلمان برابر تھے لیکن ہندوؤں کو بہت جلد گھروں میں آباد ہونے کی اجازت مِل گئی۔ مسلمان بہ دستور باہر پڑے رہے یا جن کو کسی دُوسرے شہر میں ٹھکانا نظر آیا وہاں چلے گئے۔ میرزا لکھتے ہیں:

> ''واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا کیا امیر کیا غریب کیا اہلِ حرفہ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں، ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں''۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

> ''ابھی دیکھا چاہیے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں؟''

مدت تک مسلمانوں کو شہر میں آباد ہونے کا حکم نہ ملا تو ان میں سے بعض نے شہر کے باہر ہی جگہ جگہ عارضی مکان بنانے شروع کر دیے، اس پر حکم ہُوا کہ سب مکان ڈھا دیے جائیں اور اعلان کر دیا جائے کہ آیندہ کوئی مکان نہ بنائے۔ میرزا لکھتے ہیں:

> ''کل سے یہ حکم نکلا ہے کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان وکان کیوں بناتے ہیں جو مکان بن چکے ہیں انھیں گرادو اور آیندہ کو ممانعت کا حکم سُنا دو...... آج تک یہ صورت ہے، دیکھیے شہر کے بسنے کی کون سی مہورت ہے جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کیے جاتے ہیں یا جو باہر پڑے ہیں وہ شہر میں آئے ہیں۔ اَلملک للہ والحکم للہ۔

جنگ آزادی سے کم و بیش دو برس بعد حکم ہُوا کہ کرایہ دار بھی آ جائیں لیکن کرایہ مالکان مکان کو نہیں سرکار کو ادا کریں۔ میرزا ۹ نومبر ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں فرماتے ہیں:

> ''آگے حکم تھا کہ مالکان مکان رہیں کرایہ دار نہ رہیں۔ پرسوں سے حکم ہو گیا کہ کرایہ دار بھی رہیں لیکن یہ نہ سمجھنا تم یا میں یا کوئی اور اپنے مکان میں کرایہ دار کو آباد کرے۔ وہ لوگ جو گھر کا نشان نہیں رکھتے اور ہمیشہ کرایہ کے مکانوں میں رہتے تھے،

وہ بھی آ رہیں مگر کرایہ سرکار کو ادا کریں’’۔

ابتدا میں کوئی شخص اجازت کے بغیر شہر میں نہیں آ سکتا تھا جو چھپ چھپا کر آ جاتا اس کے پانچ بید لگتے یا دو روپے جرمانہ لیا جاتا اور آٹھ دن قید میں رہتا پھر ٹکٹ چھاپے گئے اور اعلان ہو گیا کہ جو مسلمان شہر میں آباد ہونا چاہے وہ ٹکٹ خریدے اور اپنی حیثیت کے مطابق جرمانہ داخل کرے چناں چہ ٹکٹ پر یہ عبارت درج کر دی گئی تھی ’’ٹکٹ آبادی درون شہر بہ شرط ادخال جرمانہ‘‘ جرمانے یا نذرانے کی رقم حاکم کی رائے پر موقوف تھی جتنی رقم وہ مقرر کر دیتا ادا کرنی پڑتی تھی۔

میرزا کے نہایت عزیز دوستوں میں سے مولانا فضل حق خیر آبادی پر مقدمہ چلا۔ کالے پانی بھیجے گئے اور وہیں ۱۹/اگست ۱۸۶۱ء کو فوت ہوئے۔ مفتی صدر الدین آزردہ کی ساری جائیداد ضبط ہو گئی۔ خاصی تگ و دو کے بعد انھیں کچھ جایداد ملی جس سے ماہانہ چالیس روپے کرایہ وصول ہوتا تھا اس میں گزارا کرتے رہے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ پر مقدمہ بنا، سات برس قید کی سزا پائی اور جایداد ضبط ہو گئی، اپیل میں وہ بری ہوئے۔ مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں الور چلے گئے تھے وہاں سے پکڑے آئے۔ گوڑگانوہ میں دوسرے اسیروں کے ساتھ انھیں بھی گولی سے شہید کر ڈالا گیا۔ ان کے چھوٹے بھائی ذوالفقار الدین حیدر خاں گرفتار ہوئے ان پر مقدمہ چلا جایداد ضبط ہو گئی۔ محل سرا اور کوٹھی پر گوروں نے قبضہ کر لیا۔ دکانیں ڈھا دی گئیں اور ان کا ملبہ فروخت کر کے روپیہ داخل خزانہ سرکار ہوا۔ (نواب) حامد علی خاں بیچارے نے دار و گیر سے رہائی پائی تو کرایے کے مکان میں رہنے لگے۔ تباہی کی عام حالت میرزا کی زبان سے سنیے۔ فرماتے ہیں۔

> ’’امراء اسلام میں سے اموات گنو۔ حسن علی خاں بڑے باپ کا بیٹا سو روپے روز کا پنسن دار سو روپے مہینے کا روزینہ دار بن کر نامرادانہ مر گیا۔ میر ناصر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ اور نانا کی طرف سے امیر زادہ مظلوم مارا گیا — آغا سلطان، بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے، بیمار پڑا نہ دوا نہ غذا، انجام کار مر گیا۔ تمھارے چچا نواب ضیاء الدین احمد خاں کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ اجداد کو پوچھو ناظر حسین میرزا جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آ گیا ہے، اس کے پاس ایک پیسہ نہیں، ٹکے کی آمد نہیں مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے مگر دیکھیے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڈھے صاحب ساری املاک بیچ نوش جاں کر کے بہ یک

بنی و دوگوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ کے پان سو روپے کے املاک واگزاشت ہو کر پھر قرق ہو گئے۔ تباہ و برباد لاہور گیا ہے، وہاں پڑا ہوا ہے دیکھیے کیا ہو، قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجھر اور بہادر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ روپے کی ریاستیں لٹ گئیں۔ شہر کی امارتیں خاک میں مل گئیں’’۔

ایک اور خط میں یوسف میرزا کو لکھتے ہیں:

> ‘‘میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا، آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں۔ عقل جاتی رہتی ہے اگر اس ہجوم غم میں میری قوت متفکرہ میں فرق آ گیا ہو تو کیا عجب ہے بل کہ اس کو باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ کیا غم ہے؟ غم مرگ، غم فراق، غم رزق، غم عزت۔ میں قلعہ نامبارک سے قطع نظر کر کے اہل شہر کو گنتا ہوں۔ مظفر الدولہ میر ناصر الدین، میرزا عاشور بیگ میرا بھانجا، اس کا بیٹا احمد میرزا، انیس بیس برس کا بچہ مصطفیٰ خاں، ابن اعظم الدولہ، اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں، قاضی فیض اللہ، کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا، اے لو بھول گیا حکیم رضی الدین خاں، میر احمد حسین میکش۔ اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں، غم فراق حسین میرزا، یوسف میرزا، میر سرفراز حسین، میرن صاحب، خدا ان کو جیتا رکھے۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے خوش ہوتے۔ گھر ان کے بے چراغ، وہ خود آوارہ، سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ ان اموات کے غم اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ ہوتا رہے۔ یہاں اغنیاء و امراء کی اولاد و ازواج بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں’’۔

میرزا کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ کوئی واقعہ پیش آ جاتا تو ان کے دل میں جنگِ آزادی کے بعد کا دورِ مصائب تازہ ہو جاتا۔ ان کے شاگرد میرزا تفتہ نے اپنی کتاب ‘‘سنبلستان’’ چھپوائی۔ اس کی لکھائی چھپائی اچھی نہ تھی۔ میرزا نے اس واقعے کو بیگمات قلعہ کی مصیبتوں اور بدحالیوں پر آنسو بہانے کا بہانہ بنا لیا۔ فرماتے ہیں:

> ‘‘اجی میرزا تفتہ تم نے اپنا روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا۔ ہائے کیا بُری کاپی ہے...... اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو چلتے پھرتے دیکھتے۔ صورت ماہ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے

میلے۔ پائنچے لیر لیر۔ جُوتی ٹوٹی۔ یہ مبالغہ نہیں‘‘۔

اس وقت کے انگریزوں کی دماغی حالت کا اندازہ صرف اس واقعے سے ہو سکے گا کہ انھوں نے شاہی مسجد کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا اور اس کے دروازوں پر ایک سکھ بٹالین کا پہرہ بٹھا دیا تھا۔ ایک مرتبہ یہ تجویز بھی پیش ہُوئی تھی کہ اسے گرجا بنالیا جائے۔ جنگِ آزادی سے تقریباً پانچ برس بعد مسجد واگزار ہُوئی۔

میرزا نے ایک عجیب عبرت افزا واقعہ لکھا ہے:

> ’’جن مسلمانوں کی جایدادیں ضبط ہوئی تھیں ان میں ایک حافظ محمد بخش بھی تھے جن کا عرف ’’ممّوں‘‘ تھا۔ بعد میں وہ بے قصور ثابت ہوئے اور جایداد کی بحالی کا حکم مل گیا۔ انھوں نے کچہری میں درخواست دی کہ میری جایداد پر قبضہ دلایا جائے۔ انگریز حاکم نے نام پوچھا۔ عرض کیا محمد بخش چوں کہ درخواست میں عرف بھی درج تھا۔ اس لیے حاکم نے پوچھا، ممّوں کون ہے۔ عرض کیا کہ نام میرا محمد بخش ہے، لوگ مجھے ’’ممّوں، ممّوں‘‘ کہہ کر پکارتے ہیں۔ صاحب نے سن کر فرمایا یہ کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم اور حافظ ’’ممّوں‘‘ بھی تم، سارا جہاں بھی تم۔ جو دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں۔ مسل داخل دفتر ہوئی، میاں ’’ممّوں‘‘ اپنے گھر چلے آئے‘‘۔

آخر میں جنگِ آزادی کے متعلق میرزا کا ایک قطعہ لکھتا ہوں جو انھوں نے اپنے ایک دوست کو خط ہی میں لکھا تھا۔ یہ ان کے مکاتیب میں چھپ گیا اور دیوان میں شامل نہ ہو سکا:

بسکہ فعّالِ ما یرید ہے آج   ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے   زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے   گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک   تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک   آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا   وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ   سوزشِ داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم   ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے غالبؔ
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

بہ شکریہ ریڈیو پاکستان

(بعد میں یہ تقریر ماہ نامہ "ماہِ نو" کراچی فروری ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی۔)

خطوطِ غالبؔ کی اہم خصوصیات

میرزاؔ نے جب اردو میں خط لکھنے شروع کیے تو اس سے پہلے اُردو نثر کے دو مستقل اسلوب موجود تھے۔ ایک سادہ اور عام فہم اسلوب، اس کی مثال میں عام طور پر فورٹ ولیم کالج کی کتابیں پیش کی جاتی ہیں جو ڈاکٹر گل کرسٹ کے زیر اہتمام مرتب ہُوئیں۔ اس کے ساتھ مقفیٰ اور مغلق اسلوب تحریر بھی موجود تھا۔ عام اہل قلم کے نزدیک عالمانہ انداز یہی تھا کہ معمولی بات کو تشبیہوں اور استعاروں کے ذریعہ مبہم اور پیچ دار بنا کر پیش کیا جائے۔ یہ فارسی کے اس اسلوب نگارش کا پرتو تھا جو صدیوں سے ہندوستان میں رائج چلا آتا تھا، اس میں تفہیم کے بجائے نمایش علمیت پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔

میرزاؔ نے اپنے خطوں میں سادہ اور سلیس انداز اختیار کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس زمانے میں اُردو مکاتبت شروع کی جب فارسی میں مشاقی اوج کمال پر پہنچ چکی تھی اور یہ حقیقت ان پر کھل چکی تھی کہ عبارت میں قدم قدم پر پیچ ڈالنا، نئی نئی ترکیبوں اور نئے نئے استعاروں سے اسے بوجھل بنانا علم و فضل کی نمایش کا صحیح طریقہ نہیں بل کہ نفس مطلب ایسے رنگ میں پیش کرنا چاہیے کہ مخاطب بے تکلف اسے سمجھ جائے۔ بایں ہمہ اس سے بہتر اور موزوں تر الفاظ کا انتخاب آسان اور سہل نہ ہو۔ اس طرح انھوں نے اپنے انداز کو سہل ممتنع بنا دیا۔

پھر قدرت نے انھیں نکتہ وری اور نکتہ نوازی کے خاص جوہر عطا کیے تھے۔ وہ معمولی مطالب بھی لے کر بیٹھتے تو بیان کے حسن، ابداع کی خوبی اور نکتہ آفرینی کے کمال کے باعث دل چسپی اور دل آویزی کے نادر پہلو پیدا کر لیتے۔ سادگی اور سلاست کے باوجود انھوں نے اپنی تحریر کو ایسا پرداز دے دیا کہ آج تک ان کی نثر گوناگوں خوبیوں میں ممتاز چلی آتی ہے۔

بے تکلفی اور سادگی:

میرزاؔ کے اندازِ نگارش کی ممتاز ترین خصوصیت یہ ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے تھے، بے تکلف لکھتے

تھے۔ ان کے خطوط کا مطالعہ کرتے وقت شاید ہی کہیں یہ احساس ہو کہ الفاظ کے انتخاب یا مطالب کی تلاش و جستجو میں انھیں کاوش کرنی پڑی۔ برابر یہ محسوس ہوتا ہے کہ مطالب دل کش الفاظ کا جامہ پہن کر اس طرح بہے چلے آرہے ہیں جس طرح فوارے کا مُنہ کھل جانے سے پانی خود بہ خود اُچھلا چلا آتا ہے۔ ادبی بول چال کا سہارا لے کر کہہ سکتے ہیں کہ میرزا کے اُردو خطوط سراسر ''آمد'' تھے ''آورد'' سے ان کا دامن یک قلم پاک تھا۔ اس بے تکلفی اور رسم و راہ سے علیحدگی کا جامع ترین مرقع ان کے اُردو خطوط ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ فرمالیجیے:

۱۔ منشی شیونرائن آرام سے ارسال جواب میں تاخیر ہوئی۔ فرماتے ہیں:

''بھائی یہ بات تو کچھ نہیں کہ تم خط کا جواب نہیں لکھتے۔ خیر دیر سے لکھو اگر شتاب نہیں لکھتے''۔

۲۔ میرزا تفتہ نے خط لکھنے میں دیر کردی تو فرماتے ہیں:

''کیوں صاحب! کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندرآباد کے رہنے والے دِلّی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں؟ اگر یہ حکم ہوتا تو یہاں بھی اشتہار ہو جاتا کہ زنہار کوئی خط سکندرآباد کی ڈاک میں نہ جائے''۔

۳۔ میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

''ہاں صاحب! تم کیا چاہتے ہو؟ مجتہد العصر کے مسودے کو اصلاح دے کر بھیج دیا۔ اب اور کیا لکھوں؟ تم میرے ہم عمر نہیں جو سلام لکھوں۔ میں فقیر نہیں جو دعا لکھوں''۔

جدّت:

جدّت میرزا کے پورے کلام نظم و نثر کی جان ہے۔ وہ کوئی بھی بات عام اور فرسودہ انداز میں نہیں کہتے۔ انتہا یہ ہے کہ تقریباً ہر خط میں مکتوب الیہ کو نئے طریق پر خطاب کرتے ہیں مثلاً مہدی مجروح کے نام بعض خطوں کی ابتدائی عبارتیں ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ بھائی تم سچ کہتے ہو۔
۲ نور چشم میر مہدی کو بعد دعا کے معلوم ہو۔
۳۔ برخوردار کامگار میر مہدی دہلوی۔
۴۔ صاحب دو خط تمھارے بہ سبیل ڈاک آئے۔
۵۔ میاں تم کو پنسن کی کیا جلدی ہے۔

۶۔ میر مہدی تم میری عادت کو بھول گئے۔

۷۔ میری جان خط نہ بھیجو اور میرے خط کا انتظار کرو۔

لطف یہ کہ جس قسم کے مطالب پیش نظر ہوتے ہیں، اسی رنگ کا خطاب ہوتا ہے۔

اپنا نام لکھنے کے طریقے:

طریق خطاب کے نئے نئے رنگ آپ نے دیکھ لیے۔ اپنا نام بھی وہ اکثر عجیب وغریب انداز میں ظاہر کرتے ہیں مثلاً:

۱۔ خواجہ غلام غوث بے خبر کے نام

''قبلہ! آپ کو کبھی یہ بھی خیال آتا ہے کہ کوئی ہمارا دوست جو غالب کہلاتا ہے وہ کیا کھاتا پیتا ہے اور کیوں کر جیتا ہے''۔

۲۔ علائی کے نام

''تاریخ اوپر لکھ آیا ہوں نام اپنا بدل کر مغلوب رکھ لیا ہے۔

پھر کہیں فقیری کا رنگ اختیار کر کے اپنے آپ کو ''غالب علی شاہ'' لکھتے ہیں۔ اکثر ''نجات کا طالب غالب'' تحریر فرماتے ہیں۔

ایک خط کے آخر میں فرماتے ہیں:

''کاتب کا نام غالب ہے کہ تم جانتے ہو گے''۔

منظر کشی:

میرزا کا کمال یہ ہے کہ وہ جو کچھ بیان کرتے ہیں اس کی تصویر لفظوں میں اس طرح کھینچ دیتے ہیں کہ شاید رنگ وروغن کی تصویر میں نہ وہ جزئیات سما سکیں اور نہ اس میں وہ روح تاثیر پیدا ہو۔ اس کی مثالیں بھی بہت زیادہ ہیں:

۱۔ میر مہدی مجروح کے نام

> ''برسات کا حال نہ پوچھو، خدا کا قہر ہے، قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں عالم بیگ کے کٹرے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جو دروازہ تھا، گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے

بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنی ہوگئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے''۔

۲۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''آج اکیسواں دن ہے۔ آفتاب اس طرح نظر آجاتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی (۱) ہے۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ ان کو جگنو سمجھ لیتے ہیں۔ مبالغہ نہ سمجھنا ہزارہا مکان گر گئے۔ سیکڑوں آدمی جابہ جا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہ رہی ہے''۔

جزئیات نگاری:

میرزا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جزئیات کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ مفصل بیانات عموماً بے لطف ہوجاتے ہیں لیکن میرزا جزئیات کو اس ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں کہ تحریر بے مزہ ہونے کے بجائے زیادہ پُرلطف بن جاتی ہے۔ اس کی مثالیں بے شمار ہیں:

ثاقب کو بہ سلسلۂ سفر رام پور لکھتے ہیں:

''گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا۔ میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا۔ دو شامی کباب اس میں ڈال دیے۔ رات ہوگئی تھی۔ شراب پی لی۔ کباب کھائے۔ لڑکوں نے ارہر کی کھچڑی پکوائی۔ خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دن کے واسطے سادہ سالن پکوالیا، ترکاری نہ ڈلوائی۔ چار پانچ بجے کے عمل میں ہاپوڑ سے چل دیے۔ سورج نکلے بابوگڑھ کی سرائے میں آ پہنچا۔ چارپائی بچھائی۔ اس پر بچھونا بچھا کر حقہ پی رہا ہوں اور یہ خط لکھ رہا ہوں''۔

نکتہ آفرینی:

میرزا ہر بات میں سے دل چسپ اور لطیف نکتے پیدا کر لیتے ہیں مثلاً:

۱۔ نظیری کہتا ہے۔

بے تو دوشم در درازی چوں شبِ یلدا گزشت
تا نقاب امروز چوں برق از دیارِ ما گزشت

۱۔ چودھری عبدالغفور سرور بیمار ہو گئے تو ان کو لکھا:

”آپ نے مزاج کی ناسازی کا حال کچھ نہ لکھا۔ کل سے وقتِ خاص میں دعا مانگ رہا ہوں، یقین ہے پہلے تم درست ہو جاؤ گے ازاں بعد یہ خط پاؤ گے“۔

۲۔ میر سرفراز حسین کے نام

”تمھارے دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا جو بوئے پیراہن نے یعقوبؑ کے ساتھ کیا۔ یہاں یہ ہم تم بوڑھے ہیں یا جوان ہیں۔ توانا ہیں یا ناتواں ہیں بڑے بیش قیمت ہیں یعنی بہ ہر حال غنیمت ہیں کوئی جلا بھُنا کہتا ہے:

یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ
یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ

وہی بالا خانہ ہے اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے“۔

شکوہ و معذرت:

۱۔ حاتم علی بیگ مہر کو لکھتے ہیں:

”بندہ پرور! فقیر شکوے سے بُرا نہیں مانتا مگر شکوے کے فن کو سوائے میرے کوئی نہیں جانتا۔ شکوے کی خوبی یہ ہے کہ راہ راست سے منہ نہ موڑے اور مع ہذا دوسرے کے واسطے جواب کی گنجایش نہ چھوڑے“۔

۲۔ بعض اوقات شکایت کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں ابھی شکایت نہیں کرتا مثلاً حاتم علی مہر کو ایک دو کاموں کے لیے لکھا تھا جو مشکل نہ تھے وہ نہ ہو سکے تو ان کا ذکر کرتے ہُوئے لکھتے ہیں:

”ابھی شکایت نہیں کرتا، پوچھتا ہوں کہ یہ امور مقتضی شکایت ہیں یا نہیں“؟

۳۔ نواب علاء الدین احمد خاں نے ایک مرتبہ اپنے نومولود فرزند کا تاریخی نام تجویز کرنے اور تاریخ ولادت کہنے کی فرمایش کی۔ میرزا معذرت کرنا چاہتے تھے، اس کے لیے بالکل نیا طریقہ اختیار کیا۔

”تم سخن ور ہو گئے۔ حسنِ طبع خداداد رکھتے ہو۔ ولادتِ فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسم تاریخی کیوں نہ نکال لو کہ مجھ پیر غم زدہ دل مردہ کو تکلیف دو؟ علاء الدین خاں! تیری جان کی قسم! میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا اور وہ لڑکا نہ جیا مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوست طالع کی تاثیر سے ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ (والیان اودھ) ایک ایک قصیدے میں چل دیے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہُوئے پھر سنبھل نہ سکے جس کی مدح

میں دس بیس قصیدے کہے، وہ عدم سے بھی پرے پہنچا''۔

تاریخی پرداز:

میرزا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ بعض اوقات حرف مطلب کو تاریخی پرداز دے کر بے حد پُر تاثیر بنا دیتے ہیں مثلاً:

۱۔ نواب علاء الدین خاں علائی بہ زمانہ ولیِ عہدی لوہارو میں تھے اور والد کے اذن و اجازت کے بغیر دہلی نہ آ سکتے تھے۔ میرزا لکھتے ہیں:

''تمھارے حال میں غور کی اور چاہا کہ اس کی نظیر بہم پہنچاؤں واقعۂ کربلا سے نسبت نہیں دے سکتا لیکن واللہ تمھارا حال اس ریگستان میں بعینہ ایسا ہے جیسا مسلم بن عقیل کا حال کوفے میں تھا''۔

اس تاریخی پرداز نے علائی کی مصیبتوں کا جو نقشہ پیش کر دیا، اسے کوئی تفصیل زیادہ جامع اور پُر تاثیر نہیں بنا سکتی۔

۲۔ اسی طرح ایک خط میں لکھتے ہیں:

''تمھارے دست خطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا جو پیراہن نے یعقوب کے ساتھ کیا''۔

مزاح و ظرافت:

میرزا کے مزاج میں شوخی اور ظرافت اس درجہ تھی کہ خواجہ حالی نے فرمایا:

''انھیں بجائے حیوان ناطق کے حیوان ظریف کہنا بجا ہے''۔

یہ شوخی اور ظرافت خطوں میں بھی جا بجا موجود ہے مثلاً:

۱۔ بعض مقامات پر محض نقالی سے لطف ظرافت پیدا کر لیتے ہیں۔ حسین علی خاں ابن زین العابدین عارف بچہ تھا چناں چہ ایک خط میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہ حسین علی خاں جس کا روزمرہ ہے کھلونے منگا دو، میں بجار (بازار) جاؤں گا''۔

۲۔ جب انھیں کوئی دل چسپ واقعہ مل جاتا ہے تو اپنے خاص انداز میں بیان کر کے اسے بے حد پُر لطف بنا دیتے ہیں۔ ہرکارے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں بالا خانے پر رہتا ہوں۔ حویلی میں آ کر اس نے داروغے کو خط دے کر مجھ سے کہا کہ ڈاک کا ہرکارہ بندگی عرض کرتا ہے اور کہتا ہے مبارک ہو۔ آپ کو جیسا کہ دِلّی کے بادشاہ نے نوابی کا

خط دیا ہے اب کالپی سے خطاب کپتانی کا ملا۔ حیران کہ کیا بکتا ہے۔ سرنامے کو غور سے دیکھا کہیں قبل از اسم ’’مخدوم نیاز کیشاں‘‘ لکھا تھا، اس قرمساق نے اور الفاظ سے قطع نظر کر کے ’’کیشاں‘‘ کو ’’کپتان‘‘ پڑھا‘‘۔

۳۔ بعض اوقات اپنی مصیبتوں اور پریشانیوں کا نقشہ اس انداز میں کھینچتے ہیں کہ پڑھتے ہی بے اختیار ہنسی آجاتی ہے مثلاً قربان علی بیگ سالک کو لکھتے ہیں:

> ’’آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے جو دُکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دُور دُور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا، ہم نے از راہِ تعظیم، جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرام گاہ و عرش نشین خطاب دیتے ہیں چوں کہ یہ اپنے کو شاہ قلم روخن جانتا تھا۔ ’’سقر مقر‘‘ اور ’’ہاویہ زاویہ‘‘ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آیئے نجم الدولہ بہادر! ایک قرض دار کا گریباں میں ہاتھ اور ایک بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں اجی حضرت نواب صاحب نواب صاحب کیسے، روغلان صاحب آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔ کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا‘‘۔

مقفیٰ عبارت:

میرزا کے زمانے میں عالمانہ اندازِ بیان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ سمجھی جاتی تھی کہ پوری عبارت مقفیٰ ہو چناں چہ خود میرزا نے بھی تقریظوں اور دیباچوں میں بھی یہی ڈھنگ اختیار کیا ہے اور اہلِ ذوق کی خدمت میں یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ تقریظیں اور دیباچے کتنے ہی عالمانہ ہوں تاہم انھیں میرزا کے معروف اندازِ نگارش سے کوئی مناسبت نہیں۔ خطوط میں بھی میرزا نے کہیں کہیں مقفیٰ عبارتیں لکھی ہیں لیکن التزام نہیں کیا بل کہ بے تکلف لکھتے لکھتے خود بہ خود قافیے پیدا ہو گئے۔ وہ اتنے خوش نما معلوم ہوتے ہیں گویا سونے کی انگوٹھی میں بیش قیمت ہیرے جڑ دیے ہیں۔

مجروح کے نام لکھتے ہیں:

۱۔ ''سید صاحب، نہ تم مجرم، نہ میں گنہ گار، تم مجبور، میں لاچار، لو اب میری کہانی سنو، میری سرگزشت میری زبانی سنو''۔

۲۔ ''بھائی تم اُردو کے میرزا قتیل بن گئے۔ اُردو بازار میں نہر کے کنارے رہتے رہتے رودِ نیل بن گئے کیسا قتیل کیسا رود نیل، یہ سب ہنسی کی باتیں ہیں۔ لو سنو اب تمھاری دلّی کی باتیں ہیں۔''

۳۔ او میاں زادۂ آزادہ، دلّی کے عاشق دل دادہ، ڈھے ہوئے اُردو بازار کے رہنے والے اور حسد سے بُرا کہنے والے۔ نہ دل میں مہر و آزرم، نہ آنکھوں میں حیا و شرم۔ نظام الدین ممنون کہاں، ذوق کہاں مومن کہاں۔ ایک آزردہ سو خاموش، دوسرا غالب سو بے خود و مدہوش، نہ سخن وری نہ سخن دانی کس برتے پر تتا پانی، ہائے دلّی وائے دلّی، بھاڑ میں جائے دلّی۔

۴۔ آرام نے اپنے اخبار کے لیے خریدار مہیا کرنے کی غرض سے لکھا۔ جواب میں فرماتے ہیں:

> ''یہاں آدمی کہاں ہے کہ اخبار کا خریدار ہو۔ مہاجن لوگ جو یہاں بستے ہیں یہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہیں۔ بہت سخی ہوں گے تو جنس پوری تول دیں گے۔ کاغذ روپے مہینے کا کیوں مول لیں گے۔

کمال حسن تحریر:

میرزا نے مکاتیب کے مختصر سے مجموعے میں جو تحریری کمالات دکھائے ان کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ اس بارے میں خاص طور پر قابلِ ذکر و توجہ امر یہ ہے کہ ان کی تحریر میں سے ایک لفظ کو آگے پیچھے کرنے یا بدلنے یا حشو و زوائد قرار دینے کی گنجایش نہیں نکل سکتی جو کچھ لفظوں میں اور جس ترتیب سے بیان کر گئے ہیں اس مضمون کے لیے اس سے بہتر الفاظ اور پیرایہ بیان اختیار کرنا ممکن نہیں۔

۱۔ مجروح کے نام

> ''بھائی، کیا پوچھتے ہو؟ کیا لکھوں؟ دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع بازار مسجد جامع کا، ہر ہفتے سیر جمنا پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا، یہ پانچوں باتیں اب نہیں پھر کہو دلّی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلم رو ہند میں اس نام کا تھا۔''

۲۔ رام پور پہنچ کر لکھتے ہیں:

’’غذا میرے بھی خلاف طبع نہیں۔ پانی کا شکر کس منہ سے ادا کروں؟ ایک دریا ہے کوسی۔ سبحان اللہ اتنا میٹھا پانی کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت ہے۔ صاف، سبک گوارا، سریع النفوذ۔‘‘

پانی کی مٹھاس کے لیے ’’پھیکے شربت‘‘ کی تعبیر کتنی عمدہ اور دل نشیں ہے۔

۳۔ امین الدین احمد خاں نے قدسی کی ایک غزل پر غزل کہنے کی فرمائش کی۔ علائی کو لکھتے ہیں:

’’بھائی تمھارا باپ بدگمان ہے۔ مجھ کو زندہ سمجھتا ہے۔ میرا سلام کہو اور میرا یہ شعر پڑھ کر سناؤ:

گمان زیست بود بر منت ز بے دردی
بد است مرگ ولے بد تر از گمانِ تو نیست

مجھے کافور و کفن کی فکر پڑ رہی ہے اور وہ ستم گر شعر و سخن کا طالب ہے‘‘۔

۴۔ انوار الدولہ شفق کے نام احتراقِ خون کی تکلیف دہ بیماری سے افاقت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’نئے سرے سے روح قالب میں آئی۔ اجل نے میری سخت جانی کی قسم کھائی، اب اگرچہ تندرست ہوں، ناتوان و سست ہوں۔ حواس کھو بیٹھا، حافظے کو رو بیٹھا اگر اٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں اٹھتا ہوں کہ جتنی دیر میں قد آدم دیوار اُٹھے‘‘۔

اندازِ مکالمت

میرزا کے مکاتیب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے تحریر میں مکالمت کا رنگ پیدا کر دیا تھا۔ حاتم علی بیگ مہر کو لکھتے ہیں:

’’میرزا صاحب! میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو‘‘۔

تفتہ کو لکھتے ہیں:

’’بھائی تم میں مجھ میں نامہ نگاری کاہے کو ہے، مکالمہ ہے۔‘‘

اول ان کے خطوں کا عام انداز ہی مکالمے اور بات چیت کا ہے کہیں کہیں باقاعدہ مکالمے بھی لکھتے ہیں مثلاً:

۱۔ مجروح کو لکھتے وقت آغاز میرن صاحب کے ساتھ مکالمے سے کیا ہے؟

''اے میرن صاحب، السلام علیکم''۔

''حضرت آداب''۔

''کہو صاحب۔ آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی''؟

''حضور! میں کیا منع کرتا ہوں مگر میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہُوں پھر آپ کیوں تکلیف کریں''۔

۲۔ مہدی مجروحؔ کے نام

''اہاہا۔ میرا پیارا میر مہدی آیا۔ آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے۔ بیٹھو یہ رام پور ہے یا دار السرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے''؟

ذات اور ماحول:

میرزا کا ایک کمال یہ ہے کہ وہ اثنائے تحریر میں ذاتی حالات اور ماحول کی جزئیات اس بے ساختگی سے بیان کر جاتے ہیں کہ دوران مطالعہ میں شاید یہ محسوس نہ ہو، اپنے متعلق کیا کچھ لکھ دیا لیکن پورے مکاتیب کو سامنے رکھ کر حیات غالب کا مکمل نقشہ تیار کیا جا سکتا ہے مثلاً یہ کہ وہ کب اور کہاں پیدا ہُوئے۔ خاندان کی کیفیت کیا تھی؟ وسائل معاش کیا کیا تھے۔ کہاں کہاں سے پیسے ملتے رہے، کن کن مکانوں میں رہے؟ کن کن لوگوں سے کس قسم کے تعلقات تھے؟ قلعے کب جاتے تھے؟ کھاتے پیتے کیا تھے؟ رات دن کی مشغولیت کا کیا حال تھا۔ کن کن بیماریوں سے سابقہ پڑا؟ آخری عمر میں ضعف کس رفتار سے ترقی کرتا رہا؟ نظم و نثر کی اصلاح کا طریقہ کیا تھا؟ اخلاق کیسے تھے؟ کن کن مقامات کے سفر کیے؟ غرض ان کی زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہو جس کے متعلق ان کے قلم سے معلومات کا گراں بہا ذخیرہ فراہم نہ ہوا ہو لیکن یہ ظاہر ہے کہ ذاتی حالات کی تسوید ان کے پیش نظر نہ تھی۔

اس طرح دہلی اور بعض دوسرے مقامات کے حالات ان کے خطوں میں بہ کثرت موجود ہیں۔ عام ملکی حالات کے متعلق بھی خاصی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ انھوں نے ''غدر'' کے نتائج و عواقب پر بیسیوں خطوں میں بحث کی ہے اور جو نقشہ پیش کیا ہے، وہ کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتا۔ نواب غلام بابا خاں نے جشن کے سلسلے میں سورت آنے کی دعوت دی۔ جواب میں لکھتے ہیں:

''پاؤں سے اپاہج، کانوں سے بہرا، ضعف بصارت، ضعف دماغ، ضعف دل،

ضعف معدہ۔ ان سب ضعفوں پر ضعفِ طالع۔ کیوں کر قصد سفر کروں؟ تین چار
شبانہ روز قفس میں کس طرح بسر کروں‘‘؟

اس طرح بیان کر گئے کہ ۱۸۶۰ء میں ریل کے ذریعے دہلی سے سورت پہنچنے میں تین چار دن صرف ہوتے تھے۔

غرض میرزا نے اپنی شخصیت کے مختلف پہلو اس تفصیل سے واضح کر دیے ہیں کہ تنہا انھیں کو سامنے رکھ کر ان کی زندگی کا جامع اور مکمل نقشہ تیار کیا جا سکتا ہے۔

یہ خطوط محض اس وجہ سے بیش بہا نہیں کہ غالبؔ کے خطوط ہیں بل کہ ان کی بیش بہائی کے دوسرے وجوہ بھی ہیں مثلاً:

۱۔ ان کے آئینے میں غالب کی شخصیت ایسے انداز سے جلوہ گر نظر آتی ہے کہ اکثر اصحاب کو زندگی میں بھی اسے اس تفصیل سے دیکھنے کا موقع شاید ہی ملا ہو۔

۲۔ یہ خطوط اُردو زبان میں گوناگوں اسالیبِ بیان کا ایک نہایت نادر اور دل کش مرقع ہیں۔

۳۔ ان میں غالب کے سوانحِ حیات کا زیادہ سے زیادہ سرمایہ موجود ہے۔

۴۔ ان میں غالب کے دل و دماغ کی مکمل تصویر خود اِن کے موقلم سے تیار ہو کر سامنے آ گئی ہے اور یہ تصویر اس جامعیت سے نہ ان کے کلیاتِ نظم فارسی میں ملتی ہے، نہ کلیاتِ نثر فارسی میں اور نہ اُردو دیوان میں جو ہمارے ہاں ان کی یگانہ شہرت کا شہپر پرواز ہے۔

ان کے بعد ملک میں بڑے بڑے ادیب پیدا ہوئے جن کی تصانیف ہماری زبان کا گراں بہا سرمایہ ہیں۔ ان میں اکثر کے مکاتیب بھی چھپ چکے ہیں لیکن ان میں سے کون سا مجموعۂ مکاتیب ورقعاتِ غالبؔ کے لطائف و نفائس کی ہمہ گیری کا مقابلہ کر سکتا ہے بل کہ کس کی تصنیف میں دل چسپیوں کی وہ فراوانی مل سکتی ہے جو میرزاؔ نے اپنے خطوں میں بے تکلف فراہم کر دی۔

(ماخوذ از دیباچہ ’’خطوطِ غالب‘‘)

طبع چہارم ۱۹۶۸ء

لطائف غیبی

قاطع برہان کے سلسلے کی ایک کتاب

کتاب کی کیفیت:

‘‘لطائف غیبی’’ ‘‘قطعات تاریخ’’ اور ‘‘صحیح نامہ’’ کو شامل کرتے ہوئے چوالیس صفحے کی ایک کتاب ہے جسے ضخامت کے اعتبار سے رسالہ سمجھنا چاہیے۔ سرورق پر سب سے پہلے مندرجہ ذیل شعر جلی حروف میں مرقوم ہے:

ایں نسخہ کہ ہست رشک ارتنگ
سرچنگ بود برائے خرچنگ

ارتنگ مرقع کو کہتے ہیں۔ مانی کے مرقعے کا نام بھی ارتنگ ہے۔ سرچنگ ڈھول کو اور خرچنگ کیکڑے کو۔ شعر کے بعد سرِ ورق کی عبارت یہ ہے:

منت ایزد را کہ نتیجۂ فکر محقق مدقق میاں داد خاں سیاحؔ المخاطب بہ سیف الحق ایں نسخہ شگرف مسمّٰی بہ

لطائف غیبی

بہ جواب ‘‘محرق قاطع برہان’’ بہ صحت تمام وسعیِ مالا کلام نخستیں بار بہ اہتمام میر فخر الدین در اکمل المطابع دہلی طراز انطباع گرفت۔

دوسرے صفحے کا نصف سے کسی قدر کم حصہ چھوڑ کر اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ دیباچے کے علاوہ یہ بیس لطیفوں پر مشتمل ہے اور صفحہ ۴۱ پر ختم ہوگئی ہے۔ صفحہ ۴۲ اور ۴۳ پر پانچ قطعاتِ تاریخ ہیں۔ دو منشی جواہر سنگھ جوہر تحصیل دار بلب گڑھ کے، تیسرا میرزا یوسف علی خاں عزیز کا، جنھیں ‘‘سراج الشعرا’’ اور ‘‘سلطان الذاکرین’’ کہا گیا ہے، چوتھا میرزا شمشاد علی بیگ خاں رضوان کا۔ یہ تینوں میرزا غالب

کے شاگرد تھے۔ پانچواں قطعہ بہاری لال کا ہے جس نے ''لطائف غیبی'' کی کتابت کی تھی۔ پھر تمت کے نیچے یہ عبارت درج ہے:

> الحمدللہ والمنت کہ ایں صحیفہ سماوی یعنی ''لطایف غیبی'' بہ شیریں کاری کارپردازانِ اکمل المطابع بہ تاریخ بست ونہم ربیع الثانی ۱۲۸۱ھ طبع شد۔

گویا کتاب ۲۱ اکتوبر ۱۸۶۴ء کو چھپی۔ صفحہ ۴۴ مطبوعہ کتاب کی غلطیوں کی تصحیح کے لیے وقف ہے اور اسے عام رواج کے مطابق ''غلط نامہ'' نہیں بل کہ ''صحیح نامہ'' قرار دیا گیا ہے۔

''محرق قاطع برہان'' منشی سید سعادت علی نے غرہ محرم الحرام ۱۲۸۰ھ کو مکمل کی تھی اور اسی سال یہ چھپ گئی تھی۔ ۱۲۸۰ھ اوائل جون ۱۸۶۴ء میں ختم ہوا گویا چند مہینوں میں میرزا غالب کی طرف سے اس کے جواب میں دو رسالے شائع ہوئے۔ اول سوالات ''عبدالکریم'' دوم ''لطائف غیبی'' تیسری کتاب مولوی نجف علی نے ''دافع ہذیان'' کے نام سے شائع کی۔ اس کے بعد جو مخالف یا موافق کتابیں طبع ہوئیں وہ پیش نظر تذکرے کے دائرے سے خارج ہیں۔

مصنف کی بحث:

اس سلسلے میں سب سے پہلا بحث طلب مسئلہ یہ ہے کہ ''لطائف غیبی'' کا مصنف کون تھا؟ کتاب پر میاں داد خان سیاح کا نام درج ہے جنھیں میرزا غالب نے ''سیف الحق'' کا خطاب دیا تھا وہ خود ایک مکتوب میں سیاح کو لکھتے ہیں:

> ''تمھیں جو میں نے سیف الحق خطاب دیا ہے، اپنی فوج کا سالار مقرر کیا ہے۔ تم میرے ہاتھ ہو، تم میرے بازو ہو۔ میرے نطق کی تلوار تمھارے بازو سے چلتی رہے گی''۔

یہ خطاب پہلی مرتبہ ''لطائف غیبی'' ہی کے ذریعے سے منظرِ عام پر آیا اور سیاؔح اس وقت میرزا کے پاس نہ تھے بل کہ سورت میں نواب میر غلام بابا خاں رئیس اعظم کے پاس تھے اگر اسے واقعی سیاح کی تصنیف فرض کیا جائے تو یہ ماننا لازم ہوگا کہ ''محرق قاطع'' چھپ کر سیاؔح کے پاس پہنچی۔ اس نے کتاب دیکھتے ہی ''لطائف'' مرتب کی، اسے طباعت کے لیے میرزا کے پاس دہلی بھیج دیا اور یہ سب کچھ چار پانچ مہینے میں ہوگیا۔ یہ بات تو خیال میں آسکتی ہے کہ سیاؔح کے دل میں ''محرق'' کے جواب کا خیال پیدا ہوا ہو لیکن وہ اپنے افکار کو ''لطائف'' کی شکل میں پیش نہیں کرسکتا تھا۔ یہ اسلوب صرف

میرزا غالبؔ ہی کے ندرت آفریں دماغ کو سوجھ سکتا تھا اور وہی اسے تمام لوازم کے ساتھ لطف انگیز الفاظ کا لباس پہنا سکتے تھے۔ یہ حقیقت کسی خاص توضیح کی محتاج نہیں لیکن جو شواہد میں پیش کرنے والا ہوں انھیں ملاحظہ فرمانے کے بعد ہر صاحبِ فکر و نظر پر روشن ہو جائے گا کہ ''لطائف غیبی'' خود میرزا نے لکھی۔ سیاؔح کو اس کی ترتیب کا بھی علم نہ تھا، یہاں تک کہ کتاب چھپ کر شائع ہو گئی اور میرزا غالبؔ نے اس کے نسخے سیاؔح کے پاس بھیجے۔

وہ خود ایک مکتوب میں سیاؔح کو لکھتے ہیں:

> ''خط میں آپ نے بہت سے مطالب لکھے مگر تیس کتابوں کے دو پارسلوں کی رسید نہیں لکھی۔ یہ ایک پارسل جو بعد دو پارسلوں کے بھیجا گیا ہے۔ اس میں وہی ''لطائف غیبی'' ہے، جس کو میں نے اپنے مطالعے میں رکھ کر صحیح کیا ہے۔ اس کے بھیجنے سے یہ مدعا ہے کہ تم ان تیس رسالوں کو اس کے مطابق صحیح کر لو''۔

کتاب کی تصحیح مصنف کا کام ہے، نہ کہ قاری کا اگر ''لطائف غیبی'' سیاؔح کی تصنیف تھی تو میرزا کو یہ لکھنے کی کیا ضرورت تھی کہ ''میرا درست کردہ نسخہ سامنے رکھ کر باقی نسخوں کی تصحیح کر لو۔''

لطائف غیبی کی ابتداء:

میرا خیال ہے کہ میرزا نے ''محرق'' کے چھپتے ہی لطائف غیبی کے لیے ضروری چیزیں فراہم کرنے کا سلسلہ جاری کر دیا تھا۔ ہمارے سامنے ان کے تمام مکاتیب موجود نہیں اگر ہوتے تو بہت سی بیش قیمت معلومات مل جاتیں مثلاً وہ ایک مکتوب میں نواب علاء الدین احمد خاں علائی کو لکھتے ہیں:

> ''یہ رسالہ موسوم بہ ''محرق قاطع برہان'' جو (شہاب الدین احمد خاں) ثاقب نے تم کو بھیجا ہے، میرے کہنے سے بھیجا ہے اور اس ارسال سے میرا مدعا یہ ہے کہ معائنے کے وقت اس کتاب کی بے ربطیِ عبارت پر اور میری اپنی قرابت اور نسبت ہائے عدیدہ پر نظر کرو، بے گانہ وار دیکھو اور از روئے انصاف حکم بنو، بے حیف و میل، اس نے جو مجھے گالیاں دی ہیں، ان پر غصہ نہ کرو، غلطیاں عبارت کی، شدت اطناب ممل کی، سوال دیگر جواب دیگر، ان باتوں کو مطمح نظر کرو بلکہ اگر فرصت مساعدت کرے تو ان مراتب کو الگ الگ ایک کاغذ پر لکھو اور بعد اتمام میرے پاس بھیج

دو۔ میرا ایک دوست روحانی کہ وہ من جملہ رجال الغیب ہے ان ہفوات کا خاکہ اڑا رہا ہے۔ نیرؔ رخشاں نے اس کو مدد دی ہے۔ تم بھی بھائی مدد دو‘‘۔

ظاہر ہے کہ میرزا خود بھی ’’محرق‘‘ کی غلطیاں جمع کر رہے تھے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ نے بھی یہ کام اپنے ذمے لیا تھا اور میرزا چاہتے تھے کہ نواب علاء الدین احمد خاں علائیؔ بھی جتنی مدد دے سکیں، ضرور دیں۔ مقصود یہ تھا کہ مختلف اربابِ نظر اپنے اپنے اندازے کے مطابق جو جو غلطیاں بروئے کار لائیں گے انھیں جمع کر کے جوابی یا انتقادی کتاب یا رسالہ مرتب کر لینا سہل ہوگا اگرچہ میرزا نے اس مکتوب میں ایک ’’دوست روحانی‘‘ کا ذکر کیا ہے جسے وہ من جملہ رجال الغیب کہتے ہیں لیکن وہ خود میرزا تھے نہ کہ میاں داد خاں سیاحؔ جو ان حالات سے بھی غالباً بے خبر تھا۔

’’سیر سیاح‘‘:

ایک قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ لطائف کا اسلوبِ تحریر سیاحؔ کے اسلوب سے بالکل مختلف ہے۔ سیاحؔ کے خطوط تو ہمارے سامنے نہیں لیکن ان کی ایک کتاب ’’سیر سیاح‘‘ کے نام سے منشی نول کشور نے ۱۸۷۲ء میں شائع کی تھی۔ یہ سیاحؔ کی سیاحت ہند کا ایک مرقع ہے جس میں کچھ کم ساٹھ صفحے ہیں جو دو دو مشاعروں میں مختلف شعرا کے کلام پر مشتمل ہیں۔ ابتدا میں سیاحؔ نے اپنی سیر کے حالات بہ صورت نثر مرتب کیے ہیں۔ یہ نثر ’’لطائف‘‘ سے کم و بیش سات سال بعد کی ہے، اس وجہ سے اس میں زیادہ پختگی، زیادہ روانی اور زیادہ حسن موجود ہونا چاہیے تھا۔ اس کے برعکس وہ پرانے رنگ کی نثر ہے جس کے دو دو تین تین فقروں میں قافیہ بندی کا التزام کیا جاتا تھا۔ میں صرف ایک مثال پیش کروں گا۔ منشی نول کشور کی مہمان نوازی کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

> ’’سیر چشمی، سبحان اللہ، منش بزرگ واہ واہ حوصلے کی تنومندی، ہمت کی بلندی بات بات میں، انضباط لوازم و احتیاط مراسم کی پابندی ملاقات میں۔ رات دن تکلف کے نئے ٹھاٹ دکھاتے، سو سو طرح سے میرے دل کو بہلاتے، ہر روز روزِ عید، ہر شب شبِ برات، صبح و شام اکابر شہر کی ملاقات۔ تواضع کوشی کا شیفتہ کیا، مدارات جوشی کا فریضہ اگر حضرت نوحؑ کی عمر پاؤں، شکر مہماں نوازی ادا نہ کر سکوں...... یہ داستان حد سے متجاوز ہے کہ قلم دو زباں ایک جملے کے ادا میں عاجز ہے، نہ ہاتھ میں طاقت تحریر کی نہ زباں میں طاقت تقریر کی‘‘۔

بس چھ سات صفحے اس قسم کی عبارت سے مزّین ہیں۔ ''لطائف غیبی'' کا اسلوب اس سے بالکل مختلف ہے اور اس کا ایک بھی صفحہ ایسا نہیں جسے مذکورہ بالا عبارت کے محرّر کی قلم کاری کا نتیجہ قرار دیا جا سکے۔

''سوالات'' و ''لطائف'' کے مطالب:

ایک عجیب امر یہ ہے کہ ''سوالات عبدالکریم'' اور ''لطائف غیبی'' کے بعض مطالب میں ایسا اشتراک ہے کہ دونوں چیزیں صرف ایک فرد کے قلم سے ہو سکتی ہیں مثلاً سوالات میں سے سترھواں یا آخری سوال منشی سعادت علی مصنف ''محرق'' سے کیا گیا ہے:

> ''آپ سنّی ہیں اہل جماعت۔ خلفائے راشدین کو اپنا پیر و مرشد اور ان کی تعظیم و تفضیل کو اپنے اوپر واجب اور سبّ صحابہ کو گناہ بل کہ کفر جانتے ہیں۔ آپ کے حقیقی بھائی نے مذہبِ رفض اختیار کیا۔ محرّم میں حاضریاں کھاتے اور تعزیہ خانوں میں بھُس اڑاتے پھرتے ہیں۔ تم ان سے کبھی خفا نہ ہوئے۔ مقامِ حیرت ہے کہ جامع ''برہان قاطع'' کی مذمت پر تو وہ استیلائے غیظ وغضب اور لعن وطعن صحابہؓ سن کر کان پر جُوں نہ پھرے اور تیوری پر بل نہ پڑے...... الخ''

اب ''لطائف غیبی'' اٹھائیے۔ اس کے دوسرے لطیفے میں اور باتوں کے علاوہ یہ بھی ہے:

> ''مزہ ایک اور ہے کہ منشی جی بذاتِ خود سنّی ہیں اور حقیقی بھائی ان کے شیعی سنّی ہیں۔ محرّم میں بھُس اڑاتے پھرتے ہیں۔ حاضریاں کھاتے پھرتے ہیں۔ اصحابِ ثلاثہ رضی اللہ عنہم کو بُرا کہتے ہیں اور منشی جی کے ساتھ ایک گھر میں رہتے ہیں۔ ان پر منشی جی کو کبھی غصّہ نہ آیا۔ خلفائے راشدین کی مذمت سے منع نہ فرمایا۔ اس باب میں کوئی عذر پیش لائیں۔ اس کی وجہ بیان فرمائیں۔ بدیہی تو یہی ہے کہ منشی جی کو دکنی کا پاس اپنے بزرگانِ دین سے زیادہ ہے''۔
>
> (لطائف ص ۵)

سولھواں سوال:

اسی طرح ''سوالات'' کا سولھواں سوال ہے:

> ''محمد حسین دکنی جامع ''برہان قاطع'' پیر طریقت نہ تھا، شیخِ وقت نہ تھا، مفتی نہ تھا، مجتہد نہ تھا، عالم نہ تھا۔ رعایائے دکن میں سے ایک شخص متوسط الحال ہوگا۔ غایۃ مافی اسباب یہ کہ پڑھا لکھا ہوگا۔ اس کی بہ نسبت جو حضرت غالب مدظلہ العالی نے کچھ کلمات ظرافت آمیز لکھے، آپ نے اس کے عوض میں حضرت کو وہ کچھ لکھا کہ کوئی اشراف کسی ادنیٰ آدمی کو بھی نہ کہے گا، نہ لکھے گا۔ بس صاف گالیاں ہیں۔ یہ آپ کا معتقد آپ سے بہ کمالِ عجز وانکسار پوچھتا ہے کہ ایک دکنی دنی کے واسطے آپ کو غصہ اتنا کیوں آ گیا کہ آپ نے مناظرے کو پھکڑ بنا دیا اور فحش بکنے لگے اور بھوگ دینے لگے؟ اس سوال کا جواب شافی لکھیے''۔

''لطائف غیبی'' میں لکھتے ہیں کہ ایک شخص عالی خاندان ہے۔ علاوہ بریں صاحبِ کمال، یگانۂ روزگار، اہل ہندوستان کا مطاع، مسائل منطق فارسی کا مفتی، مرنجان مرنج، گوشہ نشیں، آزاد وارستہ، ستر برس کی عمر ہے۔ یعنی اسد اللہ خاں غالب:

> ''ایسے شخص کی نسبت ناسزا کہنا منافی شانِ علم وادب بل کہ خلاف آئین آدمیت ہے۔ منشی سعادت علی نے قطع نظر اور حالات وکمالات سے، کبرسن کا بھی پاس نہ کیا۔
> شیخ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:
>
> کہ حق شرم دارد زموے سفید
>
> جس سے خالق کو شرم آئے، مخلوق اس سے نہ شرمائے۔ مابہ النزاع یہ ہے کہ حضرت غالب نے ''برہان قاطع'' کے اغلاط پر اعتراضات لکھے ہیں کہیں کہیں ازراہِ شوخی طبع ظریفانہ بہ طریق بذلہ رقم سنج ہُوئے ہیں۔ منشی جی نے حضرت غالب کی شان میں سفیہانہ وہ کلمات ناسزا لکھے ہیں کہ ایسے کلمات کوئی شریف النفس بہ نسبت کسی آدمی کے نہ لکھے گا۔ محمد حسین دکنی کے انتقام لینے کا بہانہ مسموع ومقبول نہیں۔ وہ دکنی منشی جی کا کون تھا جوان کو اس کی مذمت سُن کر ایسا غصہ آ گیا کہ چہرہ گرمی سے لال ہوگیا۔ بدن سے پسینا بہنے لگا۔ منہ میں جھاگ آ گئے۔ آنکھیں بند کرلیں۔ گالیاں بکنے لگے''

(لطائف ص ۵)۔

اطناب ممل:

ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔ لطیفہ نمبر۲ کا آغاز یوں ہوتا ہے:

> ''اے صاحبان فہم و انصاف! عبارت ''محرق قاطع ممل'' کو دیکھا چاہیے۔ خلط مبحث، اطناب ممل، سوءِ ترکیب، تباہی روزمرہ، غلطی فہم، اس سے مجھے کچھ کام نہیں۔ بھلا عامیان معوج الذہن کی نثر اور کیسی ہوگی۔ خالصاًللہ یہ بتاؤ کہ یہ مناظرہ ہے یا پھکڑ؟ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہیجڑا تالیاں بجا کر گالیاں دیتا ہے یا ایک سڑی کو کسی نے چھیڑ دیا ہے، وہ فحش بک رہا ہے''۔

واضح رہے کہ اطناب ممل یہاں موجود ہے۔ یہ نواب علائی کے نام کے مکتوب میں بھی موجود ہے جس سے اقتباس پہلے پیش ہو چکا ہے اور اس قطعے میں بھی موجود ہے جو میرزا نے مولوی احمد علی کی ''مؤیدِ برہان'' کے جواب میں لکھا تھا:

لغو و حشو و ادعاے محض و اطنابِ ممل
مور و موش و سوسمار و گربہ یک جا کردہ است

دوسرے کے نام سے کیوں؟

بہ ہر حال قرائن سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ''سوالات عبدالکریم'' کی طرح ''لطائف غیبی'' بھی خود میرزا غالب نے لکھی تھی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس پر اپنا نام کیوں نہ دیا؟ مطالب یا اسلوبِ تحریر کے لحاظ سے یہ معمولی کتاب نہ تھی لیکن میرزا کو اس کے ساتھ انتساب کس لیے گوارا نہ ہُوا؟ اس سلسلے میں بھی قیاس آرائی کے سوا چارا نہیں چناں چہ اب تک قیاس کی بنا پر مختلف وجوہ پیش کیے گئے ہیں مثلاً:

۱۔ غالب ''محرق'' کے مصنف کو لائق خطاب نہیں سمجھتے تھے لہٰذا انھوں نے جو رسالہ رد میں لکھا، اسے اپنے ایک شاگرد کے نام سے شائع کر دیا، جس طرح پہلے ''سوالات'' ایک فرضی نام سے شائع کر چکے تھے۔ میرزا نے نواب علائی کو ''محرق'' کے متعلق جو کچھ لکھا تھا، اس کے آغاز میں عرفی کا یہ مشہور شعر بھی لکھ دیا تھا۔

با من از جہل معارض شدہ نامنفعلی
کہ گرش ہجو کنم ایں بودش مدح عظیم

اس سے مذکورہ بالا وجہ کی مزید تصدیق ہوتی ہے اور یہ شعر خود لطائف میں بھی آیا ہے۔

۲۔ میاں داد خاں سیاح اہلِ دہلی کے لیے سراسر اجنبی تھے اور ان کی زبان سے منشی سعادت علی کے خلاف جو کچھ کہا جا سکتا تھا وہ میرزا غالب خود کہنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔

۳۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ کتاب کو کسی اور سے منسوب کر کے اپنے متعلق ستایش کے لیے زیادہ سے زیادہ گنجایش نکالی جا سکتی تھی۔

میرے نزدیک تیسری وجہ تو چنداں قابلِ التفات نہیں کیوں کہ کتاب کوئی بھی لکھتا، میرزا غالب کی ستایش میں ویسے کلمات ضرور استعمال کرتا جیسے ''لطائف غیبی'' میں موجود ہیں۔ البتہ پہلی دو وجہیں خاصی معقول معلوم ہوتی ہیں، تاہم میرے نزدیک ان کی حیثیت ثانوی ہے۔ کتاب دُوسرے کے نام سے شائع کرنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس میں نہ تو مباحث کا انداز علمی تھا نہ ''محرق'' کے ایک ایک اعتراض کا جواب دیا گیا تھا اور نہ کتاب کا اسلوب تحریر علمی تھا۔ بالکل یہی کیفیت ''سوالات عبدالکریم'' کی تھی۔ ان دونوں میں سرسری طور پر ''محرق'' کے خلاف چند اعتراضات کیے گئے تھے چوں کہ انھیں ''لطائف'' کی حیثیت دے دی گئی تھی۔ اس وجہ سے اسلوبِ تحریر میں مستقل علمی ثقاہت قائم نہ رہی اور میرزا غالب خاص اس مرحلے پر ایسی تحریر اپنے سے منسوب کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے تھے۔

کوئی علمی تحریر مرتب نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میرزا غالب ۱۸۶۲ء میں رام وثبور کا شکار ہو گئے تھے اور اس بیماری نے تین سال تک انھیں سخت پریشان و بدحال رکھا۔ اسی کا ذکر کرتے ہُوئے انھوں نے نواب کلب علی خاں مرحوم کو لکھا تھا:

> جنابِ قبلۂ حاجات! اس بلاکش نے
> بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس

یہ زمانہ ایسا تھا کہ نہ تو وہ اطمینان سے بیٹھ سکتے تھے اور نہ کچھ لکھ سکتے تھے۔ اس دور کے مکاتیب میں متواتر اس شدید مرض کی شکایتیں کی جاتی رہیں۔ ان کی تحریر میں جہاں کہیں تلخی کی شدت محسوس ہوتی ہے وہ دراصل ان رنج افزا عوارض ہی کا نتیجہ ہے اگرچہ ان کے عقیدت مندوں کی کمی نہ تھی بل کہ خاصی کثرت تھی تاہم فکر و نظر کے اعتبار سے یقیناً وہ یگانہ و تنہا تھے۔ انھوں نے سچ کہا تھا۔

ما ہمائے گرم پروازیم فیض از ما مجوی
سایہ ہمچوں دود بالا می رود از بالِ ما

پھر فرماتے ہیں:

رفتہ در حسرتِ نقشِ قدمے عمر بسر
جادۂ را کہ بہ سرِ منزلِ ما می آید

کوئی فرد ایسا نہ تھا جو اِن کا نقطۂ نگاہ ٹھیک سمجھ سکتا۔ پھر انھیں کے انداز میں اسے واضح کرسکتا۔ اس لیے انھیں ہر جسمانی زحمت کے باوجود سب کچھ خود کرنا پڑا اور جو بھی وہ لکھ گئے ہیں، اپنے دائرہ بحث ونظر میں اس کی امتیازی حیثیت سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔

لطائف کی تمہید:

کتاب کی تصنیف کے سلسلے میں ضروری امور کی توضیح کے بعد اب کتاب کے مطالب پر متوجہ ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ایک مختصر سے مضمون میں تمام مطالب پر تفصیلی بحث ممکن نہیں۔ کتاب کا خاصا حصّہ ’’محرق‘‘ کی غلط یا ناقص تحریر سے تعلق رکھتا ہے۔ یقیناً صاحبِ کتاب کو فارسی تحریر پر ویسی قدرت بھی حاصل نہ تھی جیسی منشی امین الدین نے ’’قاطع القاطع‘‘ میں یا میرزا رحیم بیگ نے ’’ساطع برہان‘‘ میں دکھائی اگرچہ امین الدین کا طریق تحریر عموماً سوقیانہ ہے لیکن منشی سعادت علی تو بے چارہ بالکل مبتدی معلوم ہوتا ہے۔ میں صرف چند لطائف کے متعلق سرسری گفتگو کروں گا۔ سب سے پہلے تمہید کی عبارت یہاں منّ وعَن درج کرتا ہُوں۔ اس سے بھی ’’محرق‘‘ کی حیثیت کے بعض پہلو بہ خوبی آشکارا ہو جائیں گے۔ لکھتے ہیں:

> ’’سیاحؔ بحر و بر ہیچ مدان بے ہنر سیف الحق میاں داد خاں حق شناسوں کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ میں رہنے والا اورنگ آباد دکن کا ہُوں۔ میں نے بعد تحصیلِ علوم رسمیہ سیاحت اختیار کی، بنگالہ، دکن، پنجاب، وسط ہند، بلاد وقریٰ کی۔ کہاں تک نام لوں۔ قلم رو ہند میں سرتا سر پھرا ہوں بل کہ سندھ و کابل وکشمیر وقندھار بھی دیکھ آیا ہُوں۔ ان دنوں میں دو رسالے نثر کے میری نظر سے گزرے: ایک ’’قاطع برہان‘‘ اور ایک ’’محرق قاطع برہان‘‘ پہلے نسخے یعنی ’’قاطع برہان‘‘ کا مؤلف ایک

شخص ہے معزز اور مکرم والا مرتبہ، عالی شان، عالی خاندان، انگریزی رئیس زادوں میں محبوب، بادشاہ دہلی کے حضور سے مخاطب بہ نجم الدولہ، دبیر الملک نظامِ جنگ یعنی غالب تخلص، اسد اللہ خاں بہادر اور ''محرق'' کا جامع کوئی شخص ہے رعایائے دہلی میں سے کہ کبھی کسی زمانے میں کسی محکمۂ انگریزی کا سررشتہ دار ہو گیا تھا اور اب خانہ نشین ہے، موسوم بہ منشی سعادت علی۔ نہ نثر سے واقف، نہ نظم سے آگاہ۔ نہ عقل کا سرمایہ، نہ علم کی دست گاہ۔ کسی بستی میں، کسی گانو میں، کسی گھاٹ پر، کسی باٹ پر، اس بزرگ کا نام کسی سے نہیں سُنا۔ اللہ اللہ! غالب نام آور نامدار! کوئی شہر ایسا نہ دیکھا جس میں ان کے دو چار شاگرد، دس بیس معتقد نہ دیکھے ہوں۔ ایک عالم ان کی فارسی دانی اور شیوہ بیانی کا معترف۔ نظم میں ظہوریؔ و نظیریؔ و عرفیؔ کے برابر، نثر میں نثارانِ سابق و حال سے بہتر، کلیات نظم نسخۂ سحر سامری نثر میں ''پنج آہنگ'' سلک دُرِ خوش آب، ''دستنبو'' گوہر نایاب ''مہر نیمروز'' غیرت آفتاب۔ ہر نکتہ کتاب، ہر کتاب ممتنع الجواب، جو بلاغت اور فصاحت کو جانتے ہیں اور معنی کا حسن پہچانتے ہیں، متفق علیہ ان کا عقیدہ یہی ہے اگر ایک آدمی کا عوام میں سے یہ عقیدہ نہ ہوا تو وہ آدمی بے شک ایک گروہ کا مردود ہو گا:

گر نہ بیند بہ روز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

''محرق'' کی عبارت، واہ کیا کہنا ہے! مبتدا کچھ، خبر کچھ، روابط نامربوط، ضمائر محذوف۔ اوّل سے آخر تک سوال دیگر، جواب دیگر کا التزام۔ عبارت یک قلم حشو اور حشو بھی قبیح۔ با ایں ہمہ وہ رسالہ سراسر بغض و عناد و سوء ظن و حمق و خبط و سبّ و فحش کا مجموعہ ہے۔ آیا خاطر میمون منشی صاحب میں کیا آیا جو اس رسالے کی تحریر کا قصد فرمایا۔ کتاب خوگیر، عبارت خوگیر کی بھرتی۔ جو اشعار بہ چشمداشت سند لکھے ہیں وہ زیر تنگ، زبر تنگ۔ سوار نابینا، مرکب کہنہ و لنگ۔ کتاب گدڑی، ہر فقرہ ٹکڑا، ہر ٹکڑے کا نیا رنگ۔ کیا منشی جی نے یہ قیاس کیا کہ تمام ہندوستان میں کوئی عالم، کوئی عاقل، کوئی مصنف نہیں ہے؟ اللہ اللہ ہندوستان مجمع فضل و کمال ہے۔ منشی جی کے

حمق کا پردہ کھل جائے گا بل کہ مولانا غالبؔ کا ایک ایک شاگرد منشی جی کا خاکہ اڑائے گا۔ مجھ کو تو حمیّت اور رعایتِ حق اس تحریر کی باعث ہوئی تاکہ میں نے بیس لطائف جمع کیے اور اس نگارش کا ''لطائف غیبی'' نام رکھا!

در پس آئنہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استادِ ازل گفت، بگو، می گویم''

تمہید کے سلسلے میں ایک دو باتیں عرض کر دینا ضروری ہے۔ میرزا نے ابتداء میں اپنی خاندانی بڑائی اور ناموری نیز منشی سعادت علی کی گمنامی کا ذکر جس انداز میں کیا ہے وہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ علم و فضل، ناموری یا رفعت خاندان سے مخصوص نہیں۔ جن بزرگوں نے ''من قال'' کے بجائے ''ما قال'' پر زور دیا، وہ اس بارے میں حقیقت سے بہ درجہا بہتر واقف تھے لیکن میرزا کے زمانے میں ان چیزوں کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ نیز میرزا نیرنگ روزگار کے بیسیوں عبرت افزا تماشے دیکھ چکنے کے باوجود خاندانی برتری کے اس طلسم سے نجات نہ پا سکے جو دراصل دورِ جاگیرداری کا گراں ترین سرمایہ تھا اور میرزا کو یہ سرمایہ وراثت میں ملا تھا اگرچہ جاگیر نہیں ملی تھی۔

خواجہ حافظ کا جو شعر تمہید کے آخر میں لکھا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سیف الحق سیاحؔ محض ایک پردے کا کام دے رہے تھے، ترانہ ریزیاں دراصل میرزا غالبؔ کی تھیں۔

سیاحؔ کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ سندھ و کابل و کشمیر و قندھار بھی دیکھ چکے تھے۔ ''سیر سیاح'' میں، جو سات سال بعد مرتب ہوئی سیاحؔ نے لکھا تھا کہ کشمیر نہیں دیکھا۔ کابل و قندھار بھی وہ یقیناً نہیں گئے۔ یہ بھی اس امر کی دلیل ہے کہ کتاب سیاحؔ کی نہ تھی، میرزا کی تھی جن کی معلومات سیاحؔ کے متعلق سرسری تھیں یا یہ سمجھ لیجیے کہ میرزا نے سیاحت کی اہمیّت بڑھانے کے لیے شاعرانہ مبالغے سے کام لیا۔

لطیفہ نمبر ۳:

''برہان قاطع'' میں ''آب چیں'' کے معنی یوں بیان کیے تھے کہ یہ اس کپڑے کو کہتے ہیں، جس سے مُردے کا بدن بعد غسل خشک کیا جاتا ہے۔ میرزا غالبؔ نے اس پر یہ اعتراض کیا تھا کہ مُردے کے بدن کو خشک کرنے کی قید بے جا ہے کیوں کہ ''آب چیں'' ہر اس کپڑے کو کہتے ہیں، جس سے جسم یا اس کا کوئی حصہ خشک کیا جائے۔ یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس بارے میں مغالطہ صرف مصنف ''برہان قاطع''

تک محدود نہیں، دُوسرے بھی اس میں مبتلا ہُوئے اور اس کا سرچشمہ فردوسی کا یہ مصرع ہے:

مدارم بہ مرگ آبچین و کفن

حالاں کہ یہ مصرع مفید معنی حصر نہیں۔

یہ بالکل معمولی بات تھی اور کوئی وجہ نہ تھی کہ کسی کی سمجھ میں نہ آتی لیکن ہر مخالف نے اس سلسلے میں میرزا غالب کی نہ صرف مخالفت ضروری سمجھی بل کہ یہ التزام بھی عاید کر دیا کہ میرزا غالب فردوسی کو مسلم الثبوت نہیں مانتے۔ اس باب میں ''لطائف'' کی عبارت کم وبیش دو صفحوں میں پھیلی ہُوئی ہے جس میں سے صرف ایک حصّہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''فردوسی شاعر تھا، فرہنگ نویس نہ تھا۔ مولانا غالب تخطیہ کرتے ہیں فرہنگ لکھنے والوں کے قیاس کا اور منشی جی اس کو فردوسی کا تخطیہ گمان کرتے ہیں۔ فقیر سیاح کے ایک بات یہاں خیال میں آئی ہے کہ محمد حسین دکنی فردوسی کے شعر کو نہ سمجھا اور منشی جی خان غالب کی نثر کے معنی اُلٹے سمجھے۔ غلط فہمی کی صفت بین الصاحبین مشترک ہوئی اور یہ بات ثابت ہے کہ دکنی استاد اور منشی شاگرد ہے اور یہ بھی متفق علیہ جمہور ہے کہ شاگرد بیٹے کی جگہ اور استاد باپ کی جگہ ہوتا ہے۔ پس اب چاہیے کہ اس مقام پر ہم الولد سر لابیہ کہیں اور منشی جی خوش ہو کر ہم کو سلام کریں اور لا ریب فیہ کہیں''۔
>
> (ص ۷)

معنی لفظ ''فراز'':

میرزا نے ''قاطع برہان'' کی ایک تنبیہ میں لکھا تھا کہ صاحب برہان قاطع فراز کو اضداد میں شمار کرتا ہے یعنی اس کے معنی دروازے کا بند کرنا اور کھولنا دونوں ہیں۔ خود میرزا نے لکھا تھا:

> ''فراز'' ضد ''نشیب'' است۔ چوں ہنگام بستن تختہ ہاے دراز ہر دو سو مرئی می شود و آں صورتِ بلندی است ہر آئینہ بستن در را در فراز کردن گویند چناں کہ سعدی گوید:
>
> بروے خود درِ طمّاع باز نتواں کرد
> چو باز شد بہ درشتی فراز نتواں کرد
>
> (''قاطع برہان'' ص ۵۴)

منشی سعادت علی نے ’’محرق‘‘ میں لکھا کہ ’’فرہنگ جہان گیری‘‘ کے مصنف کے مطابق ’’فراز‘‘ بارہ معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بعد مثال میں جتنے شعر پیش کیے ہیں۔ ان میں ’’فراز‘‘ بند کرنے کے معنی میں استعمال ہُوا ہے مثلاً:

جہاں پناہا ازیمنِ دولتت امروز
دہان عافیہ باز است و چشمِ فتنہ فراز
(کمال اسمٰعیل)

صنعت مکن کہ ہر کہ محبت نہ راست باخت
عشقش بروے دل درِ معنی فراز کرد
(حافظ)

چو مطرح ارچہ کہ افگندہ ایم و پے سپریم
بہ پشتیِ تو چو مسند شویم سینہ فراز
(کمال اسمٰعیل)

منشی سعادت علی نے لکھا تھا کہ آخری شعر میں ’’فراز‘‘ بہ معنی کشادہ استعمال ہوا ہے۔ میرزا غالبؔ فرماتے ہیں کہ ’’کشادہ‘‘ نہیں بل کہ ’’بلند‘‘ کے معنی میں استعمال ہوا ہے کیوں کہ مسند کی صفت کشادگی نہیں بل کہ بلندی ہی ہوتی ہے۔ مسند عالی و بلند، نہ کہ مسندِ مفتوح و کشادہ۔

خواجہ حافظ کا ایک شعر:

خواجہ حافظ کا ایک مشہور شعر ہے:

حضور مجلس انس است و دوستاں جمع اند
و ان یکاد بخوانید و در فراز کنید

ظاہر ہے کہ اس شعر میں ’’در فراز کنید‘‘ کے معنی یہ ہیں کہ دروازہ بند کر دو۔ میرزا غالبؔ نے ’’قاطع برہان‘‘ میں اس کی شرح کرتے ہوئے لکھا تھا:

’’نخست مجلس انس و مجمع احباب و حرکات دوستانِ بے تکلف را خاصہ در بزمِ شراب

> درضمیر نقش باید بست۔ سپس تواں فہمید کہ مجلس انس خلوتی است خالی از اغیار اگر ناگاہ بیگانہ بدیں چنیں انجمن در آید، ہمہ را عیش منغص و خاطر مکدر گردد مگر در ہجومِ عام جز گزند چشم زخم، بیم رنج دیگر نیست کہ آں را بہ خواندن ان یکاد از خود دفع کنند و در نکشایند تا ہمسائگاں و سوقیاں ہمہ گرد آیند و رسوای مجلسیاں تماشا کنند بل کہ سرہنگان و عسس و محتسب نیز در آیند و مستاں را بہ اسیری برند اگر گویند خواندن ان یکاد بہر چہ خواہد بود؟ گوئیم بہرِ دفع چشم زخم یک دیگر است کہ آں از چشم زخم بیگانگاں خطرناک تر است۔ پیر جہاندیدہ می فرماید کہ آفت اغیار بہ بستن در دفع کنید و بلای عین الکمال احباب را بہ خواندن ان یکاد بگردانید“۔
>
> (”قاطع برہان“ ص۵۴)

منشی سعادت علی نے اپنے اوپر لازم قرار دے لیا تھا کہ جو کچھ میرزا غالبؔ نے لکھا ہے، اس کی ضرور مخالفت کریں گے۔ اوّل وہ اس شعر کو مولانا جامی سے منسوب کرتے ہیں (”محرق“ ص۶) پھر فرماتے ہیں کہ ”درفراز کنید“ کے معنی ہیں دروازہ کھول دو اور دروازہ کھول دینے میں نکتہ یہ ہے کہ کوئی اس مجلس کی طرف آنکھ نہ اٹھائے اور اس کی جانب متوجہ نہ ہو اور جب تک وہ مجلس میں شریک ہو کر اس کے اقوال و افعال سے آگاہ نہ ہوگا، مجلس کی کیفیت اس پر کیوں کر آشکارا ہوگی!

میرزا ”لطائف غیبی“ میں فرماتے ہیں:

> ”اہل خرد سمجھیں گے کہ منشی جی کس بات پر اُلجھے ہیں۔ اتنا کیوں نہیں پہچانتے کہ جس گھر میں فسق و فجور کی مجلس ہو، اس کا دروازہ بند کر لیتے ہیں یا کھلا رہنے دیتے ہیں؟ قرینہ کیا چاہتا ہے اور اقتضائے مقام کیا ہے؟ یہاں ایک اور دقیقہ ہے۔ منشی جی تو خاک سمجھیں گے۔ میں ضیافت اہل علم و عقل کے واسطے تقریر کو بڑھاتا ہوں۔ ”درفراز کنید“ دروازہ کھول دو کے معنی جب دے گا کہ پہلے سے دروازہ بند ہوگا۔ پس اگر دروازہ بند تھا تو دوست کدھر سے آ گئے کہ بعد ان کے اجتماع کے افتتاح باب کا حکم صادر ہوتا ہے؟ بارے اس شعر میں بھی قرائن و دلائل ”درفراز کنید“ کے معنی یہی ثابت ہوئے کہ دروازہ بند کر دو“۔

سیرابی بیان:

لطیفہ نمبر ۸ میں فرماتے ہیں کہ منشی سعادت علی:

> ''نظیریِ زمانہ غالبؔ یگانہ سے اُلجھتے ہیں کہ تو نے ''سیرابی بیان'' کیوں لکھا؟ ''سیرابی'' نبات وحیوان انسان کے واسطے ہے نہ بیان کے واسطے۔ منشی جی فن استعارہ سے آگاہ نہیں ہیں۔ جو چاہیں سو کہیں۔ اس کے نظائر ہزار ہیں۔ منشی جی کو مقدمات کی مثلیں فراہم کرنے سے اور مستغثوں کے عرائض پر حکم چڑھانے سے فرصت کہاں ملی ہوگی کہ کتب کی سیر کی ہوگی۔ ''شگفتگی'' جبیں کی اور زمین شعر کی صفت پڑتی ہے حالاں کہ نہ جبیں پھول ہے نہ شعر کی زمین۔ منشی جی! تمھیں اپنے ایمان کی قسم، شاعر کو رنگین بیان کہیں لکھا دیکھا ہے تو اس کو جائز رکھا ہے یا نہیں؟ پس اگر ''رنگینیِ بیان'' جائز ہے تو ''سیرابی'' بھی جائز ہے۔ بقول تمھارے ''بیان'' نہ سبزہ ہے، نہ جانور، نہ آدمی، پھر سیراب کیوں کر ہُوا؟ اسی طرح ''بیان'' نہ پھول ہے، نہ رنگا ہوا کپڑا، پھر رنگین کیوں کر ہُوا؟ بیان کی خوبی کی صفت ہے۔ ''رنگینی'' بھی اور ''سیرابی'' بھی۔ اغلب ہے حضرت غالبؔ مغلوب الغضب ہیں۔ دکنی کی ایسی ہی پریشاں بیانیوں پر غصہ آ گیا ہے تب اس کی تحمیق میں کلماتِ سخت کہے ہیں''۔
>
> (ص ۱۸)

ایک بنیادی نکتہ:

مولانا ابوالکلام آزادؔ مرحوم و مغفور نے میری کتاب ''غالب'' پر توضیح یا تصحیح کے سلسلے میں جو عبارتیں رقم فرمائی تھیں ان میں ایک عبارت ''قاطع برہان'' کی بحث پر بھی تھی۔ مولانا نے لکھا تھا:

> ''واقعہ یہ ہے کہ میرزا غالبؔ نے یہ چند اجزا (قاطع برہان) لکھ کر علم و تحقیق کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ افسوس کہ خواجہ حالیؔ نے اس بحث کو زیادہ تفصیل سے نہیں لکھا...... ''برہان قاطع'' کے جو خرافات انھوں نے نقل کیے ہیں، انھیں پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اہل علم و بصیرت میں سے کوئی کیوں کر ان کی تائید کر سکتا ہے؟ مگر مصیبت یہ ہے کہ سارا معاملہ ایک طرح کا منطقی مصادرہ تھا۔ اعتراض ہندی لغت

نویسوں پر تھا اور ہندی لغت نویسوں ہی کا کلام بہ طور دلیل پیش کیا جاتا تھا''۔

''لطائف غیبی'' میں بھی اس قسم کے اشارے ملتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''بات یہ ہے کہ فارسی دانانِ ہند محقق نہیں ہیں، مقلد ہیں۔ اکثر تو قتیلِ بے سرمایہ کے پجاری ہیں۔ اس کی تالیفات کو آنکھ کی پتلی بنائے ہوئے ہیں۔ جو بلند پرواز ہیں وہ ''برہان قاطع'' کو عرش المعرفت جانتے ہیں اور اس کے اقوال کو مانتے ہیں۔ پس جب کوئی محقق حق و باطل کا ممیز ہو اور دکنی کے اغلاط ظاہر کرے تو وہ حضرات طیور آشیاں گم کردہ کیوں نہ بن جائیں؟ جب ان کا ماخذ تباہ ہو گیا تو اب سند کس کو ٹھہرائیں؟ جس میں دو صفات ثبوتی جمع ہوں گی، یعنی حقیقت زبان فارسی سے آگہی اور انصاف کا ملکہ، مع ہذا یہ دو صفتیں سلبی بھی معاً موجود ہوں گی، یعنی مُردہ پرست نہ ہوگا اور حسد پیشہ نہ ہوگا وہ تو غالبؔ کی قدر جانے گا اور اس محقق مدقق کے قول کو مانے گا اور ایسے لوگ دنیا میں کم ہوں گے۔ پس اس صغریٰ اور کبریٰ کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت غالبؔ کے منافقین و منکرین ہزار دو ہزار پیدا ہو جائیں گے۔ ہر چند اہل حق انھیں سمجھائیں گے لیکن وہ انکار سے باز نہ آئیں گے۔ جہل مرکب کا علاج محال ہے علم عربی کی قوت سے فارسی دانی محض وہم و خیال ہے''۔
>
> (ص ۳۳-۳۴)

میرزا غالبؔ کا استاد:

محض محرق قاطع نہیں بل کہ بعض دُوسرے اصحاب نے بھی ہرمزد یعنی ملا عبدالصمد کو میرزا غالبؔ کا استاد ماننے سے انکار کیا تھا حالاں کہ اس کے لیے کوئی قابلِ توجہ دلیل موجود نہ تھی۔ لطائف غیبی کے لطیفہ ۱۵ میں لکھتے ہیں کہ منشی سعادت علی کے نزدیک اس استاد کا وجود خارجی نہیں تھا۔

> ''ہاں سچ ہے، وہ ایسا وجود خارجی نہیں رکھتا تھا کہ ناصبی کے ساتھ مترادف بالمعنی ہو۔ ساسان پنجم کی اولاد میں سے رہنے والا یزد کا ایک امیر زادۂ جلیل القدر، جس نے پچاس برس علمائے عرب و بغداد سے علوم عربیہ حاصل کیے، پھر ہندوستان میں تشریف لایا، حضرت غالب سے ملا اور دو برس ان کا مہمان رہا۔ اس کو منشی جی کس دلیل سے جُھوٹ کہتے ہیں؟ نجم الدولہ جُھوٹ نہ بولیں گے مگر ہاں بہ موجب اس مصرع کے:

کاذب ہمہ را بہ کیش خود پندارد

> منشی جی جیسے آپ ہیں، ویسا اور کو بھی سمجھتے ہیں۔ مخالفین مذہب اسلام اس طریق کو جھوٹا جانتے ہیں اور وہ از روی شمار لاتعد ولاتحصی ہیں۔ عیاذاً باللہ! کیا اس اجماع سے مذہب اسلام باطل ہوا جاتا ہے‘‘۔ (ص ۳۵)

ہمارے زمانے میں بھی ایک مشہور صاحب علم و تحقیق نے ملاّ عبدالصمد کے وجود خارجی سے انکار فرمایا تھا اور ایسی دلیلیں پیش کی تھیں جنھیں دیکھ کر بار بار تعجب ہوتا تھا۔ مثلاً یہ کہ ’’قاطع برہان‘‘ کی طباعت تک کبھی عبدالصمد کا نام نہ سُنا گیا یا خواجہ حالی نے لکھا ہے کہ کبھی کبھی میرزا کی زبان سے سُنا گیا چوں کہ لوگ مجھے بے استادا کہتے تھے اس لیے ایک فرضی استاد تجویز کر لیا حالاں کہ خواجہ حالی اس روایت کے باوجود عبدالصمد کے وجود کے معترف تھے یا مثلاً پروفیسر عبدالغفور شہباز کی ’’حیات بے نظیر‘‘ میں حکیم غلام رضا خاں کا ایک مکتوب دیکھ لیا، جس میں موصوف نے فرمایا تھا کہ میرزا نے اپنا فارسی یا اُردو کلام کسی کو نہ دکھایا اور عبدالصمد کا وجود ذہن میں تھا، خارج میں نہ تھا۔ گویا اس دنیا کے ہر انسان کا قول لازماً بلاسند بھی قبول کر لینا چاہیے اور میرزا کے دعوے کو ضرور غلط ماننا چاہیے۔ میں اس موضوع پر الگ تفصیلاً لکھنا چاہتا ہوں لیکن یہاں صرف اتنا عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ اہل تحقیق کو فیصلے میں عجلت نہ کرنی چاہیے۔ ملاّ عبدالصمد یقیناً میرزا کا استاد تھا اگرچہ میرزا نے اس سے استفادے کا جو تصور قائم کر رکھا تھا، اس کی حیثیت کچھ ہی ہو اور اگرچہ خود ملاّ عبدالصمد کے علم فارسی کے متعلق وہ رائے درست نہ مانی جائے جو میرزا غالب نے چودہ سال کی عمر میں قائم کی تھی۔ خواجہ حالی اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ دونوں عبدالصمد کے وجود خارجی کے مصدّق ہیں۔ البتہ یہ بالکل درست ہے کہ میرزا نے فارسی یا اُردو شعر کسی اُستاد کو نہ دکھائے اور عبدالصمد بھی ان اساتذہ سے مستثنیٰ نہیں۔ شعر میں استاد کی نفی کا مطلب یقیناً یہ نہیں کہ سمجھ لیا جائے، میرزا نے کسی سے تعلیم پائی ہی نہ تھی۔

میرزا کی ایک خصوصیّت:

’’قاطع برہان‘‘ کی نثر کے متعلق مخالف بھی معترف ہیں کہ اس کا جواب ممکن نہیں اگر غور سے دیکھا جائے تو ’’لطائف غیبی‘‘ کی نثر کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ افسوس کہ اب تک اس کا مطالعہ بہت کم اصحاب نے کیا۔ غالباً اس وجہ سے کہ کتاب صرف ایک مرتبہ تھوڑی سی تعداد میں چھپی،

پھر اسے چھاپنے کی نوبت نہ آئی۔ جس امر پر میں بہ طورِ خاص زور دینا چاہتا ہوں، یہ ہے کہ میرزا کو ہر معاملے کی توضیح و تشریح میں ایک خاص ملکہ حاصل تھا۔ وہ عبارت ایسے انداز میں لکھتے تھے کہ جو کچھ ان کے ذہن میں ہو، وہ بعینہٖ دوسرے کے ذہن میں پیوست ہو جائے۔ پھر عبارت میں بلیغانہ ایجاز اور جامعیّت ہے ایسا اسلوبِ تحریر لغت نگاری کے لیے حد درجہ موزوں تھا۔ میں نے فارسی اور اُردو کے جتنے بھی لغت اب تک دیکھے، ان میں سے بہ استثنائے چند کوئی بھی ایسا نہ پایا جو اسلوبِ تحریر یا فہم و تفہیم لغت کے اعتبار سے قابلِ توجہ ہو۔ لغت وہی لکھ سکتا ہے جسے ہر لفظ کے مواقعِ استعمال پر پورا عبور ہو اور وہ ہر موقع کی توضیح مناسب و موزوں عبارت میں کر سکے۔ میں اس سلسلے میں مثالیں پیش کرنا چاہتا تھا لیکن مضمون بہت لمبا ہو گیا ہے اس لیے مجبوراً اسے ختم کرتا ہوں۔ اِن شاء اللہ کسی دوسری فرصت میں اس پر تفصیل سے بحث کروں گا۔

سیرِ سیّاح:

میاں داد خاں سیّاح کی کتاب کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ وہ کتاب آج کل بہت کم یاب ہے اور اس میں سیّاح کے کچھ حالات بھی آ گئے ہیں جو میرے علم کی حد تک منظرِ عام پر نہیں آئے۔ ان حالات کا خلاصہ یہاں پیش کر دینا چاہتا ہوں۔ اغلب ہے، یہ خوانندگانِ کرام کے علم میں اضافے کے موجب ہوں۔

جنوری ۱۸۷۱ء میں میر غلام بابا خاں رئیسِ اعظم سورت کے بچّوں کی تقریبِ ختنہ تھی، جس میں منشی نول کشور کو بھی دعوت دے کر بلایا گیا تھا چناں چہ منشی نول کشور صاحب وہاں پہنچے اور سیّاح سے خوب صحبتیں رہیں جن سے غالباً پہلے بھی شناسائی تھی۔ وہیں منشی صاحب نے سیّاح سے عہد لیا کہ کشمیر آپ نے نہیں دیکھا جولائی میں آئیں تو اکٹھے کشمیر چلیں گے۔ سیّاح جولائی کے بجائے ۱۲ اگست کو سورت سے روانہ ہوئے۔ پہلے نواب سچین کے ہاں ٹھہرے، پھر بمبئی میں منشی نول کشور کے ایجنٹ میر ابن حسن کے ہاں قیام کیا۔ ۱۵- اگست کو بمبئی سے ریل میں سوار ہو کر ۱۷ کو کانپور پہنچے۔ مطبع نول کشور میں گئے تو معلوم ہُوا کہ منشی صاحب انتظار کرتے کرتے مایوس ہو کر ایک قافلے کے ساتھ کشمیر چلے گئے۔ سیّاح کو بڑا قلق ہوا مگر عجیب اتفاق یہ ہُوا کہ بارشوں کی کثرت سے ٹرین رُک گئی اور اسی رات منشی نول کشور رات کے ۱۰ بجے قافلے کے ساتھ واپس آ گئے۔ غرض کشمیر کی سیر کا موقع تو باقی نہ رہا لیکن سیّاح کی خاطر تواضع اس پیمانے پر ہُوئی کہ اس کا بیان ایک افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ شاہ میر خاں عرف منجھلے صاحب کو سیّاح کی رفاقت کے لیے مقرر کر دیا گیا۔ وہ لکھنؤ پہنچے۔ اکثر اکابر اور اہلِ علم سے ملاقاتیں کیں۔ اکابر میں سے خاص طور پر قابلِ ذکر

راجا محمد امیر حسن خاں رئیس محمود آباد ہیں جنھوں نے سواری بھیج کر سیاؔح کو اپنے ہاں بلایا اور چار روز ٹھہرائے رکھا۔ وہیں راجا صاحب کے خالہ زاد بھائی نواب راحت علی خاں سے ملاقات ہوئی۔ ان کے علاوہ سیاؔح نے لکھنؤ میں جن لوگوں سے ملاقات کا ذکر کیا ہے، ان میں سے چوبے گنیش پرشاد وکیل عدالت، منشی رام پرشاد مدار المہام محسن الدولہ اور ان کے داروغہ عباس علی قابلِ ذکر ہیں۔ متعدد طوائفوں کے گانے سُنے۔ بیچ میں سیاؔح نے چند روز آگرہ، سکندرہ، دہلی اور میرٹھ میں گزارے۔ دہلی میں قربان علی بیگ سالک، خواجہ بدر الدین خاں مترجم "بوستان خیال" میرزا محمد حسن خاں عرف چھوٹے میرزا، حکیم محمود خاں، حکیم محمد رضا خاں، سید فخر الدین، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ، میرزا حسین علی خاں ابن عارف سے بھی ملاقاتیں ہُوئیں اور غالب کے مزار پر جا کر فاتحہ بھی پڑھی۔ میرٹھ میں محمد وجاہت علی خاں مہتمم "اخبار عالم" سے ملاقات منظور تھی۔

سیاؔح دوبارہ لکھنؤ پہنچے تو سخت بیمار ہو گئے۔ منشی نول کشور نے علاج کے لیے طبیب بھی مقرر کیے۔ وید بھی اور ڈاکٹر بھی۔ منشی جی کی مہمان نوازی کے متعلق سیاؔح کی عبارت پہلے نقل ہو چکی ہے، لکھنؤ میں مشاعرہ بھی ہُوا تھا جس میں متعدد شعرا نے حصّہ لیا۔ سیاؔح نے اس مشاعرے کی تمام غزلیں بہ ترتیب حروف تہجّی مرتب کر دی تھیں اور اس کا تاریخی نام "سورت شاعراں" رکھا تھا۔ سورت بہ معنی شرف و منزلت۔ اس سے ۱۲۸۸ھ تاریخ نکلتی ہے۔ لکھنؤ سے کانپور آئے تو وہاں بھی مشاعرے کا انتظام کر لیا گیا تھا لیکن رمضان شریف شروع ہو جانے کے باعث مشاعرہ نہ ہو سکا جن شعرا نے اس کے لیے غزلیں کہہ لی تھیں، ان سے کلام لے کر دوسرا مجموعہ مرتب کر دیا گیا۔ یہ دونوں مجموعے مع اوراق نثر سیاح "سیر سیاح" کے نام سے طبع ہُوئے۔ کتاب کی ضخامت ۶۶ صفحے تھی۔ سیاح ۱۷ نومبر کو کانپور سے روانہ ہُوئے۔ الہ آباد میں میر ظہور حسین وکیل ہائیکورٹ کے ہاں دو روز ٹھہرے پھر بمبئی پہنچے اور ایک رات ٹھہر کر میرے اندازے کے مطابق ۲۳ یا ۲۴؍ نومبر ۱۸۷۱ء کو وارد سورت ہُوئے۔

(اردوئے معلّٰی۔ دہلی یونیورسٹی شمارہ ۲، ۳،
غالبؔ نمبر حصہ دوم۔ جلد دوم)

پنج آہنگ

''پنج آہنگ'' میرزا غالبؔ کے کلیات نثر فارسی کی پہلی کتاب ہے جو پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول مکتوب نگاری کے القاب و آداب، حصہ دوم فارسی زبان کے مصادر، مصطلحات اور لغات، حصہ سوم میرزا غالبؔ کے دیوان سے منتخب اشعار جنھیں مختلف مطالب کے لیے مکاتیب میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ حصہ چہارم مختلف کتابوں کے مقدمے یا تقریظیں اور عام نثریں، حصہ پنجم میرؔزا کے فارسی مکاتیب۔

اس کتاب کے ابتدائی تین آہنگوں یا حصّوں کا آغاز ۱۸۲۵ء میں ہوا تھا۔ جب انگریزوں نے بھرت پور کے خلاف یورش کی تھی اور اس یورش میں نواب احمد بخش خاں والیٔ فیروز پور جھرکہ کی فوج بھی شامل تھی۔ میرزا غالبؔ اور ان کے برادر نسبتی میرزا علی بخش خاں بھی نواب احمد بخش کے ساتھ بھرت پور گئے تھے۔ معلوم ہے کہ میرزا کو عسکری معاملات سے براہِ راست کوئی دل چسپی نہ تھی، اغلب ہے وہ اس زمانے میں فیروز پور جھرکہ گئے ہوں اور میرزا علی بخش کے اصرار پر محض سیر وتفریح کے خیال سے معیت اختیار کر لی ہو یا آگرہ جانا چاہتے ہوں اور فوج کے ساتھ بھرت پور چلے گئے۔ پھر آگرہ ہوتے ہوئے دہلی آئے۔ خود میرزا غالبؔ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب احمد بخش خاں میرؔزا کو چارلس مٹکاف سے ملانے کے خواہاں تھے۔ اس اثنا میں بھرت پور کا معاملہ پیش آ گیا اور مٹکاف کو بھرت پور جانا پڑا۔ نواب بھی ساتھ گئے اور میرؔزا کو بھی لے گئے۔

بھرت پور پر ۲ یورشیں:

میرؔزا نے پنج آہنگ کے دیباچے میں اسے ۱۲۴۱ھ (۱۶ اگست ۱۸۲۵ء۔ ۵ اگست ۱۸۲۶ء) کا واقعہ قرار دیا ہے۔ ۱۸۲۵ء میں بھرت پور کے خلاف انگریزوں نے دو مرتبہ یورش کی۔ پہلی مرتبہ سر ڈیوڈ آکٹرلونی (جنھیں ہندوستانی لونی اختر کہتے تھے) کے زیر اہتمام ماہ مئی میں اس یورش کو لارڈ ایمہرسٹ گورنر جنرل نے منسوخ کر دیا۔ آکٹرلونی استعفا دے کر میرٹھ پہنچ گیا اور وہیں تھوڑی دیر بعد اس

نے وفات پائی۔ چارلس مٹکاف کے زیرِ اہتمام دسمبر ۱۸۲۵ء میں دوبارہ یورش کی گئی اور ۱۶۔ جنوری ۱۸۲۶ء کو بھرت پور کا فیصلہ ہو گیا۔ اس یورش کا سالار کامبرمئر تھا۔ میرزا غالبؔ کے بیان سے واضح ہے کہ وہ پہلی یورش میں نہیں بل کہ دوسری یورش میں فوج کے ساتھ گئے تھے اور یہ اس بنا پر بھی درست ہے کہ پہلی یورش شوال ۱۲۴۰ھ (مئی ۱۸۲۵ء) ہی میں ختم ہو چکی تھی اور میرزاؔ کا سفر بھرت پور ۱۲۴۱ھ کا ہے۔

پہلے تین حصے:

میرزاؔ فرماتے ہیں کہ اس یورش میں میرزا علی بخش خاں اور میں ہم سفر تھے۔ رات ایک خیمے میں گزارتے تھے۔ علی بخش خاں نے فرمایش کی کہ مکتوب نگاروں کے لیے ایک ایسا دستور العمل تیار کر دیا جائے جس میں متعارف القاب و آداب درج ہوں۔ ساتھ ساتھ مضامین مکاتیب کی مناسبت کے مطابق شکر و شکوہ اور شادی و غم کے متعلق موزوں فقرات لکھ دیے جائیں۔

اگر چہ میرزاؔ کی طبیعت اور روش کو اس فرمایش سے چنداں مناسبت نہ تھی لیکن علی بخش خاں کے پاسِ خاطر سے وہ اسے پورا کرنے کے لیے تیار ہو گئے اور تین روز میں آہنگِ اوّل پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ دُوسرے اور تیسرے آہنگ کی ترتیب میں بھی زیادہ وقت صرف نہ ہوا ہوگا۔ آہنگ سوم میں میرزا نے چُنے ہوئے اشعار پر جو عنوان لکھ دیے ہیں ان سے اشعار کے مطالب و معانی کا زیادہ سے زیادہ اندازہ ہو سکتا ہے۔

ترتیبِ کتاب میں رکاوٹ:

تسخیرِ بھرت پور کے بعد کتاب کی ترتیب رُک گئی۔ میرزا غالبؔ کو خاندانی پنشن کے متعلق چارہ جوئی کے لیے کلکتہ جانا پڑا۔ نواب احمد بخش خاں ریاست کا کاروبار اپنے فرزندِ اکبر نواب شمس الدین احمد خاں کے حوالے کر کے گوشہ نشین ہو گئے اور ۱۸۲۷ء میں واصلِ بحق ہوئے۔ نواب شمس الدین احمد خاں اور خاندان کے دوسرے افراد کے درمیان شدید تنازعات کا آغاز ہوا۔ میرزا علی بخش خاں دہلی سے نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ پہلے لکھنؤ، پھر جے پور چلے گئے لیکن اطمینان کی کوئی صورت پیدا نہ ہُوئی۔ وہ خود کہتے ہیں یہ عمر ناکامی میں بسر کی۔

۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو دہلی کا انگریز ریذیڈنٹ ولیم فریزر مارا گیا۔ اس قتل کے الزام میں نواب شمس الدین احمد خاں بھی ماخوذ ہوئے اور انھیں ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو پھانسی کی سزا دے دی گئی۔

تکمیل ترتیب:

یہ ہنگامہ ہو چکا تو علی بخش جے پور سے دہلی پہنچے۔ اس زمانے میں میرزا غالبؔ کا فارسی دیوان ''میخانۂ آرزو'' کے نام سے مرتب ہو چکا تھا اور میرزا نے اس کے آغاز و اختتام کی نثریں بھی لکھ دی تھیں جواب مطبوعہ فارسی کلیات نظم میں موجود ہیں۔ علی بخش نے یہ نثریں میرزا سے پڑھیں۔ پھر انھیں خیال پیدا ہوا کہ میرزاؔ کی تمام فارسی نثریں جمع کر لینی چاہئیں۔ حکیم رضی الدین حسن خاں بھی اس ضروری کام کو مکمل کر دینے کی تحریک فرماتے رہے۔ میر محمد حسین خاں نثر خوانی میں علی بخش کے ہم سبق رہ چکے تھے۔ انھوں نے بھی نثروں کی فراہمی پر زور دیا۔ علی بخش کو یہ خیال بھی رہا کہ میرزا غالبؔ کی فارسی تحریرات جمع ہو جائیں گی تو غلام فخر الدین خاں (ابن علی بخش خاں) ان کے مطالعے سے فائدہ اٹھا سکے گا۔ یوں کتاب کی ترتیب از سرِ نو شروع ہو گئی۔

دو چھاپے:

غرض آہستہ آہستہ متفرق نثریں جمع ہو گئیں جن سے آہنگ چہارم تیار ہوا۔ میرزاؔ کے جتنے فارسی مکاتیب کی نقلیں مہیا ہو سکیں، انھیں آہنگ پنجم میں رکھ دیا گیا۔ اس طرح زیادہ تر علی بخش خاں کی فرمایش اور کوشش سے اس کتاب کی تدوین کا سروسامان ہوا جس سے ہم بنام ''پنج آہنگ'' متعارف ہیں لیکن تدوین کے بعد بھی کم و بیش بارہ تیرہ سال تک اس کی طباعت و اشاعت کا بندوبست نہ ہو سکا۔

یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۳؍رمضان ۱۲۶۵ھ (۱۲ اگست ۱۸۴۹ء) کو قلعہ معلّٰی کے مطبع سلطانی میں چھپ کر شایع ہُوئی۔ اس کے چار سو ترانوے صفحے تھے اور چار روپے قیمت رکھی گئی تھی۔ تصحیح و طباعت کا ذمہ عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں نے اٹھایا تھا۔ اس اشاعت کے کسی نسخے کا مجھے اب تک علم نہ ہو سکا۔ دوسری مرتبہ منشی نور الدین نے اسے اپنے مطبع دار السلام (واقعہ حوض قاضی) میں چھاپا۔ یہ اپریل ۱۸۵۳ء کا واقعہ ہے۔ اس چھاپے کا ایک نسخہ رام پور کے کتب خانے میں اور ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے۔

ناقص اور غلط:

ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ پہلی مرتبہ ''پنج آہنگ'' کتنی چھاپی گئی تھی۔ قیاس یہ ہے کہ پانسو سے زیادہ نسخے طبع نہ ہوئے ہوں گے تاہم یہ نسخے گرانیِ قیمت کے باوجود تین سال میں فروخت ہو گئے لہٰذا اسے

دوسری مرتبہ چھاپنے کی نوبت آئی۔ اغلب ہے اس وقت تک میرزا کے پاس مزید فارسی خطوط فراہم ہو گئے ہوں اور پنج آہنگ کے دوسرے چھاپے کی ضخامت کسی قدر بڑھ گئی ہو۔

میرزا نے اُردو مکاتیب میں ان طباعتوں کا ذکر دو مرتبہ کیا ہے۔ وہ صاحب عالم مارہروی کو ۱۸۶۱ء میں لکھتے ہیں کہ چھاپے کی پنج آہنگیں اب بھی بکتی ہیں اور معیوب بہ دو عیب ہیں۔ اوّل یہ کہ بعد از انطباع نثر جو کچھ تحریر ہوا، وہ اُن میں نہیں۔ دوسرے غلط بے حد ہیں۔

> کاپی نویس نے وہ اصلاح میری نثر کو دی ہے کہ میرا جی جانتا ہے اگر کہوں کوئی سطر غلطی سے خالی نہیں تو اغراق ہے۔ بے مبالغہ یہ ہے کہ کوئی صفحہ اغلاط سے خالی نہیں۔

اس سے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ شاید حکیم غلام نجف خاں نے تصحیح کا پورا اہتمام نہ کیا ہو لیکن میرزا شیو نرائن آرام کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> پنج آہنگ تم نے مول لی اچھا کیا۔ دو چھاپے ہیں، ایک بادشاہی چھاپے خانے کا اور ایک منشی نورالدین کے چھاپے خانے کا۔ پہلا ناقص ہے اور دوسرا سراسر غلط ہے۔

ظاہر ہے کہ جو کتاب مطبع سلطانی میں چھپی تھی، اس میں غلطیاں نہ تھیں یا سمجھ لیجیے کچھ زیادہ غلطیاں نہ تھیں البتہ مکاتیب کم تھے یا جو نثریں ۱۸۴۹ء اور ۱۸۵۳ء کے درمیان لکھی گئیں یا فراہم ہوئیں وہ اس میں شامل نہ تھیں۔ اس کے خلاف مطبع دار السلام کا نسخہ بہت غلط چھپا تھا اگرچہ پہلی طباعت کے نسخے کے مقابلے میں زیادہ مکمل تھا۔

پنج آہنگ کا اشتہار:

پہلی طباعت کا اشتہار دہلی کے اخبار ‘‘فوائد الناظرین’’ میں ۳ ستمبر ۱۸۴۹ء کو پہلے صفحے پر چھپا تھا۔ اسے بہ طور تبرک ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

> ‘‘فارسی دانانِ زبان کو مژدہ ہو کہ ان دنوں میں مجموعہ نثر ہائے رنگا رنگ مسمیٰ بہ ‘‘پنج آہنگ’’ از نتائج طبع افصح الفصحا و ابلغ البلغا حضرت مولانا جناب میرزا اسد اللہ خاں بہادر مدظلہ، بہ تصحیح و ترتیب والا شان، عالی خاندان، عظیم الخلق، عمیم الاحسان عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں بہادر بیچ مطبع سلطانی کے طبع ہو کر طیار ہے اور یہ کتاب

کاغذ ولایتی پر بہت خوش خط نستعلیق چھپی ہے اور صفحے اس نسخۂ متبرک کے ۴۹۳ ہیں قیمت اس کی چار روپے مقرر ہے۔ جس کسی صاحب کو خریداری اس کتاب کی منظور ہو ایک درخواست مع زرِ ثمن کے نزد جناب حکیم صاحب ممدوح یا نزد خاک سار اِرسال فرمادیں، کتاب مذکورہ فوراً ارسال خدمت ہوگی''۔

خاک سار سے مقصود ''فوائد الناظرین'' کا ایڈیٹر ہے۔

('آج کل'۔ دہلی۔ فروری ۱۹۵۸ء)

حصّہ دوم۔ غالبؔ کا فکر و فن

غالب کی شاعری (۱)

شعرِ غالب نبود وحی و نگوئیم ولی
تو و یزداں نتواں گفت کہ الہامی ہست

میرزا غالب کی زندگی اور شاعری کے متعلق اتنی کتابیں، رسالے اور مقالے لکھے جا چکے ہیں کہ اُردو اور فارسی کے شاعروں میں سے شاید ہی کسی کے ساتھ اتنا اعتنا کیا گیا ہو۔ ایک علامہ اقبالؔ کو غالباً مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ اب بھی میرزا کی شاعری کے بعض پہلو مزید غور و توجہ کے محتاج ہیں اور جس حد تک مجھے علم ہے (بے تکلف اعتراف کر لینا چاہیے کہ وہ بہت محدود ہے)۔ کہہ سکتا ہوں کہ ان پر اگر کچھ لکھا گیا ہے تو وہ بہت کم ہے۔

ان میں سے ایک پہلو کا ذکر میں نے ’’ماہِ نو‘‘ کے گزشتہ ’’غالب نمبر‘‘ میں سرسری طور پر کیا تھا یعنی میرزا غالب کے جو شعر پیش تر کے اساتذہ سے استفادے یا ’’توارد‘‘ کے تحت آتے ہیں ان کی چھان بین کی جائے اور جائزہ لیا جائے کہ آیا میرزا نے سابقہ مضامین میں کوئی خاص اضافہ کیا جس سے ان کا حسن پوری طرح نکھر گیا؟ خواہ وہ اضافہ نفسِ مضمون میں ہو یا بیان میں۔ میں نے چند مثالیں بھی دی تھیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اصل معاملے کا دامن زیادہ وسیع ہے اور میرزا کے کلام سے شغف رکھنے والوں کی خدمت میں مؤدبانہ التماس ہے کہ وہ اس سلسلے میں غور و تحقیق کا قدم آگے بڑھائیں۔

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جو مضامین و مطالب کلیاتِ فارسی اور دیوانِ اُردو دونوں میں موجود ہیں، ان کا موازنہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ کیا فارسی کے مضامین اُردو میں یا اُردو کے مضامین فارسی میں بعینہٖ لے لیے یا ان میں کچھ اضافہ کیا؟ ایک دوسرے کا ترجمہ ہے یا کسی ایک میں زیادہ وضاحت، زیادہ حسن اور زیادہ دل آویزی پیدا کر دی ہے؛ اس ضمن میں یہ اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ اصل مضمون کے لیے فارسی کا قالب زیادہ موزوں رہا یا اُردو کا؟

خود اُردو میں بعض اشعار بہ لحاظ نفسِ مضمون مترادف ہیں، اگرچہ اسلوبِ بیان ایک نہیں۔ ان پر

الگ غور کرنا چاہیے مثلاً:

۱۔ دریاے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

۲۔ بقدرِ حسرتِ دل چاہیے ذوقِ معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو

یا

۱۔ وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجیے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

۲۔ قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

۳۔ لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

میرزا کی شاعری کے اس پہلو پر غور وتدبر یقینی منفعت بخش ہوگا۔

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ میرزا کے بعض اشعار پر ایک سرسری سی نظر ڈالتے ہوئے ایسا تاثر قبول کر لیا گیا جو صحیح نہ تھا یا کم از کم اس کا دوسرا پہلو بالکل نظر انداز کر دیا گیا مثلاً میرزا کا ایک مشہور شعر ہے:

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آئے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

یہ شعر عموماً میرزا کی قنوطیت کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے اگر مزید غور کیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ میرزا نے اس میں قنوطیت کا اظہار نہیں کیا بل کہ ایک معاملے کے دو پہلو پیش کیے ہیں تاکہ اہلِ نظر دونوں کو سامنے رکھیں۔ ابر کے دامن میں وہ پانی بھی ہوتا ہے جو کھیتوں، فصلوں اور باغوں کے لیے

آبِ حیات ہے، بجلی بھی ہوتی ہے جو سب کچھ جلا کر راکھ بنا دیتی ہے۔ اسی طرح یہاں کی مختلف چیزوں کے دو ہی پہلو ہیں جو متضاد نظر آتے ہیں۔ حقیقت شناس وہ ہے جو دونوں پہلوؤں کو یکساں پیشِ نظر رکھے۔ نہ ابر کی آب رسانی کے جوشِ شادمانی میں بجلی کی تباہ کاری سے اعراض کرے اور نہ بجلی کی دہشت انگیزی سے ہراس زدہ ہو کر ابر کے فیضان سے استفادے کا رشتہ کاٹ دے۔ اسے چاہیے کہ خیر سے فائدہ اٹھائے اور شر سے محفوظ رہنے کے لیے تمام ممکن تدبیروں پر عمل پیرا رہے۔

ہم کیوں سمجھیں کہ میرزا نے یہاں قنوطیت کا اظہار کیا ہے اور ان کی نظر اچھی چیزوں میں بھی برے پہلو پر رہتی ہے؟ کیوں یہ نہ سمجھیں کہ انھوں نے دنیا کو بصیرت کی دعوت دی ہے؟ یعنی انسانوں کو صرف اچھے پہلو ہی پر قانع نہ رہنا چاہیے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس اچھی چیز سے برائی ظہور کرے گی تو امید و رجائیت کی پوری متاع برباد ہو جائے گی۔ ضروری ہے کہ برا پہلو بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہوتا کہ پہلے ہی اس کا انسداد کر لیا جائے۔

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ میرزا نے ’’رشک‘‘ کی طرح بعض دوسرے مضامین میں حیرت انگیز نکتہ آفرینیاں کی ہیں مثلاً ’’شراب‘‘۔ میرے اندازے کے مطابق ’’شراب‘‘ کے متعلق سیکڑوں شعر کہے۔ ہر شعر میں اس موضوع کے متعلق نئی بات کہی اور کوئی بھی بات ایسی نہ کہی جو اس دائرے میں حقیقت و واقعیت کی صحیح تصویر نہ ہو، مضامینِ شراب میں اتنا تنوع حافظؔ اور خیامؔ کے ہاں بھی نہ ملے گا جو خمریات میں امام مانے جاتے ہیں۔ ایسے مضامین بھی بے شمار ہیں جن کے متعلق بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بعض اور پہلو بھی ہیں لیکن میں اس گفتگو کو پھیلانا نہیں چاہتا اور جو کچھ اوپر پیش کر چکا ہوں اس کی چند ملی جلی مثالیں عرض کروں گا۔

میرزا کا ایک فارسی شعر ہے:

تا نیفتد ہر کہ تن پرور بود
خوش بود گر دانہ نبود دام را

پرندے پکڑنے کے لیے پھندا لگاتے ہیں تو اس پر دانے بکھیر دیتے ہیں تا کہ پرندے دانے

کے لالچ میں درختوں سے زمین پر اتریں اور پھنس جائیں۔ میرزا کہتے ہیں کہ دانے کی خاطر اترنا ”تن پروری“ ہے کیا اچھا ہوتا کہ جال بچھاتے وقت اس پر دانے نہ بکھیرے جاتے تاکہ تن پروری کا ذوق پرندوں کے لیے گرفتاری کا موجب نہ ہوتا۔

یہی مضمون طاعت و عبادت کے سلسلے میں ذرا کھول کر بیان کیا تو فرمایا:

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

جو لوگ خدا کی عبادت کرتے ہیں، اس کے حکموں کے پابند رہتے ہیں، ان میں سے اکثر کی غرض یہ ہوتی ہے کہ اعمال حسنہ کی جزا پائیں گے اور بہشت میں جائیں گے، جہاں شہد کی نہر بھی ہوگی، شراب طہور بھی ملے گی اور دوسری نعمتوں سے بھی مستفید ہوں گے۔ میرزا فرماتے ہیں کہ یہ طاعت خالصۃً خدا کے لیے نہ رہی بل کہ بہشت اور اس کی نعمتوں کے لیے ہوگئی۔ میرزا کے نزدیک حقیقی اور خالص طاعت وہ ہے جو غیر اللہ کی تمام خواہشوں سے بالکل پاک ہو۔ پھر فرماتے ہیں:

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمع خام بہت ہے

یعنی زاہد اگر ریا سے پاک بھی ہو تو میں اس کا معتقد کیوں کر ہو سکتا ہوں۔ آخر اپنے اعمال کی جزا کا معاملہ تو ساتھ ساتھ چلا جا رہا ہے۔ جب تک اس طمع خام سے زہد پاک نہ ہو وہ ایسا زہد کیوں کر بن سکتا ہے جسے میں قابلِ احترام مانوں؟

اب فارسی اور اُردو کے متعدد ہم معنی اشعار پر ایک نظر ڈال لیجیے جنھیں میں نے سرسری نظر میں چنا ہے۔ دقّتِ نظر سے کام لیا جائے تو اور بہت سے اشعار مل جائیں گے:

۱۔ گریہ کرد از فریب و زارم گشت
نگہ از تیغ آبدار تر است
کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

۲۔ ہفت آسماں بہ گردش و ما درمیانہ ایم
غالبؔ دگر مپرس کہ بر ما چہ می رود
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

۳۔ ہر رشحہ بہ اندازۂ ہر حوصلہ دادند
می خانۂ توفیق خم و جام نہ دارد
توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی، نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ، ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

۴۔ لالہ و گل دمد از طرف مزارش پسِ مرگ
تا چہا در دلِ غالبؔ ہوس روی تو بود
مشہد عاشق سے کوسوں تک جو اگتی ہے حنا
کس قدر یا رب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

۵۔ رمز بشناس کہ ہر نکتہ ادای دارد
محرم آں است کہ رہ جز بہ اشارت نہ رود
چاک مت کر جیب بے ایامِ گل
کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے

۶۔ فغاں کہ نیست سرو برگ دامن افشانی
کہ بندِ خویش فرو ماندہ ام بہ عریانی

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے
کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے

۷ ناکس ز تنومندی ظاہر نہ شود کس
چوں سنگِ سرِ رہ کہ گران است و گراں نیست
قدر سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں
سخت ارزاں ہے گرانی میری

۸ ناداں حریف مستیِ غالبؔ مشو کہ او
دُردی کشِ پیالۂ جمشید بودہ است
صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ
وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

۹ از جوی شیر و عشرتِ خسرو نشاں نہ ماند
غیرت ہنوز طعنہ بہ فرہاد می زند
عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو؟ کیا خوب!
ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں
۱۰ فرصت از کف مدہ و وقت غنیمت پندار
نیست گر صبحِ بہاری، شب ماہی دریاب
غالبؔ چھٹی شراب، پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں
پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

میرزا کا ایک خاص مضمون یہ ہے کہ گناہوں کی پرسش میں انھیں اپنی حسرتیں یاد آ جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں فارسی کا ایک نہایت عمدہ شعر ہے:

اندر آں روز کہ پرسش رود از ہرچہ گزشت
کاش با ما سخن از حسرتِ ما نیز کنند

پھر یہی مضمون ایک رباعی میں یوں پیش کیا ہے:

ای آں کہ دہی مایہ کم و خواہش بیش
آں روز کہ وقت باز پرس آید پیش
بگزار مرا کہ من خیالی دارم
باحسرت عیشہای ناکردۂ خویش

مثنوی ''ابر گہربار'' کی مناجات کے آخر میں کم وبیش اسّی (۸۰) شعر صرف اسی موضوع پر کہے ہیں اور ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ وہ شعر پڑھتے وقت دل ہل جاتا ہے۔

دیوانِ اُردو میں بھی دو شعر اس مضمون کے موجود ہیں:

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

آخر میں اتنا اور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مختلف اصحاب نے میرزا کے بعض اُردو اشعار کو کسی نہ کسی فارسی شعر کے ہم مطلب قرار دے لیا اور اس حقیقت پر غور نہ کیا کہ دونوں میں حقیقتاً کتنا فرق ہے مثلاً بیگمی دختر علی حیدر کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے:

من اگر توبہ زمی کردہ ام ای سروسہی
تو خود ایں توبہ نہ کردی کہ مرا می نہ دہی

یعنی اے سروسہی! اگر میں نے شراب سے توبہ کر لی تو تُو نے کب توبہ کی تھی کہ مجھے شراب نہ

دے گا؟ کہا گیا ہے کہ میرزا کا مندرجہ ذیل شعر اسی سے ماخوذ ہے:

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں؟
گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا؟

بلاشبہ شراب سے توبہ کرنے اور ساقی کی طرف سے شراب نہ ملنے کا ذکر دونوں میں موجود ہے مگر بیگی کا شعر محض ذکر پر ختم ہوگیا اور شراب کے سلسلے میں ساقی یا محبوب کو ''سروسہی'' کہنا کچھ لطف نہیں رکھتا اور آپ میرزا کے شعر کی معنویت پر غور فرمائیے:

۱۔ ''میں اور'' سے ظاہر ہوتا ہے، مے کش اتنا پینے والا ہے کہ ساقی اور رند سب اس سے بہ خوبی آگاہ ہیں اسی لیے ''میں'' پر خاص زور دیا اور صرف ''میں'' کہہ کر یہ پوری حقیقت واضح کر دی۔

۲۔ پھر شراب نہ ملنے سے جو تکلیف ہوئی، وہ محتاج بیان نہیں۔

علاوہ بریں مے کش کو اس بات پر بھی سخت غصہ ہے کہ عرق نوشی میں درجۂ کمال حاصل کر لینے کے باوصف ساقی نے قدر نہ پہچانی۔

۳۔ بے شک شراب سے توبہ کر لی تھی مگر بزمِ مے میں جانے سے صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ توبہ کچھ ایسی پختہ و استوار نہیں کہ ٹوٹنے نہ پائے یا شراب پیش کر دی جائے تو اسے قبول کرنے میں ہچکچاہٹ ہو۔

۴۔ ''بزمِ مے'' سے روشن ہے کہ شراب نہ ملنے کا واقعہ خلوت میں پیش نہ آیا جسے طوعاً و کرہاً برداشت کیا جا سکتا تھا بل کہ بھری محفل میں پیش آیا جہاں حریفوں کا پورا گروہ موجود تھا گویا سبکی اور بے عزتی رندوں کے مجمع میں ہوئی جس سے مے کش کے غصے کی آگ برابر تیز ہو رہی ہے۔

۵۔ ''یوں تشنہ کام آؤں'' سے پتا چلتا ہے کہ رفع خمار کی بڑی امیدیں اور آرزوئیں لے کر بزمِ مے میں شریک ہوا تھا مگر ساقی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور دور شروع ہوا تو اسے تشنہ کام و نامراد لوٹا دیا۔

۶۔ پھر کہتے ہیں اچھا بھئی مانا، میں نے توبہ کر لی تھی۔ آخر ساقی کو تو خیال ہونا چاہیے تھا کہ توبہ محض نمائشی اور ریائی ہے کیوں کہ وہ تو عمر بھر سے میکشی کو دیکھ رہا تھا توبہ کا معاملہ تو ایک معمولی معاملہ تھا۔

یہ معمولی معاملہ یاد رکھا اور اسی کو معیارِ سلوک بنا لیا۔ عمر بھر کی ہم مشربی یک قلم فراموش کر دی۔

۷۔ سب سے آخر میں کہتے ہیں کہ ''ساقی کو کیا ہوا تھا''؟ یعنی میں نے توبہ کر لی تھی تو اس نے کیوں یہ ناقابل تصور رویّہ اختیار کر لیا؟

پھر لطف یہ کہ کوئی معین بات نہیں بتاتے۔ ’’کیا ہوا تھا؟‘‘ کہہ کر معاملہ ختم کر دیا، جس کی بیسیوں تعبیریں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً:

ا۔ کیا وہ اس پر ناراض تھا کہ میں نے توبہ کیوں کی؟
ب۔ کیا حریفوں نے اسے مختلف باتیں کہہ کہہ کر میرے خلاف برانگیختہ کر دیا تھا؟
ج۔ کیا وہ ہوش میں نہ تھا اور اس نے مجھے پہچانا نہیں تھا؟
د۔ کیا وہ چاہتا تھا کہ یوں مجھ سے بھری محفل میں توبہ کا بدلہ لے؟
ہ۔ کیا اس کے سے دیرینہ رند کے ساتھ ایسا برتاؤ مناسب تھا؟
و۔ یا کیا بیگی کے قول کے مطابق اس نے مجھے شراب دینے سے توبہ کر لی تھی؟

غرض سوچتے جائیے اور مختلف پہلو نکلتے آئیں گے۔ بیگی کے شعر میں معنویت کے اتنے پہلو کہاں موجود ہیں؟

غرض میری گزارشات کا مدّعا یہ ہے کہ میرزا غالبؔ کی شاعری کے ان پہلوؤں پر بھی اربابِ ذوق کو خاص توجہ فرمانی چاہیے اور مجھے یقین ہے کہ یہ توجہ بہ ہر حال سُودمند ہوگی، اغلب ہے کئی ایسے نکتے روشنی میں آ جائیں جو اب تک عام نظروں کی گرفت سے باہر رہے۔

(ماہِ نو۔ کراچی۔ فروری ۱۹۶۴ء)

جنوری، فروری ۱۹۶۹ء

غالب کی شاعری (۲)

در تہِ ہر حرف غالبؔ چیدہ ام میخانۂ
تا زِ دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شُدن
(غالبؔ)

ہر حرف کی تہ میں میخانے کی آراستگی کا دعویٰ بہ ظاہر مبالغہ آمیز معلوم ہوگا اور شاعروں کے ہاں خودستائی کی ایسی مثالیں عام ہیں تاہم بعض شاعر ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ بہ ظاہر کتنا ہی مبالغہ آمیز معلوم ہو، حقیقۃً ایسا نہیں بل کہ بعض اوقات احساس ہوتا ہے کہ اپنے متعلق جو کچھ کہنا چاہیے تھا، نہ کہہ سکے اور جو کچھ کہا، وہ حقیقت سے بہت کم ہے مثلاً عرفیؔ، نظیریؔ، کلیمؔ وغیرہ۔ انھیں شعراء میں میرزا غالبؔ بھی شامل ہیں۔

مولانا عرفیؔ

عرفیؔ نے ایک جگہ اپنی شعر گوئی کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

از برونِ لب نہ دانم چوں شود؟ لیک آگہم
کزتہِ دل تالبم افسانہ در خوں می رود
بسکہ خون آلودہ خیزد دود از شمعِ دلم!
در ہوائے محفلم پروانہ در خوں می رود

یعنی جو حرفِ مطلب میرے دل کی عمیق گہرائیوں سے اُٹھ کر لبوں سے باہر نکلتا ہے، میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے اثر و فعالیت کی کیفیت کیا ہوتی ہے کیوں کہ اس کا معیار سننے والوں کے دل و دماغ ہیں۔ وہی بتا سکتے ہیں کہ ان پر کیا گزری البتہ یہ جانتا ہوں وہ حرفِ مطلب دل سے اٹھتا ہے تو

لب تک آتے آتے خون میں لت پت آتا ہے۔ میرے دل کی شمع سے جو دھواں اٹھتا ہے، سراسر خون آلودہ ہوتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ میری مجلس کی فضا میں پروانہ رقص کرتا ہوا آتا ہے تو خون میں تیرتا آتا ہے۔

یقین رکھیے کہ یہ بندش الفاظ کے کرشمے نہیں بل کہ شعر کہتے وقت دِلی حالت سامعین کے روبرو پیش کرنے کی ایک کوشش ہے۔ اس طرح شاعر احساسات کے اس قیامت زار کا نقشہ پیش کرتا ہے، جس کی آغوش میں اس کا حرفِ مطلب اشعار کی شکل اختیار کرتا ہے۔

خواجہ نظیریؔ

نظیریؔ کے ہاں بھی ایسی درد انگیز صدائیں، جا بجا گوش زد ہوتی ہیں مثلاً:

بخست جاں زِ دمِ ایں مغنّیاں گوئی
خراش سینہ تراشیدہ بر گلو بستند!

یعنی ان مغنّیوں کی لے نے جان کو سراپا جراحت زار بنا دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سینے کے زخم تراش کر گلے پر باندھ لیے تھے۔ اہلِ درد کی زبان پر جو کچھ جاری ہوتا ہے، اس کی کیفیت دل نشیں انداز میں پیش کرنے کے لیے اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ زخم ہائے قلب تراش کر گلے پر باندھ لیے جائیں تا کہ ان کی ٹیس جس حد تک ممکن ہو آواز میں بھی سرایت کر جائے۔ شاید اسی طرح وہ سننے والوں پر ٹھیک اثر انداز ہو سکے۔

ایک اور مقام پر کہتے ہیں:

سوئے ایں بادیہ ہرگز نہ وزید است نسیم
سینہ بر برق کشائیم و جگر تازہ کنیم

جس بیابان میں ہم بیٹھے ہیں، وہاں موجِ نسیم کا گزر کبھی ہوا ہی نہیں اور ہم اس کا انتظار نہیں کرتے۔ جب جگر میں تازگی پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اپنا سینہ کھول کر برق کو دعوت ترکتاز دیتے ہیں۔

میرزا غالبؔ

میرزا غالبؔ نے بھی ایک جگہ عین حالت شعر گوئی کی کیفیت یوں بیان کی ہے:

بینیم از گداز دل، در جگر آتشے چو سیل
غالب اگر دمِ سخن رہ بہ ضمیر من بری

اے غالب اگر شعر کہتے وقت تو کسی طرح ہمارے ضمیر کے نہاں خانے میں راہ پاسکے اور وہاں پہنچ جائے تو ایک عجیب منظر تیرے سامنے ہوگا۔ دل پگھلتا ہوا دکھائی دے گا اور جگر میں آگ کا سیل موجزن نظر آئے گا۔

واضح رہے کہ احوالِ قلب وضمیر کا بیان سہل نہیں۔ الفاظ میں جو بھی نقشہ پیش کیا جائے گا۔ وہ کتنا ہی جامع اور مکمل ہو، تاہم اس سے ٹھیک ٹھیک لذت اندوز ہونا سامع کے احساسات کی صلاحیت پر موقوف رہتا ہے۔ ہر حرف کی تہ میں میخانے کی آراستگی کا دعویٰ بھی خالی دعویٰ نہیں بل کہ ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت سے بہرہ مندی نہایت صحیح احساسات کے ساتھ اصلح غور وفکر کے طبعی وسائل پر موقوف ہے — میں یہاں صرف چند مثالیں پیش کروں گا:

اُردو کا ایک شعر

میرزا کا ایک سادہ سا اُردو شعر ہے:

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں؟
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا!

اب اس کی معنویت کے مختلف پہلوؤں پر غور فرمائیے:

۱۔ صرف ''میں اور'' کہہ کر آشکارا کر دیا کہ میرے برابر شراب پینے والا کوئی نہیں اور اس سے ساقی اور تمام رند بہ خوبی آگاہ ہیں۔ صرف ''میں'' پر زور دینے سے یہ حقیقت پوری طرح آشکارا ہو جاتی ہے۔

۲۔ ''تشنہ کام'' یعنی بن پیئے لوٹ آنے سے اولاً ظاہر ہے کہ سب نے پی مگر مجھ مے کدہ آشام کو ایک جرعہ بھی نہ ملا۔ اس سے جو تکلیف ہوئی وہ محتاج بیان نہیں۔ ثانیاً ساقی کے خلاف شدید غصے کا اظہار ہو گیا کہ عرق نوشی میں درجۂ کمال حاصل کر لینے کے باوصف میری قدر نہ پہچانی گئی۔ اس سے واضح ہو گیا کہ ساقی کی نگاہوں میں اہلِ کمال کی کوئی قدر و منزلت نہیں۔

۳۔ لیکن کہتا ہے کہ بے شک میں نے شراب نوشی سے توبہ کر لی تھی۔ خواہ اس کی وجہ کوئی ہو، تاہم بزمِ

ئے میں جانے سے روشن ہو گیا تھا کہ توبہ کچھ ایسی پختہ واستوار نہ تھی کہ ٹوٹنے نہ پاتی یا جامِ شراب پیش کر دیا جاتا تو اسے قبول کرنے میں ہچکچاہٹ ہوتی۔ بزم میں شریک ہونے کا مطلب یہ نہ تھا کہ محفلِ مے کشوں کے ہنگامہ و غوغا کا تماشا دیکھ کر لوٹ آتا۔ آزمانا چاہتا تھا کہ خود ساقی ایک گم شدہ بھیڑ کو گلے میں واپس لانے کے لیے کیا کچھ کرتا ہے۔

۴۔ پھر مجھے شراب نہ ملنے کا واقعہ بھری محفل میں پیش آیا۔ جہاں حریفوں کا پورا مجمع موجود تھا، اس سے ہم مشربوں میں جو سبکی اور بے عزتی ہوئی، وہ مزید رنج و قلق کا باعث بن گئی اگر یہ واقعہ خلوت میں پیش آتا تو صبر سے برداشت کر لینا ممکن تھا جس طرح ساقی کی اور بے انصافیاں یا بے توجہیاں برداشت کر لی جاتی ہیں لیکن برسرِ عام ایسی حرکت پر دل ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہ ہو۔

۵۔ ''یوں تشنہ کام آؤں'' کے الفاظ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ میکش رفعِ خمار کی بڑی امیدیں اور آرزوئیں لے کر بزم میں شریک ہوا تھا مگر سب کا خون ہو گیا۔ ساقی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور تشنہ کام لوٹا دیا۔

۶۔ پھر کہتے ہیں کہ اچھا! مان لیجیے کہ میں نے توبہ کر لی تھی اور مجھ سے بھول ہو گئی تھی۔ آخر ساقی کو تو بخششِ عام کے دامن پر دھبا نہ لگانا چاہیے تھا اور میں گھر میں نہیں بیٹھا تھا۔ مجلس میں پہنچ گیا تھا۔ ''توبہ'' کے گناہ کی سزا ایسی سخت تو نہ ہونی چاہیے تھی جیسی دی گئی۔

۷۔ ''ساقی کو کیا ہوا تھا'' کا مطلب یہ ہے کہ اس نے کیوں ایسا وتیرہ اختیار کر لیا، جسے اس کے شغل و منصب سے کوئی بھی مناسبت نہ تھی؟

''کیا ہوا تھا'' کے معارف

خاص توجہ کا محتاج یہ پہلو ہے کہ ساقی کے فعل کا ذکر محض ''کیا ہوا تھا؟'' کہہ کر کر دیا اور معین طریق پر کچھ نہ بتایا کہ کیا ہوا تھا؟ ہر فرد اپنے احوال و تجربات کی بناء پر جو جو تعبیریں چاہے کر لے مثلاً:

ا۔ کیا ساقی نے میری توبہ پر شدید خفگی کے اظہار کی غرض سے یہ طریقہ اختیار کیا؟
ب۔ کیا حریفوں نے ساقی سے میرے خلاف گوناگوں شکایتیں پیش کر کر کے اسے مشتعل کر دیا تھا؟
ج۔ کیا وہ ہوش میں نہ تھا کہ مجھ ایسے دیرینہ بلانوش کو پہچان نہ سکا؟
د۔ کیا اس نے بھری محفل میں مجھ سے توبہ کا بدلہ لینا ضروری سمجھا؟

ہ۔ کیا اس کے لیے میرے ساتھ ایسا برتاؤ مناسب تھا؟

و۔ کیا ساقی نے عرفی کے اس شعر پر عمل کیا:

این رہِ عشق است کج رفتن نہ دارد بازگشت
جرم را این جا عقوبت ہست و استغفار نیست

ز۔ عدالتوں میں تو مجرموں کے لیے سزائیں منتظر رہیں اور سزائیں اس لیے دی جاتی ہیں کہ جرائم کا انسداد ہو جائے لیکن بزمِ مے کا تو سب سے بڑا وصف عفو و بخشش ہی ہے وہاں تعزیرات و تادیبات سے نہیں بل کہ لطف و محبت کی فراوانی سے جرموں کا انسداد کیا جاتا ہے پھر ساقی نے ایسا انوکھا طریقہ میرے متعلق ہی کیوں اختیار کیا؟

غرض سوچتے جائیے اور اس پہلو کے سلسلے میں نئے نئے شاخسانے نکلتے آئیں گے۔

فرمائیے، کیا یہ صحیح نہیں کہ شاعر نے ہر حرف کی تہ میں ایک ایک نہیں کئی کئی مے خانے چُن دیے؟

معجزاتِ مشاہدہ

میرزا کے کلام میں مشاہدے کے معجزات بھی جا بجا ملتے ہیں، مثلاً فارسی کا ایک شعر ہے:

یخ فروشم در تموز و کلبہ دور از چارسو ست
می رود سرمایہ از کف تا خریدارے رسد

یعنی شدید گرمی کا موسم ہے اور جھونپڑی کے آس پاس کوئی مکان نہیں، چاروں طرف دور دور تک مکانوں کا نشان نہیں ملتا۔ فروخت کے لیے جو جنس میرے پاس موجود ہے، وہ برف ہے جو برابر پگھل پگھل کر پانی بنتی جا رہی ہے۔ اب آپ سوچیں کہ کون دھوپ کی تیزی میں یہ جنس خریدنے کی غرض سے خاصا فاصلہ طے کر کے جھونپڑی میں آئے گا! آئے گا تو خرید کر جنس اپنے مکان تک سلامت کیوں کر لے جائے گا؟ نتیجہ یہ ہوگا کہ پوری جنس خریدار کے پہنچنے سے پیش تر ہی پانی ہو کر بہ جائے گی۔

شعر کا اصل مطلب یہ ہے کہ جو گراں بہا جنس میں لے کر دنیا کے بازار میں آیا ہوں، اسے محفوظ رکھ کر ضرورت مندوں تک پہنچانا ممکن نہیں۔ اس کے لیے جو اسلوب پیدا کیا، وہ بے شائبۂ ریب مشاہدے کا ایک غیر معمولی مرقع ہے۔

یگانہ و تنہا

یہ شاعری ایسی نہیں جس کی مثالیں عام ہوں، مشہور عالم اساتذہ کے ہاں بھی ایسے شعر بہت کم ملتے ہیں پھر یہ پہلو بھی پیشِ نظر رکھیے کہ ایسا حقائق گو شاعر مدت سے کہیں نظر نہیں آیا تھا، جیسے میرزا غالبؔ تھے۔ اس وجہ سے ان کی گراں بہائی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ میرزا سے پیش تر کے دور پر نظر ڈالی جائے تو ایک ایک وقت میں کئی کئی باکمال سخن طراز موجود تھے مثلاً اکبر کے دور میں عرفیؔ، نظیریؔ، فیضیؔ، جہانگیر کے دور میں طالبؔ آملی اور کلیمؔ ہمدانی لیکن اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفرؔ کے دور میں صرف ایک میرزا غالبؔ تھے، ان کا ہمسر و ہمتا کون تھا؟

بارِ علائق کی مصیبتیں

فارسی کا ایک اور شعر قوت مشاہدہ ہی کے کمالات کا آئینہ ہے، فرماتے ہیں:

براہ کعبہ زادم نیست شادم کز سبک باری
بہ رفتن پائے برخار مغیلانم نمی آید

حرم پاک کا سفر اختیار کر لیا لیکن زادِ راہ پاس نہیں، کہتے ہیں کہ اس پر خوش ہوں کیوں کہ بھاری بوجھ سر پر نہ ہوگا تو ببول کے کانٹوں سے بچتا ہوا بے تکلف منزلیں طے کرتا جاؤں گا۔

اگر کسی شخص نے سر پر بھاری بوجھ اٹھا رکھا ہو تو معلوم ہے کہ وہ چلتے وقت راستے کو دیکھ دیکھ کر قدم نہ دھر سکے گا۔ بوجھ جتنا زیادہ وزنی ہوگا۔ باربردار کے چلنے میں اسی تناسب سے حالتِ اضطرار پیدا ہو جائے گی۔ وہ کبھی خیال نہ کر سکے گا کہ سنگ ریزوں، کانٹوں یا دوسری موذی چیزوں سے بچتا ہوا نکل جائے۔ بارِ گراں کے باعث قدم اپنے اختیار میں نہ رہے گا، زادِ راہ ہو تو کھانے پینے کی طرف سے بلاشک و شبہہ فارغ البالی رہتی ہے لیکن پاؤں زخمی ہو جائیں گے اور پہلی ہی منزل میں ایسی کیفیت رونما ہو جائے گی کہ آگے چل ہی نہ سکے۔ راستے ہی میں بیٹھا زادِ راہ ختم کر دے۔

مطلب یہ کہ زندگی کی منزل میں علائق کا بوجھ جتنا زیادہ ہوگا، انسان کے لیے گوناگوں زحمتیں اور مصیبتیں بڑھتی جائیں گی، آرام و اطمینان انھیں اصحاب کے لیے ہے جن کے دوش ہمت بارِ گراں سے آزاد ہوں۔

مدعائے گزارش

میں نے طفیل صاحب کے ارشاد کی تعمیل میں یہ چند سطریں لکھیں۔ انکار کی گنجایش نہ تھی۔ تفصیل کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ پہلے سے قبول کی ہوئی ذمہ داریاں ہر طرف بلند دیواروں کی طرح کھڑی تھیں اور میں انھیں پھاند نہیں سکتا تھا۔

میں نے جو کچھ عرض کیا۔ اس کا مقصود و مدعا محض یہ ہے کہ اہلِ ذوق و نظر میرزا کا کلام شوق و توجہ سے پڑھیں اور اس کی گراں بہائی کا اندازہ فرمائیں۔ خصوصاً فارسی کلام۔ پھر ان کو صحیح اندازہ ہو سکے گا کہ جس شاعرِ شہیر کی صد سالہ برسی آج دنیا کے ہر خطے میں منائی جا رہی ہے، وہ کن فضائل و کمالات کا جامع تھا۔ اس نے یقیناً سچ کہا تھا:

عمر ہا چرخ بگردد کہ جگر سوختۂ
چوں من از دودۂ آذر نفساں برخیزد

ایک پیش گوئی

میرزا نے اپنے متعلق ایک پیش گوئی کی تھی کہ میری شعر گوئی کی شہرت میرے بعد ہوگی۔ آج اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اس پیش گوئی کو درستی کا ایسا سامان کر دیا ہے کہ کوئی چاہے بھی تو اسے جھٹلا نہیں سکتا۔ میرزا پہلا شاعر ہے جس کی صد سالہ برسی بین الاقوامی درجے پر منائی جا رہی ہے یہ محض پراپیگنڈے کا کرشمہ نہیں بل کہ جابہ جا ایسے وجود موجود ہیں جن کے دل پر میرزا کے کلام نے زبردست اثرات چھوڑے اور انھیں محسوس ہوا کہ احساسات و تاثرات اور فکر و نظر کا یہ نابغۂ عظیم حقیقۃً خاص ذکر و بیان کا مستحق ہے۔ ضروری ہے کہ اس کے لیے مجلسیں آراستہ کی جائیں اور جس حد تک ممکن ہو، اس کا تعارف وسیع حلقے سے کرایا جائے۔ قدرت کے کرشمے ملاحظہ ہوں کہ ہمارے ہاں کا ایک بلند منزلت شاعر جغرافیائی، نسلی، لسانی اور فکری معیارات کی تمام حدیں توڑتا ہوا عالمی شخصیت بن گیا ہے گویا ایک صدی سے بھی زیادہ عرصہ پیش تر میرزا نے جو کچھ کہا تھا، وہ حقیقتِ ثابتہ کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

میں آخر میں میرزا ہی کے ایک فارسی ترکیب بند سے چند اشعار درج کر کے اس مقالے کو ختم کرتا ہوں۔ افسوس کہ ان کا سرسری مطلب ہی اُردو میں پیش کر سکتا ہوں۔ تشریح نہیں کر سکتا:

مرد نبود کز ستم بر خاطرش بارے رسد
ہم ز خود رنجم گرم از دشمن آزارے رسد

اگر ظلم و ستم سے کسی فرد کا دل میلا ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ مردِ حق نہیں۔ مردانِ حق کے دل کسی کے ظلم و ستم کا کوئی اثر قبول نہیں کرتے، یہی وجہ ہے کہ اگر دشمن کی معاندانہ تدبیروں سے میرے دل کو دُکھ پہنچے تو میں اپنے آپ پر خفا ہوتا ہوں کہ مردانگی میں کوئی نہ کوئی خامی رہ گئی۔

دانش آں باشد کہ چشمِ دل بحق بینا شود
نے گمانِ باطلے کز وہم و پندارے رسد

دانش وہ ہے جس سے دل کی آنکھ میں حق بینی کی بصیرت و روشنی پیدا ہو جائے، اوہام و پندار کے گمان باطل کو دانش نہیں کہتے۔

اہلِ معنی را نگہ دارد بہ سختی آسماں
سفلہ را بر گنج زر بینی کہ بندِ آہن است

آسمان اہلِ معنی کی نگرانی سختی سے کرتا ہے۔ کمینے کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ اپنے گنج زر پر فولادی بند لگا دیتا ہے۔

لطفِ طبع از مبدءِ فیاض دارم، نے ز غیر
دشت را خود رو بود گر سرخ گل در سوسن است

میری لطافت طبع مبدء فیاض کی عطا کی ہوئی ہے، کسی غیر سے میں نے کچھ حاصل نہیں کیا۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ جنگل میں گلاب کے پھول کھلیں یا سوسن کے، وہ سب خود رَو ہوتے ہیں یعنی ان کی کاشت و پرداخت مالیوں اور باغ بانوں کی ممنون نہیں ہوتی۔ وہ قدرت کے عطا کردہ جوش نمو سے اپنے آپ اُگتے اور کھلتے ہیں۔

میرزا کا ایک اُردو شعر ہے:

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر!

اس شعر کی معنویت آپ پر اسی صورت میں آشکارا ہو سکتی ہے کہ میرزا کے کلام سے مزاولت کا سلسلہ جاری رکھیں۔ اس طرح آپ خود جان لیں گے کہ میرزا کس طرح ”متاعِ سخن“ کے ساتھ خریدار کے پاس پہنچ جاتے ہیں اور کیوں کر اپنی خالص شراب صاحبِ مزاولت کے جام ذوق میں بھرتے ہیں۔ البتہ یہ فیضان ہر ”خریدار“ کے فطری معیار کے مطابق ہوگا کیوں کہ:

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر!

نقوش۔ غالب نمبر فروری ۱۹۶۹ء

میرزا غالبؔ کا مقامِ شعر گوئی

نہ رنجم گر بصورت از گدایاں بودہ ام غالبؔ
بہ دار الملکِ معنی می کنم فرماں روائی ہا

جو ہندوستان ۱۹۴۷ء سے دو مملکتوں میں بٹا ہوا ہے، ابتدائے دورِ تاریخ ہی سے نسلوں، قوموں، تہذیبوں، زبانوں اور ثقافتوں کا عجائب خانہ چلا آتا ہے۔ زمین زرخیز تھی۔ مختلف حصوں میں دریاؤں اور ندیوں کی کثرت تھی۔ بارش کہیں بہت زیادہ اور کہیں حسبِ ضرورت ہو جاتی تھی۔ آب یاری کی ان سہولتوں کے باعث کھیتی باڑی زیادہ مشقت خیز نہ تھی۔ یہ صورتِ حال فاتحوں اور آبادکاروں کو مسلسل اپنی طرف کھینچتی رہی۔

زیادہ تر لوگ شمالی و مغربی جانب سے آئے، جن میں اہلِ ترکستان کا بھی خاصا حصہ تھا۔ ابتدائی سلطنتوں کے علاوہ یہاں کی آخری بڑی سلطنت بھی اہلِ ترکستان ہی نے قائم کی تھی، جو کم و بیش سوا تین سو سال تک جاری رہی۔ اسی عہد میں ہندوستان نے ایک وحدت کی شکل اختیار کی اور اس کی شہرت کا پرچم چار دانگ عالم کی فضا میں اڑا۔ اس سلطنت نے علم و فضل کو بھی اوجِ کمال پر پہنچایا اور ملک کے چپے چپے پر آثارِ ثابتہ کی مہریں بھی لگائیں، جن کے باقیات آج بھی عجائباتِ عالم میں شمار ہوتے ہیں۔

اہلِ ترکستان نے شعر و ادب کی درخشاں مجلسیں قائم کرنے میں بھی نمایاں حصّہ لیا اور گوناگوں علوم و فنون کی اشاعت و ترقی میں بھی انھیں امتیاز حاصل رہا۔

امیر خسرؔو اور میرزا غالبؔ:

ہمارے ہاں مشہور ہے کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کی ابتداء ایک ’’ترک لاچین‘‘ سے ہوئی اور یہ شاعری ایک ’’ترک ایبک‘‘ پر ختم ہوگئی۔ ’’ترک لاچین‘‘ سے مراد امیر خسرو ہیں (وفات ۱۳۲۵ء) جن کے والد ترکستان کے شہر کش (شہرِ سبز) سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ ترک ایبک سے اشارہ

میرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی طرف ہے، جن کی صد سالہ برسی دنیا بھر میں منائی جا رہی ہے۔

یہ دونوں شاعر تمام اصناف شعر و ادب میں جامعیت کے اعتبار سے بھی بہت ممتاز تھے۔ فارسی اور اُردو شاعری کے مختلف شعبے ہیں مثلاً قصیدہ، غزل، مثنوی، ترجیع بند، ترکیب بند، قطعہ، رباعی وغیرہ۔ اسی طرح نثر نگاری کی مختلف قسمیں ہیں۔ اکثر شاعروں اور ادیبوں نے ایک ایک دو دو شعبوں میں کمال حاصل کیا لیکن خسرؔو اور غالبؔ نظم و نثر کے تمام شعبوں اور دائروں میں یکساں برتری کے مقام پر پہنچے۔ انھوں نے اپنے دائرہ ہائے فکر و نظر میں روشنی کے بلند میناروں کی حیثیت پیدا کر لی، جن کی ضیا گستری سے شعر و ادب کے مختلف خطّے بقعۂ نور بنے ہوئے ہیں۔

میرزا غالبؔ اور اُردو:

میرزا غالبؔ کا ایک امتیازی وصف یہ بھی ہے کہ جب ہندوستان میں فارسی کا رواج کم ہوا اور اُردو یہاں کی عام زبان ہو گئی، جو مختلف گروہوں کی زبانوں کے اختلاط سے پیدا ہوئی تھی تو میرزا اردو شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ جدّت اسلوب و بیان اور فراوانی معارف و حقایق سے اس میں ایسا رنگ پیدا کر دیا کہ اُردو شاعری فارسی کے لیے باعثِ رشک بن گئی، وہ خود کہتے ہیں:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کے ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

میرزؔا نے اردو زبان کو ایسا پرداز دے دیا کہ اس میں دقیق و عمیق افکار دل پذیر طریق پر ادا کرنے کے لیے حیرت انگیز ممکنات بروئے کار آ گئے۔ ساتھ ہی مکاتیب میں اُردو نثر نگاری کا ایسا دل آویز نمونہ چھوڑا، جو ایک سو سال کی مدّت گزر جانے کے بعد بھی عدیم المثال ہے۔ اس نمونے کی شان امتیاز اس وقت تک برابر درخشاں رہے گی جب تک اُردو زبان دُنیا میں موجود ہے۔

عطیۂ قدرت:

ایک قابلِ ذکر امر یہ بھی ہے کہ میرزؔا کا پورا سرمایۂ فکر و نظر بڑی حد تک قدرت کا عطیہ تھا۔ انھوں نے عام اہل علم کی طرح بڑی درس گاہوں میں مدارج علم طے نہیں کیے تھے۔ عربی کے بنیادی قواعد

ضرور سیکھے، فارسی کی تعلیم دو سال تک ایک ایرانی نومسلم سے ضرور پائی لیکن اتنی تعلیم فضیلت کی خاص سند نہیں بن سکتی تھی، البتہ ذاتی شوق مطالعہ سے اساتذہ کی تصانیف اور دیوان دیکھ لیے تھے۔ یوں فطری جوہروں میں خاص جلا پیدا ہوگئی۔ پھر ان کا دریائے فکر مدت العمر دُرہائے شہوار کی پرورش میں مصروف رہا۔ وہ خود کہتے ہیں:

فیضِ حق را کمینہ شاگردیم
عقلِ کل را بہینہ فرزندیم
ہم بہ تابش بہ برق ہم نفسیم
ہم بہ بخشش بہ ابر مانندیم

اصل ونسل:

میرزا نے کئی مقامات پر اصل ونسل کا ذکر کیا ہے مثلاً:

غالبؔ از خاکِ پاکِ تورانیم
لاجرم در نسب فرہمندیم

ترک زادیم و در نژاد ہمی
بہ سترگانِ قوم پیوندیم!!!

ایبکیم از جماعۂ اتراک
در تمامی ز ماہ دہ چندیم

☆

غالبؔ بہ گہر ز دودۂ زادشم
زان رو بہ صفای دم تیغ است دمم

چون رفت سپہبدی، زدم چنگ بہ شعر
شد تیرِ شکستۂ نیاگان قلمم

☆

بلند پایہ سرا گرچہ من سخن سنجم!!
ولیک پیشۂ آبا بہ عالم اسباب

سپہبدی بد و از افراسیاب تا پدرم
ہمان طریقۂ اسلاف داشتند اعقاب

دلا وراں نگری تا پشنگ پشت بہ پشت
بہ پیش گاہ تو گر خویش را شوم نسّاب

من آن کسم کہ بہ توقیعِ مبدءِ فیّاض
شہِ قلمروِ نظمم دریں جہانِ خراب

ہمی کنم بہ قلم کارِ تیغ و این کاریست
شگرف و نغز و پسندیدۂ اولوا الالباب

☆

سلجوقیم بہ گوہر و خاقانیم بہ فن!!
توقیعِ من بہ سنجر و خاقان برابر است

☆

خلیجم ولے نور چشم محیطم
غریبم ولے روشناسِ جہانم

بہ مضمار دعویٰ خداوند رخشم
در اقلیمِ معنی جہاں پہلوانم

گرفتم کہ از تخم افراسیابم
گرفتم کہ از نسلِ سلجوقیانم

دل و دستِ تیغ آزمائی نہ دارم
رہ و رسمِ کشور کشائی نہ دانم

چہل سال توقیعِ معنی نبشتم
سزد گر نویسند صاحب قرانم

اُردو کے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

''میرا ہم قوم تو سراسر قلم رو ہند میں نہیں۔ سمرقند میں دو چار اور دشت خفچاق میں سو دو سو ہوں گے''۔

اقلیم ادب کی صاحب قرانی:

میرزا کے دادا اٹھارھویں صدی کے وسط میں ہندوستان آئے تھے اور فوجی خدمات انجام دیتے رہے۔ میرزا کے والد اور چچا کا پیشہ بھی سپہ گری اور تیغ زنی ہی رہا۔ ان دونوں کا انتقال یکے بعد دیگرے اس وقت ہوگیا، جب میرزا کم سن تھے۔ انگریزوں کے تسلّط کے باعث ہندوستان کے حالات بھی بالکل بدل گئے تھے اور ایسی فوجی خدمات کا سلسلہ ہی باقی نہیں رہا تھا، جن میں میرزا کے بزرگ مصروف رہے۔ یوں میرزا کے لیے آبائی پیشے سے وابستگی کا سوال ہی باقی نہ رہا۔ اسے بھی قدرت کی خاص مصلحت ہی سمجھنا چاہیے کہ میرزا کے لیے پوری زندگی اقلیم شعر و ادب میں صاحب قرانی کرتے ہُوے گزرنے کا موقع پیدا ہوگیا۔ آج ہم میرزا سے نسبت ہی کی بہ دولت ان کے بزرگوں سے روشناس ہوئے۔ جن فرماں رواؤں اور حکمرانوں کی مدح میں میرزا کے عالی شان قصیدے موجود ہیں، ان کے احوال سے بھی غالباً بہت کم اصحاب کو آگاہی ہوگی مگر خود میرزا نے بین الاقوامی حیثیت حاصل کرلی اور ان کی صد سالہ برسی کے لیے اہتمامات کی گونج رُوے زمین کے مختلف خطوں میں سُنی جاسکتی ہے۔ شعر و ادب میں ان کے مقام بلند کی روشن تر شہادت اور کیا ہوسکتی ہے؟ انھوں نے بالکل درست فرمایا تھا:

ہمی کنم بہ قلم کارِ تیغ و این کاریست
شگرف و نغز و پسندیدۂ اولوا الالباب

ذاتی حالات:

یہاں میرزا کے حالات تفصیلاً بیان نہیں کیے جاسکتے کیوں کہ اصل مقصودِ گفتگو کلام ہے جو اُن کی عظمت و برتری کی دستاویز ہے۔ صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ وہ دسمبر ۱۷۹۷ء میں بہ مقام آگرہ پیدا

ہوئے، جو خاصی مدّت تک ہندوستان کا دار الحکومت رہا۔ اوائل شباب میں دہلی منتقل ہو گئے، جو پہلے بھی قلبِ ہند تھی اور شاہ جہان کے عہد سے دوبارہ سلطنت کا مستقل مرکز بن گئی تھی، نیز اسے اسلامی حکومت کے آغاز ہی میں ملک کے سب سے بڑے سرچشمۂ علوم وفنون کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ مہلت عمر گزار کر میرزا اسی شہر کی آغوشِ خاک میں آسودۂ خواب ابد ہیں، وہی دہلی یا دلّی جس کے متعلق اقبال نے فرمایا:

سر زمیں دِلّی کی مسجود دل غم دیدہ ہے
ذرّے ذرّے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے

پاک اس اجڑے گلستاں کی نہ ہو کیوں کر زمیں
خانقاہِ عظمتِ اسلام ہے یہ سر زمیں

اقبال کا خراجِ تحسین:

اقبال نے ایک نظم میں میرزا کی شاعری کے محاسن جامعیت کے ساتھ پیش کر دیے تھے اور انھیں یورپی شاعروں میں سے جرمنی کے شاعر گوئٹے کا ہم نوا قرار دیا تھا۔ فرماتے ہیں:

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا ہے پرِ مرغِ تخیّل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو، بزمِ سخن پیکر ترا زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

محفلِ ہستی ترے بربط سے ہے سرمایہ دار جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیّل سے ہے قدرت کی بہار تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ زار
زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر محوِ حیرت ہے ثریّا رفعتِ پرواز پر

شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر   خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گلِ شیراز پر

آہ! تو اجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمرؔ میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

شعر کا جوہرِ حسن:

شعر کی اصل خوبی اور اس کا جوہرِ حسن آفاقیت اور ہمہ گیری ہے، یعنی جو کچھ کہا جائے، وہ معنویت کے اعتبار سے ماحول کی حدیں توڑ کر عام ہو جائے۔ ایک ملک، ایک قوم، ایک زبان کی پیداوار ہونے کے باوجود محدود نہ رہے، بل کہ عالمِ انسانیت کے زیادہ سے زیادہ حصے کی ترجمانی کرے۔ کسی دور، کسی عہد اور کسی خطے کے لوگ اس شعر کے مفہوم سے آشنا ہوتے ہی پکار اٹھیں کہ یہ انھیں کے لیے کہا گیا تھا، جب شاعر فطرت انسانی کی ترجمانی کرے گا تو کوئی وجہ نہیں کہ کسی ایک زبان یا عام اسالیب کی بنا پر اسے خاص مقام سے وابستہ کیا جائے یا عام انسانوں کے جذبات و احساسات کا آئینہ قرار نہ دیا جائے۔

میرزاؔ کی آفاقیت:

آفاقیت میرزا غالبؔ کی شاعری کا بھی ایک امتیازی وصف ہے لیکن اس وصف میں بھی ان کا رنگ سب سے الگ ہے۔ اولاً ان کے زیادہ تر اشعار ایک ملک یا ایک خطے میں نہیں، بل کہ پوری انسانیت کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ثانیاً ان اشعار کو ہر شعبۂ فکر و نظر کے مطالب سے ہم آہنگ کر لینا سہل ہے۔ موضوعِ تحریر و گفتگو فلسفہ ہو یا حکمت، تصوف ہو یا روحانیات، دین ہو یا تاریخ، پند و نصائح مقصود ہوں یا اخلاقی تلقینات، مذہبی وعظ پیشِ نظر ہو یا سیاسی بحث و تمحیص، میرزاؔ کے اشعار کا قالب اس درجہ لچکیلا اور ملائم ہے کہ آپ انھیں ہر موضوع میں استعمال کر سکتے ہیں اور ان سے ہر مضمون کی آرائش و زیبائش کے لیے سروسامان لے سکتے ہیں۔

شعرگوئی کا مرکزی نقطہ:

میرزاؔ کی شاعری کا مرکزی نقطہ میرے اندازے کے مطابق انسان اور اس کی اشرفیت و برتری ہے، وہ فرماتے ہیں:

ز آفرینشِ عالم غرض جز آدم نیست
بہ گردِ نقطۂ ما دورِ ہفت پرکار است

یہ کائنات کیوں تخلیق ہوئی؟ کیا اس لیے کہ پہاڑوں کی بلندی یا دریاؤں کی روانی یا سمندروں کا تلاطم یا اشجار کی شادابی، سایہ گستری اور ثمر وری یا صحراؤں کی تپش و تفسیدگی کی نمایش منظور تھی؟ ہرگز نہیں۔ صرف اس لیے معرضِ وجود میں آئی کہ انسان یہاں اشرف و اعلیٰ ہونے کے گوناگوں عملی ثبوت مہیّا کرے۔ وہ ایسا نظام تیار کرے جو حق و انصاف پر مبنی ہو۔ بلا امتیاز ہم جنسوں سے ہمدردی کی جائے۔ بلا قید افراد کی بہبود بروئے کار آئے۔ باہم لطف و محبت بڑھے۔ درندوں کی سی بے دردی و خونریزی کا خاتمہ ہو جائے تاکہ روئے زمین پر بہشت کی سی زندگی بسر کی جا سکے۔ مساوات و اخوت کا دور دورہ ہو۔ رنگ، نسل، خون یا اُونچ نیچ کے امتیازات یک قلم محو ہو جائیں۔ انسان کی اشرفیت کا پہلا اور آخری تقاضا یہی ہے۔ ایسا ہی انسان اس لائق ہے کہ کارگاہِ حیات کا پورا نظام پرکار کی طرح اس کے گرد گھومے۔

نظام اخلاق عالیہ:

یہ میرزا غالبؔ کا بنیادی نصب العین تھا۔ اسی کے لیے انھوں نے اوصاف و خصائص اور اخلاق عالیہ کی خاص شقیں پیش کیں، جو ان کے کلام میں جا بجا نظر آتی ہیں، جس شاعر نے انسان کے لیے یہ بلند نقطۂ نگاہ اختیار کیا، کیا یہ کہنا زیادہ سے زیادہ صحیح نہ ہوگا کہ اس نے دُنیا بھر کے انسانوں کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا؟ وہ ایک خطّے یا ایک ملک نہیں، تمام خطّوں اور تمام ملکوں کا شاعر ہے۔ خواجہ سنائی غزنوی نے یہی حقیقت بیان کی تھی، جب کہا تھا:

سخن کز روے دیں گوئی، چہ عبرانی چہ سُریانی
مکاں کز بہر حق جوئی، چہ جابلقا چہ جابلسا

اقبالؔ بھی اسی حقیقت کی ترجمانی کر رہا ہے:

نہ زباں کوئی غزل کی، نہ زباں سے باخبر میں
کوئی دل کشا صدا ہو، عجمی ہو یا کہ تازی

ترکی بھی شیریں، تازی بھی شیریں
حرفِ محبت ترکی، نہ تازی!!

بے تحسین مشقت اور بے غرض خدمت:

میرزا نے حقیقی اور سچی انسانیت کے جو اوصاف جا بجا بتائے ہیں، میں یہاں ان کی صرف چند جھلکیاں ہی دکھا سکتا ہوں۔ فرماتے ہیں:

انسان کی زندگی ”شمع شبستان“ اور ”بادسحرگاہی“ کی طرح گزرنی چاہیے۔ شمع سے مراد وہ بتیاں ہیں جو بجلی کی روشنی سے پیش تر موم یا چربی سے بنا کر روشنی کے لیے جلایا کرتے تھے۔ ”شمع شبستان“ رات بھر جلتی رہتی تھی۔ اس سے شعلے جھڑتے جاتے تھے۔ وہ سوز و گداز کا دُکھ اس لیے اٹھاتی تھی کہ دوسروں کی خاطر وظیفۂ نور پاشی بوجہِ احسن ادا ہو سکے، اسے اپنی تکلیف و اذیت کا کوئی غم نہیں تھا۔ اقبال نے بھی کہا تھا:

شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

صبح کے وقت ہلکی ہلکی ہوا چلتی ہے تو کلیاں کھل کھل کر پھول بنتی جاتی ہیں مگر ہوا نے اپنی اس اہم خدمت کے لیے کبھی کوئی اُجرت طلب نہیں کی۔ غرض اصل انسان وہی ہے جو خود دکھ کو اٹھائے، مشقتیں برداشت کرے اور دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔ زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دے مگر اس کے لیے طلب گارِ مُزد نہ ہو:

شعلہ چکد، غم کرا؟ گل شگفد، مُزد کو؟
شمعِ شبستانیم، بادِ سحرگاہیم

غیرت و حمیّت:

حقیقی انسان وہ ہے جو غیرت و حمیّت کا پیکر اور خود دار ہو۔ کسی بڑی یا چھوٹی غرض کے لیے نفس کی برتری کا دامن داغدار نہ ہونے دے۔ میرزا کہتے ہیں:

تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم
گر بہ موج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

فرض کیجیے کہ پیاس سے میری جان لبوں پر آ گئی ہو، اور دریا سامنے آ جائے، تاہم دل میں گمان گزرے کہ دریا کی سطح پر لہریں نہیں بل کہ اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئی ہیں کہ یہ شخص کیوں میرے پانی سے پیاس بجھانے کے لیے چلا آیا۔ یہ گمان پیدا ہوتے ہی میری غیرت و حمیّت جوش میں آ جائے گی اور میں پیاس سے مرجانا گوارا کرلوں گا لیکن دریا کے پانی سے ایک بوند بھی لبوں تک لے جانا حرام سمجھوں گا۔

ہمّت و مردانگی:

غیرت کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ انسان میں ہمت و مردانگی اعلیٰ پیمانے پر موجود ہو، جس کے بغیر کوئی اہم کام انجام نہیں پا سکتا۔ فرماتے ہیں:

مرد آنکہ در ہجومِ تمنا شود ہلاک
از رشک تشنۂ کہ بہ دریا شود ہلاک
نامرد را بہ لخلخہ آسایش مشام
مرد از تفِ سموم بہ صحرا شود ہلاک

دیکھیے جن سر بہ فلک چوٹیوں کو آسمان جھک کر چومتا ہے، وہ مردانگی ہی کی بہ دولت سر ہوئیں۔ اتھاہ سمندروں کے سینے چیر کر جہازوں کے لیے راستے پیدا کرنا جان بازوں ہی کا کام تھا۔ پھر بہادروں اور جوان مردوں نے قطبین کے برف خانوں کی چھان بین میں جانیں لڑائیں۔ اب ستاروں پر کمندیں ڈالی جارہی ہیں اور انسان خلاء میں اس طرح تیرتے پھرتے ہیں، جیسے ندیوں اور تالابوں پر آبی پرندے تیرتے نظر آتے ہیں۔ مردانگی ہی پر علم و فن کی ہر پیش رفت و ترقی کا انحصار ہے اور یہی تسخیرِ کائنات کے لیے ہر سبقت و اقدام کی روح رواں ہے۔

محنت طلبی اور جفاکشی:

انسان کا سب سے بڑا وظیفہ ہم جنسوں کی خدمت ہے۔ یہ وظیفہ ادا نہیں ہوسکتا جب تک اپنے آپ کو سختی، شدت اور جفاکشی کا عادی نہ بنالیا جائے، یہاں تک کہ آسانی اور سہولت بالکل بے لطف و بے کیف ہو جائے۔ میرزا کہتے ہیں:

چہ ذوق رہروی آں را کہ خارخارے نیست
مرو بہ کعبہ اگر راہ ایمنی دارد!!

جس سفر میں خلجان، پریشانی یا تکلیف کا کوئی اندیشہ نہ ہو اس میں مزا ہی کیا ہے؟ یہ بھی واضح رہے کہ انسان کسی کام میں جتنی زیادہ مشقتیں جھیلے گا، اتنی ہی اسے تکمیلِ کار پر مسرت ہوگی۔ اُردو کے ایک شعر میں اپنی مشقت طلبی اور مشکل پسندی کا اظہار کس ولولہ انگیز ذوق وشوق سے کرتے ہیں:

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

پاؤں میں چھالے پڑ جائیں تو تلووں میں منہدی یا کوئی دوا لگا کر پابند بستر ہو جاتے ہیں لیکن میرزا کے نزدیک علاج واستراحت قطعاً شایانِ التفات نہیں۔ وہ راستہ کانٹوں سے بھرا ہوا دیکھتے ہیں تو ان کا دل خوش ہو جاتا ہے کیوں کہ انھیں چھالوں کا علاج کانٹوں ہی سے کرنا پسند ہے۔ خدمت گزارانِ انسانیت جب تک ہر تکلیف واذیت برداشت کر لینے کی عادت نہ ڈالیں گے، راہ خدمت میں قدم ہی کیوں کر رکھ سکیں گے؟

اس مضمون کے شعر بھی ہیں مثلاً:

قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا!!
خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں
زخم سلوانے میں مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان رنج کی عادت ڈال لے گا تو رفتہ رفتہ اس کا احساس رنج خود بہ خود کند ہوتا جائے گا:

رنج سے خوگر ہُوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

صبر وثبات:

مشقت طلبی اور مشکل پسندی سے ملی ہُوئی ایک صفت وہ بھی ہے جسے صبر وثبات کہتے ہیں۔ یہ صفت اس وقت بروئے کار آتی ہے جب انسان کو اپنے معتقدات کی درستی اور سچائی کا یقین ہوتا ہے،

ایسا یقین جسے کائنات کی بڑی سے بڑی قوت بھی ہلا نہ سکے۔ میرزا فرماتے ہیں:

دوزند اگر بفرض زمیں را بہ آسماں
حاشا کزیں فشار بر ابرو خم افگنم

اگر زمین اور آسماں کو باہم ملا کر سی بھی دیا جائے اور انسان کی حیثیت بیچ میں وہی رہ جائے جو چکی کے پاٹوں میں دانے کی ہوتی ہے تو میں اسے کشادہ پیشانی سے برداشت کر لوں گا اور میری ابرو پر ایسی کوئی شکن نہیں پڑے گی، جسے میری قوت تحمل کے ضعف کا نشان قرار دیا جا سکے۔

جب تک انسان اپنے اندر صبر و ثبات کی ایسی قوت پیدا نہ کر لے وہ آزادی، اخوت، مساوات، انسانی برادری کے استحکام اور حق و انصاف کی کون سی خدمت انجام دے سکے گا؟

اخلاص و وفا:

نیکی، عبادت گزاری اور حسنِ عمل میں اخلاص کا تقاضا یہ ہے کہ اس کام میں کوئی بھی غرض شامل نہ ہو۔ نیکی اس لیے کرنی چاہیے کہ اعلیٰ اور اشرف انسان کی فطرت ہی نکوکاری ہے اگر اس کے خلاف کوئی فعل اس سے سرزد ہوتا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی انسانیت میں کوئی نقص راہ پا گیا ہے۔ ایک گروہ نیکی کا پابند اس بنا پر ہوتا ہے کہ دوسری زندگی میں جو موت کے بعد شروع ہوگی، بہشت میں جگہ پائیں گے، جہاں قسم قسم کی نعمتوں سے شاد کام ہوں گے۔ میرزا کے نزدیک ایسی نیکی کا صدور اخلاص عمل کے منافی ہے۔ اس کا دامن غرض سے آلودہ ہو جاتا ہے، لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اس غرض آلود نیکی سے بچنے کا تقاضا یہ ہے کہ بہشت کو اٹھا کر دوزخ میں ڈال دیا جائے:

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

اقبالؔ کی صدا بھی یہی ہے:

جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گزر، بادہ و جام سے گزر

یہ عرض کرنا تحصیل حاصل ہے کہ بے غرض نیکی کرنے والے کا اخلاقی درجہ بلند ہو جائے گا اور

اس کے اخلاقی قویٰ میں غیر معمولی بالیدگی پیدا ہو جائے گی۔

خدمت کا معیار بلند:

عالی پایہ انسان عمر بھر محنت و مشقت، خدمت خلق، اخلاص و وفا اور دُوسرے اعلیٰ انسانی اوصاف پر کاربند رہتے تو ہیں لیکن انھیں اپنی مسلسل نکوکاری پر اطمینان نہیں ہوتا۔ یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ جو کچھ وہ کر چکے ہیں کاش اسے زیادہ اچھے، زیادہ عمدہ اور احسن طریق پر کرنے کا موقع مل جاتا! ان کی زبانوں پر گزشتہ اور آیندہ دونوں کے لیے حرف ''کاشکے'' جاری رہتا ہے، جو فارسی زبان میں ''تمنا'' اور ''حسرت'' دونوں کے لیے مستعمل ہے۔ ''گزشتہ'' پر اس لیے کہ اگر چہ بہت کچھ کیا مگر اس سے زیادہ اور بہ درجہا عمدہ طریق پر کرنے کی حسرت دل میں رہ گئی، ''آیندہ'' پر اس لیے کہ وہ ابھی آیا نہیں اور تمنا ہے کہ آئے اور اس میں بہت کچھ کیا جائے:

آیندہ و گزشتہ تمنا و حسرت است
یک کاشکے بود کہ بصد جا نوشتہ ایم

انسانیت عالیہ کا کٹھن راستہ:

میرزاؔ کے نزدیک انسانیت کا یہ درجۂ بلند آسانی سے ہاتھ نہیں آتا۔ اس کے لیے بڑی محنت و مشقت اٹھانی لازم ہے۔ بہت سے خطرات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، خصوصاً ذاتی اغراض کے خطرات جو لغزش کا باعث بن سکتے ہیں اور ان کی وجہ سے قدم ڈگمگا سکتے ہیں۔ دیکھیے کس طرح درد میں ڈوب کر فرماتے ہیں:

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ!
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

انسان کی حیثیت زندگی کے سمندر میں ایک قطرے کی سی ہے۔ اس قطرے کو انسانیت عالیہ کی درخشندگی پا کر موتی بننا ہے لیکن سمندر کی ہر لہر ایک جال ہے جس کے حلقے تیار کرنے کے لیے سیکڑوں نہنگوں کے حلق استعمال ہُوئے اور نہنگ ایک نہایت خطرناک آبی جانور ہے۔ قطرے کو موتی بننے کے لیے ایسے خطرات سے گزرے بغیر چارہ نہیں، اسی بنا پر فرمایا:

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

ہر آدمی بہ اعتبارِ خلقت انسان ہے مگر اس کی فطرت کا ہر آلایش سے محفوظ رہنا اور اپنے اندر اعلیٰ انسانی اوصاف و خصائل پیدا کر لینا سہل نہیں، جس کے بغیر وہ حقیقتاً انسان نہیں بن سکتا۔ ہمارے سامنے انسانوں کی بیش تر مثالیں ایسی ہی ہیں کہ وہ ''آدمی'' ضرور ہیں مگر انسان کا اطلاق ہر ''آدمی'' پر نہیں ہوسکتا۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسانیت عالیہ کے لیے جدوجہد اور سعی و کوشش کا راستہ ترک کر دیا جائے یا آدمیوں کو تربیت دے کر انسان بنانے کی اہمیت سے غفلت برتی جائے حالاں کہ عالم انسانیت کی نجات اسی پر موقوف ہے۔

حقایق کائنات کا کھوج:

میرزا غالبؔ کے اشعار کا دامن حقایق کی فراوانی سے بھی لبریز ہے اور ان حقایق کا تعلق زندگی، علم، فن اور سائنس سے نہایت گہرا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یہ کائنات وجود میں آئی اور انسان کا ظہور ہوا تو ابتدائی دور میں اسے وہ تمام حقیقتیں، تمام بھید اور تمام ممکنات معلوم نہ تھے جو ہزاروں سال کی کاوش، کھوج اور غور و تحقیق سے اب تک منظر عام پر آچکے ہیں اور ان کا سلسلہ ہر دور میں افزایش پذیر رہا ہے۔ آگے چل کر خدا جانے کیا کچھ بروئے کار آجائے! اس سے ہم کس نتیجے پر پہنچتے ہیں؟ یہ کہ انسان نے ہر پردہ اٹھا کر چھان بین کی کوشش کی کہ اس کے پیچھے کیا ہے؟ اس طرح ایک ایک پردہ اٹھتا گیا اور نئی نئی حقیقتیں چہرہ کشا ہوتی رہیں۔ گویا جن چیزوں کو ہم حجاب یا پردے کہتے ہیں ان کی حیثیت اصل میں پردہ ہائے ساز کی تھی، جن سے نوائیں اور نغمے نکلتے ہیں۔ جن لوگوں نے راز کے ان نغموں اور ان نواؤں پر کان دھرا، ان کی تُنہہ دریافت کرنے کی کوشش کی، وہ تحقیق کی راہ پر قدم بڑھاتے اور علوم و فنون کے خزانے فراہم کرتے گئے، جن سے عالمِ انسانیت کو بیش بہا فائدے حاصل ہُوے، جنھوں نے ان پردوں کو محض پردے سمجھ لیا، وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔ میرزاؔ سب کو کائنات میں کھوج لگانے اور چھان بین کرنے کی دعوت

دیتے ہیں۔ فارسی میں فرمایا:

عالم آئینۂ راز است چہ پیدا، چہ نہاں
تابِ اندیشہ نہ داری، بہ نگاہے دریاب

یہ دنیا رازوں کا آئینہ ہے، خواہ اس کا کوئی حصّہ چھپا ہوا ہے یا ظاہر ہے۔ آئینے میں سب کچھ دیکھا جا سکتا ہے۔ چھپی ہُوئی چیزوں کے لیے غور و خوض اور اندیشہ و فکر کی ضرورت ہے اگر کسی میں ہمت نہیں کہ یہ کٹھن کام انجام دے سکے تو ظواہر میں صرف نظر سے کام لے کر بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے۔

یہی بات اُردو میں یوں کہی:

نہیں گر سر و برگ ادراک معنی
تماشائے نیرنگ صورت سلامت

علم وفن کے آغاز اور ان کی حیرت انگیز ترقیات پر نظر ڈالیے، جو کائنات میں چھان بین اور غور و فکر ہی کا نتیجہ ہیں۔ اس دنیا میں انسان کی زندگی کا ابتدائی دور انتہائی کمزوری، ضعف اور بیچارگی کا دور تھا۔ آج وہی انسان قدرت کی بڑی بڑی قوتوں کو قابو میں لا کر ان سے معجزہ نما کام لے رہا ہے۔

حقیقت مطلوب ہے نہ کہ مجاز:

میرؔزا بعض اوقات حقیقت کو ایسے دل پذیر انداز میں بیان کر جاتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کئی پردے نگاہوں سے یکایک اٹھ گئے مثلاً انسان ظاہری شان و شکوہ سے اس درجہ متاثر و مرعوب ہو جاتے ہیں کہ حقیقت پر ان کی نظر ہی نہیں رہتی۔ شاید بادشاہوں اور فرماں رواؤں نے اپنے گرد و پیش دبدبہ و جلال کے سامان اسی لیے فراہم کیے کہ ان کی انسانیت کسی کو نظر نہ آئے اور سمجھ لیا جائے کہ وہ ہر اعتبار سے غیر معمولی یا فوق البشر ہستیاں ہیں۔ میرؔزا نے ایک شعر میں حقیقت حال اس طرح واضح اور آشکارا کر دی کہ کسی کے لیے شک و ریب کی گنجایش ہی باقی نہ رہی۔ فرماتے ہیں:

نشاطِ جم طلب از آسماں، نہ شوکتِ جم
قدح مباش زیاقوت، بادہ گر غنی است

ایک شے ہے پیالہ، جو پینے کا ظرف ہے، ایک شے ہے شراب، جو پی جاتی ہے۔ انسان شراب

پیتا ہے، پیالہ نہیں پیتا۔ گویا دیکھنا چاہیے کہ شراب خالص انگوری ہے یا نہیں؟ پیالہ یاقوت کا ہو یا چاندی سونے کا اس سے مطلوب شے پینے میں کیا فرق پڑتا ہے؟ یاقوت کے پیالے میں کوئی شخص گندا پانی ڈال دے تو کون اسے پینے کے لیے تیار ہوگا؟ مٹی کے پیالے کو انگوری شراب سے بھر دیا جائے تو اسے لبوں سے لگانے میں کس کے لیے تامل کی گنجایش رہے گی؟ غرض نظر ظواہر پر نہیں بواطن پر رہنی چاہیے۔ مطلوب حقیقت ہے نہ کہ مجاز۔ یہی مضمون دوسرے مقام پر ایک اور شکل میں پیش کیا ہے۔

صورتے باید کہ باشد نغز و زیبا روزگار
گو بہ اکسونش مپوش و گو بہ دیبایش مپیچ

صورت نہایت اچھی ہونی چاہیے جو زمانے کے لیے باعث زیب و زینت ہو اگرچہ اس کے جسم پر مخمل یا دیبائے سیاہ کا لباس نہ ہو۔ یہاں بھی باطن پر زور دیا گیا ہے اور ظاہر کو بے حقیقت بتایا گیا ہے۔ معلوم ہے کسی بدوضع اور بدصورت شے کو عمدہ لباس پہنا کر حسین و جمیل اشیاء کی صف میں نہیں بٹھایا جا سکتا۔

کمال دقیقہ سنجی:

میرزا کا ایک کمال یہ ہے کہ وہ ہر صورتِ حال سے ایک نہایت عمدہ پہلو پیدا کر لیتے ہیں، جس کے معقول و مدلل ہونے سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا مثلاً ایران کے افسانوی بادشاہ جمشید کے جام کو عالمی شہرت حاصل ہے اور وہ بڑی ہی قیمتی شے مانی جاتی تھی مگر میرزا کہتے ہیں:

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغر جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

یقیناً جامِ جم ہر شخص کو مل نہیں سکتا اور ٹوٹ جانے کی حالت میں اس کا بدل مہیا کر لینا ممکن نہیں۔ یہ جام رہے گا تو ایک ہی کے پاس۔ سب اس سے فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔ پھر کیوں مٹی کے پیالے کو اس پر ترجیح نہ دی جائے؟ کیوں کہ اوّل وہ ہر شخص کو بہ آسانی مل سکتا ہے، دوم ٹوٹ جائے تو جھٹ بازار سے دوسرا لا سکتے ہیں۔ یہاں بھی حقیقت و معنویت ہی پر زور ہے نہ کہ ظاہر و مجاز پر۔

بلا اور بیم بلا:

نفسیات کا یہ نہایت اہم مسئلہ ہے کہ بلا کے نزول کا خوف و خطر نزول سے بہ درجہا زیادہ تشویش

و پریشانی کا باعث ہوتا ہے۔ جنگ چھڑنے کا اندیشہ ہو تو سب کے دل کانپتے ہیں، چھڑ جائے تو کسی کو زیادہ خوف باقی نہیں رہتا۔ میرزا نے یہ حقیقت ایک نہایت عمدہ پیرایے میں بیان کی ہے:

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیمِ بلاست
قعرِ دریا سلسبیل و روے دریا آتش است

جب تک کشتی سمندر کی سطح پر رہتی ہے، خطرہ لگا رہتا ہے کہ خدا جانے کب ڈوب جائیں۔ ڈوب جائیں تو سب خطرے ساتھ ہی ختم ہو جاتے ہیں لہٰذا سمندر کی سطح آگ ہے اور اس کی تہ سلسبیل جو بہشت کا ایک چشمہ ہے۔

انسانی ہنروری کی شان:

قدرت نے جو کچھ پیدا کیا اس میں کوئی ترتیب، کوئی تنظیم نہ تھی۔ انسان نے ان چیزوں میں نہ محض ترتیب پیدا کی، بل کہ اپنی ہنروری سے نئی نئی چیزیں نکال لیں:

برگ طرب ساختیم و بادہ گرفتیم
ہرچہ ز طبع زمانہ بیہدہ سرزد
شاخ چہ بالد گر ارمغانِ گل آورد
تاک چہ نازد اگر صلاے ثمر زد

تاک میں اگر انگور لگے تو اس پر فخر و ناز کا کون سا مقام ہے؟ یہ ہمارا کمال ہے کہ ہم نے انگوروں میں سے شراب پیدا کی اور عیش و شادمانی کا سامان فراہم کر لیا۔

سفر اور زادِ راہ:

فرماتے ہیں:

براہِ کعبہ زادم نیست، شادم کز سبکباری
بہ رفتن پاے برخارِ مغیلانم نمی آید

یہ بھی بہ ظاہر بُری صورتِ حال سے اچھا پہلو پیدا کر لینے کی ایک بدیع مثال ہے۔ انسان کہیں کے سفر کا قصد کرے تو اسے زادِ راہ لینا ضروری ہے۔ میرزا نے کعبے کا سفر اختیار کیا مگر سفر کے لیے توشہ

موجود نہ تھا۔ فرماتے ہیں کہ میں اس پر خوش ہوں کیوں کہ اگر توشہ موجود ہوتا تو بھاری بوجھ سر پر اٹھانا پڑتا اور بھاری بوجھ اٹھانے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ چلتے وقت پاؤں قابو میں نہ رہ سکتے۔ اب بوجھ سر پر موجود نہیں اور میں ہلکا پھلکا چلا جا رہا ہوں۔ کانٹے یا سنگ ریزے راستے میں نظر آتے ہیں تو ان سے بچتا ہُوا نکل جاتا ہوں۔ زادِ راہ کا بوجھ سر پر ہوتا تو یہ سہولت کہاں میسّر آتی؟

اس شعر میں میرزا نے قوتِ مشاہدہ کا بھی ایک اچھا مظاہرہ کر دیا یعنی یہ کہ انسان کے سر پر بھاری بوجھ ہو تو وہ چلنے میں ضبط و قابو پر قادر نہیں رہتا۔

قول و فعل میں ہم آہنگی:

انسانیت عالیہ کا تقاضا یہ ہے کہ ہر فرد کے قول و فعل اور گفتار و کردار میں پوری ہم آہنگی ہو۔ جو کچھ زبان سے کہے اس پر کاربند ہو اور کوئی ایسی بات لبوں پر نہ لائے جس پر خود عامل نہ ہو:

باخرد گفتم نشانِ اہلِ معنی باز گوی
گفت: گفتارے کہ با کردار پیوندش بود

قدرت کی حکمتیں:

یہ کائنات قدرت نے انسانوں کے فائدے کے لیے بنائی۔ اس کا ایک روشن ثبوت یہ بھی ہے کہ جان داروں کے وجود میں آنے سے پیش تر جمادات و نباتات ظہور پذیر ہوئے تا کہ جان دار بیمار ہوں تو جمادات و نباتات سے علاج کر سکیں:

چارہ در سنگ و گیاہ و رنج با جاندار بود
پیش ازیں کایں در رسد، آں را مہیّا کردہ ای

حق گوئی کا رتبۂ بلند:

میرزا جانتے ہیں کہ حرفِ حق برہنہ اور واشگاف انداز میں کہنا سہل نہیں، اس کی خاطر انسان کو بڑی سے بڑی اور کڑی سے کڑی سزا برداشت کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے:

آں راز کہ در سینہ نہان است نہ وعظ است
بر دار تواں گفت، بہ منبر نتواں گفت

تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ اہل حق نے ہمیشہ حق گوئی کی راہ میں کڑی سے کڑی سزائیں برداشت کی ہیں۔

معجز نما قوتِ مشاہدہ:

میرزا کی قوتِ مشاہدہ بڑی معجز نما ہے۔ دیکھیے موسمِ بہار میں درختوں کے جوش نمو کا نقشہ کس خوبی سے کھینچا ہے:

در شاخ بود موجِ گل از جوشِ بہاراں
چوں بادہ بہ مینا کہ نہان است و نہاں نیست

ان کی قوت مشاہدہ کو شاخوں کے اندر پھول موجزن نظر آتے ہیں اور مثال کتنی عمدہ ہے یعنی ان کی کیفیت ایسی ہے جیسے بوتل میں شراب ہو کہ بوتل میں چھپی ہوئی بھی ہوتی ہے اور عریاں بھی کیوں کہ سب کو صاف نظر آتی ہے۔

میرزا کے نزدیک یہ کائنات لحظہ بہ لحظہ اور لمحہ لمحہ بدلتی جاتی ہے اگرچہ ہمیں تبدیل و تغیر کا یہ عمل محسوس نہیں ہوتا:

در ہر مژہ برہم زدن ایں خلق جدید است
نظارہ سگالد کہ ہماں است و ہماں نیست

ہم جنسوں کے لیے دردمندی:

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں!

میرزا کے لیے انسانوں کا غم ناقابلِ برداشت تھا۔ دیکھیے اس شعر میں انھوں نے کتنی بڑی حقیقت سادہ الفاظ میں پیش کر دی ہے۔ فرماتے ہیں کہ جو انسان مسلسل دُکھوں، مصیبتوں اور گردش ہائے روزگار میں مبتلا ہیں، سوچیے کہ وہ اس صورتِ حال سے گھبرا جائیں اور پریشان ہو جائیں تو انھیں کیوں کر ملزم گردانا جا سکتا ہے؟ آخر وہ انسان ہیں۔ پہلو میں دل رکھتے ہیں، جو احساسات سے لبریز ہے، پیالے اور ساغر تو نہیں جو عمر بھر مجلسوں میں گھومتے رہتے ہیں لیکن دل اور احساس سے محروم

ہونے کے باعث انھیں اس گردش پر گھبراہٹ ہو ہی نہیں سکتی۔

رنج و راحت کا فلسفہ:

اگر کسی کو دُکھ پہنچتا ہے تو اسے راحت کا پیش خیمہ سمجھنا چاہیے۔ پاؤں ٹوٹ جائے تو معالج اور ڈاکٹر اس پر پلستر لگا دیتے ہیں، پتلی پتلی تختیاں رکھ کر مضبوطی سے باندھ دیتے ہیں تا کہ تمام شکستہ اجزاء ایک دوسرے سے پیوست ہو کر خوب جُڑ جائیں اور پاؤں درست ہو جائے:

بہ رنج از پئے راحت نگاہ داشتہ اند
زحکمت است کہ پاے شکستہ در بند است

یہ بجائے خود بہت بڑی حقیقت ہے، انسان محنت و مشقت میں دُکھ اٹھاتا ہے تو اپنے لیے، اہل و عیال کے لیے اور ہم جنسوں کے لیے راحت و آسایش کے سامان پیدا کرتا ہے، دُکھ نہ اٹھائے جائیں تو یہ راحت کہاں سے آئے؟

مردِ راہ کو انتباہ:

میرزا ''مردِ راہ'' کے لیے آسودگی کے قائل ہی نہیں۔ جسے مردانہ وار کٹھن منزل طے کرنی ہے وہ اگر کسی مقام پر پاؤں میں کانٹا چبھتے ہی اسے نکالنے بیٹھ جائے گا اور اتنی راحت بھی اپنے لیے جائز قرار دے لے گا تو سمجھ لینا چاہیے کہ قدم آگے بڑھا ہی نہیں سکے گا:

مجو آسودگی گر مرد راہی، کاندریں وادی
چو خار از پا بر آید، پا ز داماں بر نمی آید

متفرق اشعار:

اب میں میرزا کے متفرق اشعار بلا تشریح یہاں درج کر دینے پر اکتفا کرتا ہوں ورنہ مقالہ بہت زیادہ طویل ہو جائے گا:

عیش و غم در دل نمی استد، خوشا آزادگی
بادہ و خونابہ یکساں است در غربالِ ما

در دام بہرِ دانہ نیفتم، مگر قفس!
چنداں کُنی بلند کہ تا آشیاں رسد

بچہ گیرند عِیار ہوس و عشق دگر
رسمِ بیداد مبادا ز جہاں برخیزد

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

دمید دانہ و بالید و آشیاں گہ شد
در انتظارِ ہما دام چیدنم بنگر

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دل پذیر متاعِ ہنر کو میں

نقدِ خردم، سکۂ سلطاں نہ پذیرم
جنسِ ہنرم، گرمیِ بازار نہ دانم

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستاں کا

سب کہاں؟ کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

وفاداری بہ شرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہُوا

توفیق بہ اندازۂ ہمّت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ، ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ضعف سے ہے، نے قناعت سے یہ ترکِ جُستجو
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمت مردانہ ہم

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہُوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

محدود دائرہ انتخاب:

یہ اشعار محض فارسی اور اردو غزلیات غالبؔ سے لیے گئے ہیں۔ انتخاب میں صرف وہی شعر پیش

کیے گئے جنھیں ہر قوم و ملک کے ادب شناس بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ ایسے اشعار بھی بے شمار ہیں جنھیں ذہن نشین کرنے کے لیے ان زبانوں کے شعری محاسن سے خاصی روشناسی ناگزیر ہے جو میرزا کی سخن طرازی کا مدارِ خاص تھی۔ غزلیات میرزا کی شاعری کا بہ مشکل ایک چوتھائی حصہ ہیں۔ ان کے قصیدوں، مثنویوں، ترکیب بندوں وغیرہ میں منظر کشی، حقایق بیانی، مسائل و وقائع، اعجاز مشاہدہ، کمالاتِ فکر و نظر اور ہمدردی نوع بشر کے جو نگار خانے موجود ہیں ان کا بیان مقالوں نہیں، کتابوں کا متقاضی ہے۔

بے پناہ جذبۂ ہمدردی:

خصوصاً ہمدردی خلق میرزا کا ایک اہم مضمون ہے، اُردو کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

”قلندری و آزادگی، ایثار و کرم کے جو دواعی خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں، بقدر ہزار یک ظہور میں نہ آئے نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ٹین کا ایک لوٹا مع سُوت کی رسّی کے لٹکا لوں...... نہ وہ دست گاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی مگر جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو کوئی بھوکا ننگا نظر نہ آئے“۔

میرزا نے مستقل موضوعات پر بھی نظمیں کہیں جن کی مثالیں انیسویں صدی کے نصف کی فارسی اور اُردو شاعری میں شاذ ہی ملتی ہیں۔

اپنے متعلق پیش گوئی:

ایسے شاعر دنیا میں بہت کم ہیں، جنھیں بین الاقوامی شہرت اور وسیع اعتراف عظمت کا وہ بلند مقام حاصل ہوا، جس پر آج میرزا غالب فائز ہیں۔ آپ کو یہ سن کر شاید حیرت ہو کہ میرزا نے اس کے لیے بھی سوا سو سال پیش تر پیش گوئی کر دی تھی، جو اَب پوری ہو رہی ہے۔ فرماتے ہیں:

کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

(یہ مقالہ میرزا غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں روس بھیجا گیا)

ماہ نامہ اوراق لاہور سالنامہ و غالب نمبر۔ اپریل ۱۹۶۹ء

غالبؔ کی عظمت

میرزا غالب کی وفات پر تقویم ہجری کے اعتبار سے ایک سو سال یکم ذی قعدہ ۱۳۸۵ھ/ ۲۲ فروری ۱۹۶۶ء کو پورے ہوگئے تھے۔ تقویم عیسوی کے مطابق ایک صدی مزید دس روز میں پوری ہو جائے گی۔ صد سالہ برسی کے لیے تقویم عیسوی کا حساب غالباً اس مصلحت کی بنا پر ضروری سمجھا گیا کہ بیش تر ممالک میں ماہ و سال کا یہی قاعدہ رائج ہے۔

یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ فارسی اور اُردو شعر و ادب میں میرزا اپنے ہی دور نہیں بیش تر ادوار کی ایک یگانہ اور منفرد شخصیّت تھے۔ تیموریوں کے عہد کی فارسی کے وہ آخری عظیم القدر شاعر تھے جن کا رتبہ اکبر، جہان گیر اور شاہ جہاں کے رفیع المنزلت شعرا سے کسی طرح کم نہ تھا۔

خواجہ حالیؔ فرماتے ہیں کہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ مرحوم، میرزاؔ کو عرفیؔ اور ظہوریؔ کا ہم پایہ اور صائبؔ و کلیمؔ وغیرہ سے بہ مراتب برتر و بالا سمجھتے تھے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ کا قول میرزا کی نسبت یہ تھا کہ اس وسیع ملک میں فارسی شعر کی ابتدا ایک ترک لاچین یعنی امیر خسروؔ سے ہوئی اور ایک ترک ایبک یعنی میرزا غالبؔ پر اس کا خاتمہ ہوگیا۔ سید غلام علی وحشتؔ میرزاؔ کی نسبت کہتے تھے کہ اگر یہ شخص عربیت کی طرف متوجہ ہو جاتا تو عربی شعر میں دوسرا متنبّی اور ابو تمام ہوتا اور انگریزی زبان کی تکمیل کر لیتا تو انگلستان کے مشہور شاعروں کا مقابلہ کرتا۔

مولانا شبلیؔ مرحوم نے شعر العجم میں جہاں یہ ذکر کیا ہے کہ قاآنیؔ کی وجہ سے ایرانی شاعری میں انقلاب رونما ہوا وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ اگرچہ ہمارے اہل وطن کو خبر نہ تھی تاہم خود بخود یہاں بھی انقلاب ہوا یعنی شاعری کا مذاق جو ناصر علی وغیرہ کی بدولت سیکڑوں برس سے بگڑا چلا آتا تھا درست ہو چلا۔ میرزا غالبؔ نے شاعری کا انداز بالکل بدل دیا۔ ابتدا میں وہ بھی بیدلؔ کی پیروی کی وجہ سے غلط راستے پر پڑ گئے لیکن عرفیؔ، طالبؔ آملی، نظیریؔ اور کلیمؔ کی پیروی نے انھیں سنبھالا چناں چہ کلیات فارسی کے خاتمے میں اس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

میرزاؔ نے قصیدے میں متوسطین اور قدما کی روش اختیار کی اگرچہ قصائد میں متاخرین کی بعض بدعتیں بل کہ خامیاں بھی پائی جاتی ہیں لیکن اخیر اخیر میں بالکل اساتذہ کا رنگ آ گیا تھا مولانا شبلی نے اس رنگ کی مثالیں دی ہیں۔

پھر فرماتے ہیں کہ میرزا غالبؔ کی طبیعت میں نہایت شدّت سے اجتہاد و جدّت کا مادہ تھا اگرچہ قدما کی پیروی کی وجہ سے نہایت احتیاط کرتے ہیں تاہم اپنا خاص انداز بھی نہیں چھوڑتے مثلاً ایک قصیدے میں لکھتے ہیں:

خاکِ کویش خود پسند افتادہ در جذب سجود
سجدہ از بہرِ حرم نگذاشت در سیمائے من

اصل مضمون صرف اس قدر ہے کہ میں حرم کے بجائے ممدوح کی خاکِ کوچہ پر سجدہ کرتا ہوں۔ اسے ادا کرنے کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ خاک کوے ممدوح کی شکایت کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ اتنی مغرور و خود پسند ہے کہ میری پیشانی سے تمام سجدے کھینچ لیے۔ حرم کے لیے ایک بھی نہ چھوڑا۔

یہ میرزاؔ کے فارسی کلام کی کیفیت ہے جس کے لیے میں نے شعر و ادب کے ممتاز ترین اصحاب کی آراء گرامی زیادہ تر انھیں کے الفاظ میں پیش کر دیں۔ باقی رہی اُردو شاعری تو اس میں متعدد خصوصیات کے علاوہ میرزاؔ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ قدیم و جدید کے درمیان انھیں قدرت نے برزخ کا مرتبہ عطا کر دیا تھا انھوں نے شاعری کو ایسا پرداز دے دیا کہ اُردو میں نہایت دقیق و نازک خیالات بے تکلّف ادا کرنے کی گوناگوں صلاحیتیں آشکارا ہو گئیں وہ افق میرزاؔ ہی نے پیدا کیا تھا جس پر اقبالؔ کی شاعری کا آفتاب جہاں تاب طلوع ہوا۔ اقبالؔ نے میرزا غالبؔ پر جو بے مثال نظم لکھی تھی اس میں اعتراف عظمت کے علاوہ اُردو زبان پر میرزاؔ کے اس احسان کا جذبہ بھی صاف کارفرما نظر آتا ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میرزاؔ کی جزوی شاعری کے پیرو تو شاید مل ہی جائیں تاہم انھوں نے اردو نثر میں جو رنگا رنگ گلکاریاں آج سے کم و بیش سوا سو سال پیش تر شروع کی تھیں ان کی نظیر اب تک پیدا نہ ہو سکی۔ میرزاؔ کے مکاتیب میں اُردو انشا کے جتنے بدیع نمونے ملتے ہیں ان کا عشر عشیر بھی کہیں مہیا نہ ہو سکا۔

اقبالؔ نے میرزاؔ کے فطری جوہروں کی بے بہائی کا ذکر کرتے ہوئے کیا خوب فرمایا تھا:

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا   ہے پرِ مرغِ تخیّل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو، بزمِ سخن پیکر ترا   زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا

دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار   جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیّل سے ہے قدرت کی بہار   تیری کشتِ فکر سے اگتے ہیں عالم سبزہ دار

زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں
تابِ گویائی کی جنبش ہے لبِ تصویر میں

جس شاعر کا وجود اقبال کے سازِ فکر سے ایسے پرسوز اور روح افزا نغمے نکال سکتا ہے اس کی عظمت کے اعتراف میں کسے تامل ہوگا؟

میرزا نے فارسی میں کہا تھا:

کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

یعنی میرے اخترِ تقدیر کو عدم میں اوجِ قبولی حاصل تھا اور میری شاعری کی شہرت میرے بعد ہوگی۔ میرزا زندگی میں کم مشہور نہ تھے۔ پاک و ہند کے گوشے گوشے میں ان کی ناموری مسلّم تھی لیکن ان کی وفات کے بعد ایک دور ایسا بھی آیا کہ معلوم ہونے لگا، میرزا کی عظمت کا آفتاب چادرِ ابر میں پنہاں ہو رہا ہے آخر موجودہ صدی کے آغاز میں ان کی شہرت کا نیا دور شروع ہوا جس کی ابتدا میرے نزدیک ''یادگارِ غالب'' کی اشاعت سے ہوئی اور یہ اس کتاب کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اقبال کی شاعری نے بھی میرزا کی عظمت کے اہم پہلو آشکارا کر دیے۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ میرزا کی صد سالہ برسی بین الاقوامی پیمانے پر منائی جا رہی ہے اور اعترافِ عظمت کا یہ درجۂ بلند رحمتِ باری تعالیٰ نے میرزا کو سب سے پہلے عطا کیا۔

اقبالؔ نے ‘‘اسرارِ خودی’’ کی تمہید میں فرمایا تھا:

اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد
چشمِ خود بربست و چشمِ ما کشاد
رخت باز از نیستی بیروں کشید
چوں گل از خاکِ مزارِ خود دمید

موت کے بعد حیات نو کا غیر معمولی سانحہ گنتی کے جن ارباب کمال کو پیش آیا ان میں ایک میرزا غالبؔ بھی ہیں۔ اس کے اسباب پر مکمل بحث کا یہ موقع نہیں تاہم ایک سبب یہ بھی ہے کہ میرزا نے زندگی میں جو کچھ کہا تھا اس کا خاصہ بڑا حصہ اس زمانے کے لیے تھا جو ان کے بعد آنے والا تھا۔ ان کے آسمان فکر پر جو ستارے طلوع ہوتے رہے ان میں بیش تر ایسے بھی تھے جن کی موج نور سے ان کے ہم عصروں کی آنکھیں نامحرم تھیں اور ان کی درخشانی کا صحیح اندازہ کرنے والی نسلیں بعد میں ظہور پذیر ہونے والی تھیں۔ شاید اسی لیے میرزا نے کہا تھا:

ہوں گرمیِ نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

نیز فرمایا:

مطرب از شعرم بہ ہر بزمے کہ خواہد زد نوا
چاکہا ایثار جیب پیرہن خواہد شدن

ان پیش گوئیوں کی عملی حیثیت اور واقعیت آج دنیا کے سامنے ہے۔

اقبالؔ کو بھی ‘‘اسرارِ خودی’’ کی ترتیب کے وقت ایسا مرحلہ پیش آ گیا تھا چناں چہ فرماتے ہیں:

نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم، من نوائے شاعرِ فرداستم
عصرِ من دانندۂ اسرار نیست یوسفِ من بہرِ ایں بازار نیست
نغمۂ من از جہانِ دیگر است ایں جرس را کاروانِ دیگر است

کہا جا سکتا ہے کہ اقبالؔ نے ان اشعار میں اپنے ہی نہیں میرزا غالبؔ کے جذبات واحساسات کی ترجمانی بھی بہترین طریق پر کر دی یعنی میرزؔا کی جرس کے لیے جو قافلے مقدر تھے وہ ایک سال بعد مرحلہ پیما ہونے والے تھے۔

شعروادب میں اہل کمال کی قدر و منزلت خود ہمارے ذوق کی افتاد، اسلوب فکر ونظر کی شستگی و پاکیزگی اور صحت وعلو کی دستاویز ہے۔ یہ ایک قومی وانسانی فریضہ بھی ہے جس کی مناسب بجا آوری سے ہم گراں قدر میراث ثقافت اپنے نونہالوں تک پہنچا سکیں گے تاکہ وہ منازل کمال طے کرنے کی صحیح تربیت حاصل کر سکیں نیز یہ بیش بہا ثروت فکر ونظر دنیا کے سامنے پیش ہونی چاہیے جس سے ہماری عظمت و برتری کو چار چاند لگیں گے۔

اس تقریب کو محض ایک رسم نہ سمجھنا چاہیے جسے وقتی طور پر ادا کر کے سمجھ لیں کہ جو کچھ مطلوب تھا وہ ہو گیا۔ اس کے خاص تقاضے ہیں جنھیں پورا کرنے کے لیے ہمیں کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھنا چاہیے مثلاً:

۱۔ ضروری ہے کہ ہم میرزؔا کے کلام نظم ونثر سے خواہ وہ فارسی ہو یا اُردو جتنا زیادہ فائدہ اٹھا سکیں اٹھائیں۔

۲۔ نوجوانوں کے لیے اس سے استفادے کی وہ تمام تدبیریں عمل میں لائیں جو مختلف احوال و ظروف کے پیش نظر ضروری ہوں۔

۳۔ میرزؔا کے کلام کو تراجم کے ذریعے سے مختلف قوموں تک پہنچانے کا انتظام کریں۔

میرزؔا نے ایک صدی پیش تر تک جو کچھ کہا وہ ہماری ثقافت اور علمی میراث کا ایک گراں مایہ حصہ ہے اس کی حفاظت واشاعت کا فرض وسیع، سرگرم اور پیہم مساعی کا متقاضی ہے۔ مجھے امید رکھنی چاہیے کہ یہ بنیادی ضرورت ایک اہم مقصد ونصب العین کی حیثیت میں برابر ہم سب کے سامنے رہے گی۔

حضرات! میں نے آپ کا بڑا قیمتی وقت لے لیا۔ شکر گزار ہوں کہ مجھ عاجز کی دردمندانہ گزارشات آپ نے توجہ سے سماعت فرمائیں۔ اقبالؔ کی نظم کے آخری بند پر میں اپنی پریشاں گفتاری کو ختم کرتا ہوں:

اے جہان آباد، اے گہوارۂ علم و ہنر
ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در

ذرّے ذرّے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس وقمر   یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر

دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آب دار ایسا بھی ہے؟

(یہ مضمون ’’شام ہمدرد‘‘ کی تقریب میں پڑھا گیا)
منعقدہ ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل لاہور ۶ فروری ۱۹۶۹ء

میرزا غالبؔ کی شاعری کے بعض خاص پہلو

مانہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ
شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

میرزا غالبؔ کی شاعری کے کئی پہلو ایسے ہیں جن پر اب تک مرتب و جامع انداز میں سیر حاصل بحث نہیں کی گئی۔ میرزا پر بہت کچھ لکھا گیا۔ بے شائبہ مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے ہاں کے کسی شاعر کا ذکر اس تواتر و اہتمام سے شاید ہی کیا گیا ہو جس کی مثال ہمیں ہندوستان کے اس ''رند سخن پیشہ'' کے تعلق میں ملتی ہے۔ کتابوں سے قطع نظر کیجیے اگر وہ مقالات ہی جمع کر لیے جائیں جو مختلف جرائد و رسائل میں اب تک چھاپے گئے، تو یقین ہے کئی ضخیم جلدیں مرتب ہو جائیں۔ بعض رسائل نے تو سالہا سال سے التزام کر رکھا ہے کہ میرزا کی ہر برسی پر خاص نمبر مرتب کیا جائے۔ عجیب بات یہ ہے کہ نہ اس موضوع پر نئے مضامین و مقالات ملنے میں کوئی دقت پیش آتی ہے اور نہ میرے اندازے کے مطابق اربابِ ذوق کو طلب و تشنگی میں کوئی کمی محسوس ہوتی ہے، تاہم میرے محدود علم کی حد تک بعض پہلو ابھی تک یقیناً تشنۂ فکر و ترتیب ہیں۔ میں نے مناسب سمجھا کہ ان کا ذکر سرسری طور پر کردوں۔ شاید اس طرح اربابِ علم و نظر کی توجہ ان کی طرف منعطف ہو جائے اور یوں ہمارے لیے تحقیق و کاوش کا ایک نیا گراں قدر سرمایہ وجود میں آ جائے۔

ایک پہلو یہ ہے کہ میرزا نے شاعری میں کئی نئی چیزیں پیدا کیں جو ان سے پیش تر کہیں نظر بھی آتی ہیں تو نہ ان کی حیثیت ممتاز و نمایاں ہے اور نہ ان کی جزئیات میں ایسی جامعیت ملتی ہے جو میرزا کے ہاں پائی جاتی ہے۔ ایسی جدتیں فارسی میں بھی خاصی ہیں لیکن اُردو میں ان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

اُردو شاعری میں میرزا نے ایسا اسلوب اختیار کیا جس سے اس کی زبان کے ممکنات ارتقا کمال پر پہنچ گئے اور ہر نوع کے مطالب بے تکلف بیان کرنے کی ایسی صلاحیتیں آشکارا ہو گئیں جو میرزا سے پہلے یا تو بروئے کار نہیں آئی تھیں یا ان میں ویسی وسعت اور دقیق جزئیات کے اظہار کی ہمہ گیری نہ

تھی۔ اس اعتبار سے میرزا قدیم و جدید کے درمیان ایک زریں سلسلے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میرے محدود علم کے مطابق ان کی شاعری کے اس پہلو پر اب تک زیادہ غور و فکر نہیں کیا گیا حالاں کہ یہ ان کی عظمت و رفعت کا اہم وثیقہ ہے۔

اس ضمن میں یہ عرض کر دینا بھی غالباً نامناسب نہ سمجھا جائے کہ نظم کے علاوہ میرزا نے اُردو نثر میں بھی ایک بدیع انداز کی طرح ڈالی۔ ان کی وفات پر ایک صدی گزر چکی ہے۔ اس مدّت میں عالی منزلت ادیبوں کی ایک طویل صف کے درخشاں کارنامے اُردو زبان کا پرچم گراں مائیگی اوج ثریا پر پہنچا چکے ہیں لیکن میرزا کی اُردو نثر آج بھی مختلف اعتبارات سے یگانہ و یکتا ہے۔ جس طرح گلستان کی فارسی سات سو سال کے بعد بھی ویسی ہی تازہ و دل کش معلوم ہوتی ہے جیسی سعدیؔ کے عہد میں ہوگی۔ اس طرح میرزا غالبؔ کی اُردو نثر بھی کئی صدیاں گزر جانے کے باوصف بدستور تازگی و دل کشی کا مرجع بنی رہے گی۔

بیس پچیس سال یا اس سے بھی پیش تر ہمارے ہاں ایک عجیب مشغلہ شروع ہو گیا تھا یعنی مختلف اصحاب نے میرزا غالبؔ کے بعض اُردو اشعار سے بہ ظاہر جزواً ملتے جلتے اشعار بعض فارسی اساتذہ کے کلام سے چُن کر پیش کر دیے اور دعویٰ کیا کہ میرزا پر تو سرقے کا الزام عاید ہوتا ہے۔ ایک صاحب نے تو (اللہ انھیں معاف کرے) اسے اپنا مستقل وظیفہ قرار دے لیا تھا۔ شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس کے کلام سے چند ایسے اشعار نہ چنے جا سکیں جنھیں مطالب و معانی کی اک گونہ جزوی مشابہت کے اعتبار سے ''سرقے'' کے تحت نہ لایا جا سکے یا متقدم اساتذہ کی بعض اچھی تراکیب سے متاخرین نے فائدہ نہ اٹھایا ہو لیکن کوئی حق پسند اسے سرقہ قرار نہ دے گا۔ میرزا غالبؔ کی زندگی میں بھی غالباً ایسا ہی کوئی واقعہ پیش آیا ہو گا جس پر انھوں نے مزاحاً کہہ دیا کہ:

مبر گمانِ توارد، یقیں شناس کہ دزد!!
متاعِ من زِ نہاں خانۂ ازل بردہ است

تاہم ظاہر ہے کہ حقایقِ علمیہ لطیفہ بازیوں کی بنا پر بے اصل نہیں بن سکتے۔ اسی طرح جو افسانے محض ظنون و اوہام کے تار و پود سے تیار ہوئے ہوں وہ اس وجہ سے حقیقت کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے کہ چند افراد انھیں وقتاً فوقتاً دہراتے رہے۔ اہل علم و نظر کا وظیفہ یہی تھا کہ ایسے تمام اشعار بالمقابل رکھ کر جائزہ لیا جائے کہ الزام کی حقیقی حیثیت کیا ہے۔ آیا واقعی میرزا غالبؔ نے کوئی پرانا مضمون کسی

شاعر ماضی کے کلام سے اخذ کیا اور اسے اٹھا کر اپنے الفاظ میں باندھ دیا؟

ایک نہیں، بیسیوں مضامین مل جائیں گے جو ابتدا میں کچھ تھے۔ مختلف اساتذہ نے ان میں اضافوں یا بندش میں گوناگوں ترتیبات کے بعد کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ یہ نہ سرقہ ہے نہ توارد، یہی سمجھا جائے گا کہ ایک نکتہ کسی شاعر کو سُوجھا لیکن وہ اس کے تمام پہلوؤں کا حصر نہ کر سکا۔ دوسرے بالغ نظر شاعر نے اس نکتے کے اطراف و جوانب پر زیادہ گہری اور حقیقت شناس نظر ڈالی اور اسے بالکل نیا رنگ دے دیا۔ اس کی متعدد مثالیں میرے سامنے ہیں لیکن پیش نظر گزارشات کا ہر حصّہ مثالوں سے مزیّن کرنا چاہوں تو سلسلۂ بیان بہت طویل ہو جائے گا۔ جس حد تک مجھے علم ہے یہ کام بھی ہنوز انجام نہیں پا سکا۔

ایک پہلو یہ ہے کہ میرزا غالبؔ کے فارسی کلام میں متعدد اشعار ایسے ہیں جو نفس مضمون کے اعتبار سے فارسی کے بعض مشہور اساتذہ کے اشعار سے مشترک معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کا اسلوب اور انداز بیان ایسا ہے جس سے بادی النظر میں اشتراک کا وہم بھی دل میں نہیں گزر سکتا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ میرزا نے اصل مضمون کو زیادہ موثر، زیادہ دل نشین اور زیادہ حقیقت افروز بنانے کی غرض سے نفس مضمون کا بنیادی اشتراک بے تکلف گوارا کر لیا۔

مثلاً عرفیؔ کا ایک شعر ہے:

بہتر از شرم گناہ است نہ بخشیدنِ جرم
تو مرا عفو مکن جرمِ من از یاد ببر

یعنی میرا گناہ بخشا گیا تو اس پر شرم دامن گیر ہو گی جو میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ اے رحیم و کریم تو مجھے معافی نہ دے۔ اپنی رحمت بے کراں سے ایسا کر کہ گویا تو نے میرا گناہ بالکل نظر انداز کر دیا ہے، بھلا دیا ہے۔

میرزا غالبؔ کہتے ہیں:

ہفت دوزخ در نہادِ شرمساری مضمر است
انتقام است ایں کہ با مجرم مدارا کردہ ای

اے بخشندۂ عصیاں تو نے اپنی رحمت سے میرے گناہوں پر خط عفو کھینچ دیا، تیری شان کریمی کا تقاضا یہی تھا۔ اس سے مجھے جو ندامت و شرمندگی لاحق ہوئی اس کا دُکھ، اس کا قلق اور اس کی اذیت میرے لیے سات دوزخ کے عذاب سے کم نہ تھی اگر گناہوں کے لیے سزا دی جاتی تو ندامت و

شرمندگی کی تعذیب سے زیادہ مصیبت خیز نہ ہوتی۔

دیکھیے عرفیؔ اور غالبؔ دونوں کا اصل مقصد یہ ہے کہ گناہ کے خلاف ہم جنسوں کے دل میں حد درجہ بے پناہ جذبہ پیدا کر دیں۔ ان کے شرفِ انسانیت کا احساس اس پیمانے پر بیدار کر دیں کہ وہ رضائے باری تعالیٰ کے خلاف ایک قدم بھی نہ اٹھائیں۔ نافرمانی سے دُور بھاگیں۔ اس کی رحمت پر بھروسا کرتے ہوئے حساب کے دن اس ندامت کا تختۂ مشق نہ بنیں، جس کا عذاب دوزخ کے انتہائی عذاب سے کم نہ ہوگا، کم از کم اس انسان کے لیے جو شرفِ انسانی کی غیرت سے بالکل محروم نہ ہو۔

غرض ایک اہم کام یہ بھی تھا کہ ایسے اشعار پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر کے بعد اندازہ کیا جاتا کہ اصل مضمون ادا کرنے میں زیادہ کمال کس نے دکھایا۔ زیادہ تاثیر و نفوذ کس انداز بیان میں ہے۔ اس پر بھی اب تک زیادہ توجہ نہیں کی گئی۔

ایک پہلو یہ بھی تھا کہ میرزا غالبؔ نے بعض ہم معنی یا تقریباً ہم معنی اشعار فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں کہے ہیں۔ ان پر غور کیا جاتا اور دیکھا جاتا کہ مضمون بہتر طریق پر کس زبان میں ادا ہوا اور معنویت کے اعتبار سے زیادہ تاثیر کس میں پیدا ہوئی۔ فارسی کے بعض اشعار ایسے بھی ہیں جن سے اُردو کے ہم معنی یا تقریباً ہم معنی اشعار سمجھنے میں سہولت پیدا ہوتی ہے۔

میں نے سرسری طور پر فارسی دیوان کی ورق گردانی کی تو چوبیس پچیس اشعار صرف غزلیات میں ایسے نکل آئے جن کے ہم معنی یا تقریباً ہم معنی اشعار اُردو میں موجود ہیں۔ ان سب پر یہاں مفصل بحث تو ممکن نہیں لیکن مثالاً چند اشعار پیش کر دینا مناسب ہے۔ یہ کام بھی ضرور ہونا چاہیے۔

میرزا غالبؔ کا مسلمہ اصول یہ ہے کہ شوق حالتِ وصل میں بھی تسکین نہیں پاتا اور اس کے اضطراب و بے تابی میں مطلقاً فرق نہیں آتا۔ فارسی میں کہتے ہیں:

بلبل بہ چمن بنگر و پروانہ بہ محفل
شوق است کہ در وصل ہم آرام نہ دارد

بلبل کا محبوب پھول ہے تاہم دیکھیے کہ وہ پھولوں کے مرکز یعنی گلستان میں آہ و فغاں کرتی رہتی ہے گویا محبوب کے جلووں کی فراوانی بھی اس کا عشق چھین نہیں لیتی۔ یہی کیفیت محفل میں پروانے کی ہے۔ اس کی محبوب شمع ہے۔ جس کی روشنی میں محفل جمتی ہے۔ پروانہ شمع کو دیکھتے ہی تڑپ تڑپ کر اس

پر گرتا ہے اور جب تک جل کر خاکستر نہیں ہو جاتا اسے آرام نہیں آتا۔

یہ مثالیں اس حقیقت کا روشن ثبوت ہیں کہ:

شوق است کہ در وصل ہم آرام نہ دارد

یہ باغ اور محفل کا مشاہدہ تھا۔ اب اُردو میں ایک اور مشاہدہ ملاحظہ فرمایئے:

گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال
موج محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

موج سمندر سے ہم آغوشی کی حالت میں بھی برابر بے تاب و مضطرب ہوتی ہے اور مسلسل ہاتھ پاؤں مارتی جاتی ہے۔ یہ بھی اس حقیقت کی دستاویز ہے کہ سچا عشق حالت وصل میں بھی تسکین نہیں پاتا اور نہیں پا سکتا۔ وہ زوال سے کاملاً محفوظ و مصئون ہے۔

فارسی میں کہتے ہیں:

چرا بہ سنگ و گیا پیچی اے زبانۂ طور
زراہ دیدہ بہ دل در رو و زجاں برخیز

اے طور کے شعلے تو جمادات و نباتات سے کیوں لپٹتا ہے۔ پتھر اور شجر کو کیوں اپنی جمال آرائی کی تماشا گاہ بناتا ہے۔ تیرے لیے یہی زیبا ہے کہ ہماری آنکھوں کے راستے دل میں اتر جائے، پھر جان سے بھڑک اٹھے۔

اُردو میں کہتے ہیں:

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

فارسی میں محض یہ کہہ کر معاملہ ختم کر دیا تھا کہ زبانہ طور کا اصل مقام ہمارا دل اور ہماری جان ہے لیکن اُردو شعر میں اس کے لیے ایک دلیل بھی دے دی، یعنی یہ کہ شراب خوار کو شراب اس کے ظرف کے مطابق دیتے ہیں۔ طور پہاڑ یا نخل طور کا اتنا ظرف کہاں کہ برق کا متحمل ہو سکے۔ یہ ہمت و حوصلہ صرف انسان میں ہے۔

فارسی میں کہا:

گریہ کرد از فریب و زارم کشت
نگہ از تیغ آب دار تر است

اُردو میں فرماتے ہیں:

کرے ہے قتل عداوت میں تیرا رو دینا
تیری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

فارسی:

جنت نہ کند چارۂ افسردگیِ دل!!
تعمیر بہ اندازۂ ویرانیِ ما نیست

اُردو:

دیتے ہیں جنّت حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

غرض یہ میدان بھی خاصا وسیع ہے اور کچھ عجب نہیں قصیدوں، قطعات، رباعیات میں اور زیادہ مثالیں مل جائیں۔ مثلاً ایک قصیدے میں فرماتے ہیں:

نگہم نقب بہ گنجینۂ دلہا می زد
مژدہ باد اہلِ ریا را کہ زمیداں رفتم

یہ مضمون اُردو میں یوں پیش کیا:

تھی نگہ میری نہاں خانۂ دل کی نقاب
بے خطر جیتے ہیں اربابِ ریا میرے بعد

آخر میں گزارش ہے کہ ان پہلوؤں پر بھی اربابِ ذوق کو توجہ اور غور و فکر کرنا چاہیے۔ اس طرح مطالعۂ غالب کے سلسلے میں نئے میدان ہمارے سامنے آجائیں گے اور ہمارے لیے دقائق شعر ذہن نشین کرنا سہل ہو جائے گا۔

(آج کل۔ دہلی۔ فروری ۱۹۶۷ء)
گنجینۂ غالب۔ پبلی کیشنز ڈویژن دہلی ۱۹۶۹ء

فکرِ غالبؔ کی معجز نمائیاں

چند غور طلب مثالیں

درتہِ ہر حرف غالبؔ چیدہ ام میخانۂ
تا ز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن

شعر کے بڑے عنصر دو ہیں: حسن تخیل اور لطف ادا، یعنی مضمون اچھوتا، دل پذیر، بلند اور حقائق زندگی سے گہری وابستگی کا حامل ہو اور اسے بیان ایسے انداز میں کیا جائے کہ کوئی ضروری گوشہ نظر انداز نہ ہونے پائے پھر اسلوب بالکل طبعی اور فطری ہو، اسے عملی زندگی سے جتنا گہرا تعلق ہوگا اسی کے تناسب سے وہ دلوں کو لبھائے گا اور زبانوں پر جاری ہو جائے گا۔

میرزا غالبؔ کی متعدد خصوصیات ہیں جن کی جامعیت کے باعث وہ شعر کی دنیا میں عظمت کے بلند مقام پر فائز ہو گئے بل کہ حقائق بیانی میں روشنی کا ایسا مینار بن گئے جس کی جلوہ ریزیوں اور نور پاشیوں سے افق حیات برابر درخشاں رہے گا۔ قدرت نے انھیں ایسی ہمہ گیر و ہمہ رس نظر عطا کی تھی کہ وہ ہر مضمون کے طبعی و فطری ماحول کا اندازہ ٹھیک فرما لیتے تھے یہاں تک کہ کوئی ضروری تصریح طلب پہلو ان سے اوجھل نہیں ہونے پاتا تھا پھر اسے بیان کرنے میں ایسا انداز اختیار کر لیتے تھے جس میں مضمون کے تمام پہلوؤں کا استقصا بوجہ احسن ہو جاتا۔ شعر کی معنویت سے پوری طرح آگاہی حاصل کر لینے کے بعد خود بخود یہ حقیقت بھی ہر فرد پر واضح ہو سکتی ہے کہ اس سے بہتر انداز بہ ظاہر ممکن ہی نہ تھا۔

مصطفیٰ خاں شیفتہؔ کا بیان:

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ مرحوم نے ''گلشن بیخار'' میں میرزا کے متعلق لکھا ہے:

''مضامین شعری را کما ہو حقہ می فہمد و بہ جمیع نکات و لطائف پے می برد و ایں فضیلتی

است مخصوص بعض اہل سخن اگر طبع سخن شناس داری بہ ایں نکتہ وارسی چہ خوش فکر اگر چہ کمیاب است اما سخن فہم کمیاب تر...... بالجملہ چنیں نکتہ سنج، نغز گفتار کم تر مرئی شد‘‘۔

اس اقتباس کا مفاد یہ ہے:

۱۔ میرزا غالب مضامین شعری کو اسی طرح سمجھتے ہیں جو سمجھنے کا حق ہے۔
۲۔ وہ تمام نکات و لطائف کی تہ تک پہنچتے ہیں۔
۳۔ اس حقیقت کا صحیح اندازہ صرف سخن شناس طبیعتیں ہی کر سکتی ہیں۔
۴۔ اگر چہ خوش فکر بھی کمیاب ہیں مگر سخن فہم کمیاب تر ہیں۔
۵۔ غرض ایسا نغز گفتار نکتہ سنج بہت کم دیکھا گیا۔

اُردو مکاتیب میں مثالیں:

واضح رہے کہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ’’عہد غالب‘‘ کے بہت بلند مرتبہ سخنور اور نکتہ شناس بزرگ تھے اور میرزا کے متعلق انھوں نے جو کچھ فرمایا اس کی تائید میں میرزا کے اُردو مکاتیب سے متعدد عبارتیں پیش کی جا سکتی ہیں جن میں انھوں نے عرؔفی یا ظہوریؔ کے اشعار یا بعض اپنے اشعار کی شرح کی ان عبارتوں سے پورا اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس طرح شعر کا ایک ایک جملہ اور لفظ ان کے پیش نظر رہتا تھا اور وہ ایک بھی حرف کو معنویت کی آرایش میں بے مصرف یا بے محل نہیں سمجھتے تھے۔

جس فردِ فرید کو خوش فکری کے علاوہ خوش فہمی میں یہ درجۂ کمال حاصل تھا، غور فرمایئے کہ اس کے اپنے اشعار میں یہ نادر صلاحیت کس اعلیٰ پیمانے پر صرف ہوئی ہوگی۔ ذیل میں اسی صلاحیت کی بعض کرشمہ فرمائیوں کا ایک سرسری خاکہ پیش کرنا منظور ہے۔ اس کی روشنی میں آپ میرزا کے پورے اردو اور فارسی کلام کا جتنا مطالعہ فرمائیں گے یقین ہے کہ اس سے میرزا کی عظمت و برتری کا زیادہ گہرا نقش آپ کے قلب و ذہن پر مرتسم ہوتا جائے گا۔

میرا انتخاب کردہ موضوع پیچیدہ نہیں تاہم تمہید میں ایک مثال پیش کر دینے سے آپ پر اصل مدعا زیادہ واضح ہو جائے گا۔ سب سے پہلے آپ اس مثال پر غور فرمالیں۔

عرؔفی کا ایک شعر:

عرفی کے ایک نعتیہ قصیدے کا یہ شعر ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے کہ:

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم
چناں کہ حرفِ عصا گفت موسیٰ اندر طور

ظاہر ہے کہ عرفیؔ نے دراز نفسی کے لیے جو مثال چنی وہ سورۂ طٰہٰ کی چند آیات کریمہ سے ماخوذ ہے۔

طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا گیا تھا کہ اے موسیٰ تیرے دہنے ہاتھ میں کیا ہے؟ عرض کیا کہ یہ میرا عصا ہے (ھذا عصای)

اصل سوال کا جواب اتنا ہی تھا اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی یعنی یہ پوچھا نہیں گیا تھا کہ جو کچھ تیرے دہنے ہاتھ میں ہے اس سے کیا کیا کام لیا جاتا ہے تاہم حضرت موسیٰ علیہ السلام اصل جواب پر رُکے نہیں بل کہ عرض کرتے گئے کہ اس عصا سے میں:

> ''چلنے میں سہارا لیتا ہوں۔ اپنی بکریوں کے لیے درختوں سے پتے جھاڑتا ہوں اور میرے لیے اس میں اور بھی گونا گوں فائدے ہیں''۔

سوال پیدا ہُوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے کس بنا پر جواب کو اصل حدود سے آگے بڑھایا؟ کلام کو طول کیوں دیا؟ عرفیؔ نے اپنی دراز نفسی کا جواز پیش کرتے ہوئے کہہ دیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام لذتِ گفتگو کی محویّت میں جواب کو پھیلاتے گئے کیوں کہ عرفیؔ کے نزدیک دراز کلامی کا سبب یہی تھا۔

''لذتِ حکایت'' یا ''ذوقِ حضوری'':

یہ معاملہ ہمارے حضرت علاّمہ اقبال کو بھی پیش آیا تو انھیں عرفیؔ کی توجیہ پسندیدہ معلوم نہ ہوئی اور حقیقت یہ ہے کہ اس توجیہ کو حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے مقام کلام سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ علاّمہ نے بالکل نئی توجیہ پیش کی اور آپ کو سنتے ہی یقین ہو جائے گا کہ حقیقی، صحیح اور اوفق وہی تھی جس پر علاّمہ کی نگاہ نکتہ رس پہنچی، کہتے ہیں:

بہ حرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را

یعنی دنیا بھر کی تمنائیں اور آرزوئیں حقیقتاً ایک حرف میں ادا کی جا سکتی ہیں جس طرح عرفیؔ کہتا ہے:

تمام بود بہ یک حرف گرم و ما غافل
حکایتے کہ ہمہ ناتمام می گفتند

لیکن مجھے ذوق حضوری کی والہیت نے داستان طرازی پر مائل کر دیا۔

حق یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کلام کا پھیلاؤ ”ذوق حضوری“ ہی کا کرشمہ تھا کیوں کہ جب تک معروضات کا دامن وسیع ہوتا جاتا، شرفِ حضوری حاصل رہتا۔ حضرت کلیم اللہ علیہ الصلوٰۃ و السلام کا مقصود حقیقی اپنی داستان کی لذّت نہیں ہو سکتا تھا صرف ”ذوق حضوری“ ہی ہو سکتا تھا۔

عرفیؔ بہت بڑا شاعر تھا کسی ایک معاملے میں صحیح توجیہ تک نارسائی کے باعث اس کی عظمت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا اور یہ بھی واضح رہے کہ قدرت ہر معاملے میں حقائق کے دروازے کسی ایک ہی قلب پر نہیں کھول دیتی۔ عرفیؔ نے خود ایک قصیدے میں ابو الفرج اور انوریؔ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بے شک:

اول رہِ ایں نظم خود ایشاں بہ سپردند
پس باز نمودیم بہم منزل ہم را

میرزاؔ کا ایک شعر:

اس تمہیدی تحریر کے بعد آپ میرزا غالبؔ کا ایک سادہ سا اُردو شعر ملاحظہ فرمائیں:

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

نہایت سلیس اور عام فہم الفاظ ہیں، جنھیں پڑھتے وقت خاص معنویت کا احساس نہیں ہوتا اور مجھے یقین ہے کہ شاید ہی کسی کی نگاہیں اس شعر پر رُکی ہوں یا اس پر خاص غور و فکر کی ضرورت سمجھی گئی ہو لیکن آپ سوچیں گے تو اس میں معارف کا ایک عجیب و غریب مرقع نمودار ہوگا اور پتا چلے گا کہ اس کا ایک بھی لفظ ایسا نہیں جو میرزا کے اس شعر کا مصداق نہ ہو:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

معارف کی دُنیا:

۱۔ اس شعر کا مرکزی مضمون وفا ہے لیکن وہ وفا نہیں جس کا ذکر اُردو اور فارسی کے بے شمار اشعار میں ملتا ہے حالاں کہ اس کی اصل حقیقت سے نہ کہنے والوں کے قلوب واذہان آشنا ہوتے ہیں اور نہ سننے اور پڑھنے والوں پر اس سے کوئی اثر مترتب ہوتا ہے۔ شاید ایسے ہی عالم تاثرات میں میرزا نے کہا تھا۔

ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

۲۔ وفا کا مطلب ہے اہم اور بلند مقاصد کے لیے استقلال و استقامت کے ساتھ جدوجہد کا پیمان باندھنا اور کسی بھی حالت میں اس سے روگرداں نہ ہونا۔

۳۔ اس پیمانِ وفا کے واجبات ولوازم کی بجا آوری سہل نہیں۔ جب ابتلا و آزمایش کی زہرہ گدازیوں سے سابقہ پڑتا ہے تو بڑے بڑے جانبازوں اور فداکاروں کے پائے ثبات میں تزلزل آجاتا ہے۔

۴۔ میرزا کہتے ہیں کہ پیمانِ وفا باندھ تو لیا تھا لیکن قدم قدم پر آفات وحوادث کے طوفان اٹھنے شروع ہوے اور آلام ومصائب کی بجلیاں ہر طرف کوندنے لگیں تو قلب وروح پر سراسیمگی طاری ہوگئی۔ خیال آیا کہ شاید اس امتحاں زار میں استقامت آخری دم تک ساتھ نہ دے سکے۔ یہ پوری داستان زیرِ غور شعر کے صرف دو لفظوں میں بیان کر دی یعنی ’’اندوہ وفا‘‘۔

۵۔ مردان کار کا شیوہ وشعار یہ نہیں ہوتا کہ کوئی عہد کرلیں تو آزمایشوں کے تواتر سے گھبرا کر اسے توڑ ڈالیں یا اس کے واجبات ادا کرنے سے کنارہ کش ہوجائیں۔ اضطرار کی حالت سامنے آگئی تھی۔ وفا کے تقاضوں کو پورا کرنا بھی کٹھن نظر آتا تھا اور اس کی تکمیل میں ہر لحظہ موت کی تلخیوں کا جامِ زہر بھی لبوں سے لگائے رکھنے کی ہمت ساتھ دیتی معلوم نہیں ہوتی تھی:

مجھے کیا بُرا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا

۶۔ یہ تو ممکن نہ تھا کہ عہدِ وفا توڑ ڈالیں۔ یہی مناسب سمجھا کہ جان دے دیں تاکہ مستقل عذابِ الیم سے نجات مل جائے اور وفا کا دامن بھی داغ دار نہ ہونے پائے۔

۷۔ لیکن محبّ وعاشق کوئی کام محبوب کی رضامندی کے بغیر کر نہیں سکتا تھا جس سے پیمانِ وفا باندھا گیا تھا۔ مرنے کے لیے بھی یک طرفہ فیصلہ محالِ قطعی تھا۔ سوچا کہ چلو محبوب سے اذن لے کر

اندوہ وفا سے چھوٹ جائیں۔

۸۔ محبوب کی بارگاہ میں پہنچے تو مر جانے کا اذن بھی نہ ملا اور عاشق کے لیے جان کاویوں کے قیامت زار میں وفا کے تقاضے پورے کرنے کے سوا چارۂ کار نہ رہا۔

حاصل مطلب:

پھر ملاحظہ فرمائیے کہ یہ سب کچھ ماضی کے ایک واقعے کی حیثیت میں بیان کیا۔ راہ وفا کے طوفان حوادث ومہالک کی کہانی بھی سنا دی جس میں شب وروز زندگی گزارنے کے بجائے جان دے دینا ہزار مرتبہ سہل تھا۔ پیمان وفا پر استواری واستقامت کا درس بھی اپنے عمل سے دے دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ اصل مقصود رضائے محبوب کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

یہ اس شعر کی معنویت کا سرسری نقشہ ہے۔ یہی ہے اصل شاعری جس کی بہ دولت آج میرزا کی صد سالہ برسی عالمی پیمانے پر منائی جارہی ہے۔ میرزا کے علاوہ بھی عالمی شاعر دنیا میں موجود ہیں تاہم عجیب اتفاق ہے کہ عالم گیر تعظیم وبرتری کا یہ مقام رسمی طور پر آج تک کسی کو نہ ملا اور اس کی ابتدا قدرت نے میرزا کے لیے مقدر رکھی۔

پرانی توجیہات پر حصر کیوں؟:

پھر ایک سوال یہ بھی ہے کہ ہم اس شعر یا ایسے ہی دوسرے اشعار کی ان تعبیروں پر کیوں حصر کریں جو شارحین کلام غالب نے وقتاً فوقتاً کیں۔ کیوں یہ نہ سمجھا جائے کہ میرزا نے اس شعر کے ذریعے سے بلند مقاصد کے لیے جانیں لڑا دینے کی دعوت دی ہے۔ ساتھ ہی واضح کر دیا کہ اگرچہ اس منزل میں گام زنی جان دے دینے سے بھی بہ درجہا زیادہ کٹھن ہے لیکن جن سینوں میں خیر و بہبود انسانیت کے لیے بلند مقاصد کی آگ بھڑک رہی ہو ان کے لیے ہرگز زیبا نہیں کہ یہ راستہ ترک کر دیں یا جان دے کر سعی وجہد کی سختیوں اور شدتوں سے نجات حاصل کر لینا چاہیں۔ انھیں تمام مصائب مردانہ وار برداشت کر لینے چاہئیں تاکہ آنے والی نسلیں راحت واطمینان کی فضا میں سانس لیں اسی کا نام عزیمت ہے جو انسانیت کا سدرۃ المنتہیٰ ہے۔

اب آپ یہ شعر دوبارہ پڑھیں:

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں
وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہُوا

محبوب کے لیے ''ستم گر'' کا لفظ جس محل و مقام پر استعمال کیا ہے وہ عاشق کی انتہائی محبت و شیفتگی کی دستاویز ہے اور اس شیفتگی کا صحیح اندازہ وہی اصحاب فرما سکیں گے جنھیں شعر کی معنوی لذت کے ساتھ الفاظ و محل کا صحیح اندازہ ہو۔

نظیریؔ اور غالبؔ:

میں اب صرف چند ایسی مثالیں پیش کروں گا جن سے آپ پر واضح ہو جائے کہ بندش مضمون میں میرزا غالبؔ کی دقت نظر اور کمالِ حقائق شناسی کی حقیقی حیثیت کیا تھی۔

نظیریؔ کا ایک شعر ہے:

بہ عریانی ازاں شادم کہ از تشویش آزادم
گریبانے نہ دارم تا کسے از دستِ من گیرد

میں برہنگی سے خوش ہوں اس لیے کہ تشویش سے نجات مل گئی۔ میرے پاس لباس ہے ہی نہیں جسے کوئی چھین لے جائے گا۔ یہ علائق دنیوی سے انقطاع کا معاملہ ہے۔ مضمون اچھا ہے مگر محض ادعا رہ گیا اور اس میں وقوعی صورت پیدا نہ ہو سکی۔

میرزا غالبؔ نے یہی مضمون لیا تو یوں پیش کیا:

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

گویا میرزا نے یہ کہنا پسند نہ کیا کہ میں بے سروسامان ہوں اور اس پر خوش ہوں۔ کہا کہ سامان تھا لیکن وہ دن کی روشنی میں رہزن لوٹ کر لے گیا اور رہزن دن ہی کے وقت بہ زور وبہ جبر لوٹتے ہیں۔ رات آئی تو بالکل بے سروسامان تھے۔ اس صورتِ حال میں اطمینان خاطر کا یہ پہلو پیدا کر لیا کہ چوری کا کھٹکا اور خدشہ باقی نہ رہا۔ اب بے خود و بے خبر ہو کر سوئیں گے۔ یہ بیان کرنا تحصیل حاصل ہے کہ سونے کا وقت رات ہی ہے۔

وَجَعَلنَا الّیلَ لِباسًا وَ جَعلنا النھار معاشًا

اصلاً فراغ خاطر کی ضرورت رات ہی کو پیش آتی ہے اور چوروں کا خوف رات ہی کو ہوتا ہے نہ کہ دن کو۔ گویا میرزا نے ایک ادعائی مضمون کو ہر پہلو سے طبعی، فطری اور وقوعی صورت دے دی۔

حلقۂ صد کام نہنگ:

نظیریؔ کا ایک اور شعر ہے:

تمنائے گہر سرگشتہ ام دارد بہ دریائے
کہ در ہر گام صد جا راہ برکامِ نہنگ افتد

گوہر کی آرزو مجھے اس دریا میں سرگرداں لیے پھرتی ہے جہاں قدم قدم پر سو سو مرتبہ نہنگوں کے حلقوم پر سے گزرنا پڑتا ہے۔ بڑا ہی عمدہ شعر ہے لیکن میرزا نے ایسا ہی مضمون اُردو میں باندھا تو اسے زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔ فرماتے ہیں:

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

نظیریؔ کے شعر کا مطلب یہ تھا کہ انسان کو اعلیٰ اوصاف و خصائص پیدا کرنے میں بڑے خطروں سے گزرنا پڑتا ہے۔ نفس اور شیطان دونوں قدم قدم پر رہزنی کے لیے آمادہ رہتے ہیں۔ میرزا نے اصل مضمون کو اوّلاً ارتقائے انسانی کا رنگ دے دیا ثانیاً اس کے بیان میں ایسا انداز اختیار کیا کہ کسی بھی پہلو سے اس میں کوئی مزید شے مطلوب نہ رہی۔

کہتے ہیں کہ دریا یا سمندر کی ہر موج ایک جال ہے جس کے حلقے ڈوریوں سے نہیں بل کہ نہنگوں کے حلقوموں سے تیار ہوئے ہیں یعنی بے شمار نہنگ منہ کھول کر قطار در قطار بیٹھ گئے۔ ان کے حلقوموں کے تسلسل و تواتر سے جال بنتے گئے۔ اس دہشت ناک ماحول کا نقشہ پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اسی ماحول میں قطرۂ آب کو گوہر شہوار بننا ہے۔ دیکھیں نردبان ارتقا کے بلند تریں پایے تک پہنچتے پہنچتے پانی کی بوند کو کن کن آفات و مصائب سے سابقہ پڑتا ہے۔

کمال یہ ہے کہ ماحول کا نقشہ زیادہ سے زیادہ تفصیل کے ساتھ پیش کر دیا مگر پانی کی بوند کو پیش

آنے والی آزمایشوں اور ابتلاؤں کے متعلق کوئی معین بات نہ کہی۔ اس میں اوّلاً یہ وجہ ہے کہ سامع کا دماغ خود بخود گوناگوں دہشت انگیز مہالک کا تصور کرے گا اور اس طرح اسے زیادہ لطف آئے گا۔ ثانیاً معین بات نہ کہنے کا سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہر قطرے کو ایک ہی انداز اور ایک ہی نوع کے خطرات سے سابقہ نہیں پڑے گا خصوصاً اس لیے کہ ہر وجود کی صلاحیت، استعداد اور قوت تحمل شدائد یکساں نہیں ہوتی۔ مصائب یا ان کی نوعیت کا انحصار ہر وجود کے خاص احوال و ظروف اور معنوی حیثیت پر ہے۔

قطرہ و گوہر:

قطرہ و گوہر کے ذکر سے بے اختیار نظام الملک آصف جاہ اوّل کا ایک نہایت ہی پُر معاملہ شعر یاد آ گیا اگرچہ اسے پیش کرنے کا یہ موقع اور محل نہیں لیکن جی نہیں چاہتا کہ خوانندگان کرام کو اس کے لطف و لذت میں شریک نہ کروں اگرچہ اس سلسلے میں اک گونہ عدم مناسبت کا ملزم ٹھہروں۔ فرماتے ہیں:

قطرہٗ بودم و دریا شدنم بود امید
عقدہ در کارِ من افتاد و گہر گردیدم !!!

یعنی آرزو تھی کہ پوری عمر یادالٰہی میں بسر ہو۔ اس طرح امید تھی کہ رحمت الٰہی مساعد ہوئی تو میرا قطرہ دریا بن جائے گا لیکن میرے کام میں عقدہ آپڑا اور دریا ہونے کے بجائے گوہر بن گیا یعنی درویش اور خدا مستی کی زندگی بسر کرنے کے بجائے امارت و ریاست کا پھندا گردن میں پڑ گیا۔ عقدے کے باعث دریا کے بجائے گوہر بن جانا ایسا مضمون ہے کہ نظام الملک مرحوم کے حالات اور طبیعت پیشِ نظر رکھ کر جتنی مرتبہ غور کرتا ہوں دل پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

روے دریا اور قعرِ دریا:

عرفی کا ایک نہایت عمدہ شعر ہے:

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در جیحونِ عشق
روے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش است

عرفی کا مطلب یہ ہے کہ عشق میں انسان کو ہر قسم اور ہر رنگ کے حالات پیش آسکتے ہیں اور ان

سب میں زندگی گزارنے کے لیے تیار رہنا چاہیے اگر ہم عشق کو دریا مانیں تو اس کی سطح کی حالت سلسبیل کی سی ہے جو بہشت کی نہر ہے اور اس کی گہرائی سراپا آگ ہے۔ مچھلیاں پانی میں رہتی ہیں اور آگ سَمندر کا مسکن ہے۔ یہ اڑنے یا رینگنے والا جانور آگ ہی میں پیدا ہوتا ہے۔ اسی میں پرورش پاتا ہے اور اسی میں مر جاتا ہے۔

میرزا غالبؔ اس شعر کی عمدگی کے منکر نہ تھے لیکن انھیں دوسرے مصرعے کا عام انداز پسند نہ آیا۔ اصل مضمون کی مناسبت سے اسے کوئی صورت دی جائے لیکن عام حالات میں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دریا یا سَمندر کی سطح سلسبیل ہوتی ہے جس پر کشتیاں یا جہاز چلتے ہیں اور لوگ سیر و تفریح کا لطف اٹھاتے ہیں۔ گہرائی اس اعتبار سے آگ اور ہر شے کے لیے پیامِ موت ہے۔ میرزا فرماتے ہیں: میں نے سوچا کہ یہ تو کچھ بات نہ ہوئی چناں چہ دوسرے مصرع کو پلٹ دیا یعنی یوں بنا دیا۔

قعرِ دریا سلسبیل و روے دریا آتش است

پھر اس پر لبریز حقائق مصرع لگایا:

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیمِ بلاست
قعرِ دریا سلسبیل و روے دریا آتش است

بلا جب تک دور ہوتی ہے تو اس کا انتظار ہزار مصیبتوں اور پریشانیوں کا موجب بنا رہتا ہے۔ جب وہ نازل ہو جاتی ہے یا ہم اس میں داخل ہو جاتے ہیں تو تمام آفتیں اور پریشانیاں عملاً ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ دریا کی سطح آگ ہے کیوں کہ ڈوبنے کا ڈر رہتا ہے لیکن دریا کی گہرائی میں پہنچ جائیں تو پھر کسی خطرے کی تشویش اور کسی پریشانی کا سوال باقی نہیں رہتا۔

اس صورتِ حال کی ایک مثال جنگ بھی ہے۔ جب تک جنگ نہ چھڑے دل گوناگوں اضطرابات کی جولانگاہ رہتا ہے۔ خدا جانے کیا حالات پیش آئیں؟ کون کون سی چیزیں تباہ ہوں؟ کن کن کو جانوں سے ہاتھ دھونا پڑے؟ نتیجہ فتح کی صورت اختیار کرے گا یا شکست کی؟ لیکن جب جنگ چھڑ جائے تو صرف ایک ہی خیال روح و قلب پر مسلط رہتا ہے اور وہ یہ کہ دشمن کو شکست دی جائے۔ تمام خطرے، تشویشیں اور آفتیں اس خیال کو عملی اور وقوعی صورت دینے میں گم ہو جاتی ہیں۔

وعدۂ محبوب اور شادی مرگ:

فارسی کا ایک شاعر محبوب سے کہتا ہے:

بیم از وفا مدار، بدہ وعدۂ کہ من
از ذوق وعدۂ تو بہ فردا نمی رسم

یعنی اے محبوب تو کل آنے کا وعدہ کر لے اور اس تشویش میں نہ پڑ کہ اس وعدے کے ایفا کی نوبت آئے گی۔ کیا تیرے وعدہ کر لینے سے میرے دل کی خوشی اور شادمانی اس درجے پر نہ پہنچ جائے گی کہ میں مر جاؤں گا اور نوبت وعدہ سے پیش تر ہی دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا؟

نفسِ مضمون کے اچھا ہونے میں کلام نہیں لیکن اسے حد درجہ بھونڈے، غیر طبعی اور غیر وقوعی انداز میں باندھا گیا ہے حتیٰ کہ اس کی خوبی مضحکہ خیز بن گئی ہے۔ غور فرمایئے:

۱۔ محبوب سے آنے کا وعدہ لینا منظور ہے اور اسے چکمہ دیا جا رہا ہے کہ وعدہ کر لے ایفا کی نوبت نہ آئے گی۔

۲۔ کیوں نہ آئے گی؟ اس لیے کہ میں وعدے کی خوشی میں شادی مرگ کا شکار ہو جاؤں گا۔

۳۔ جب شاعر جانتا ہے کہ محبوب کا وعدہ جھوٹا ہوگا تو اسے خوشی کیوں ہوگی اور وہ بھی اتنی خوشی جس میں مر جائے۔

۴۔ اگر محض نفسِ وعدہ ہی کی خوشی اسے موت کی آغوش میں پہنچا دے گی تو سمجھ لینا چاہیے کہ شاعر کے لیے محبوب سے وعدۂ آمد لینا خودکشی کا ایک بہانہ ہے۔

۵۔ جب شاعر جانتا ہے کہ محبوب کی طرف سے وعدہ ہوتے ہی مر جاؤں گا تو آخر اس پر اصرار کیوں ضروری سمجھا گیا؟ مرنا ہی منظور ہے تو خودکشی کا کوئی دوسرا ذریعہ کیوں اختیار نہ کر لیا؟

غرض مضمون نفسِ فکر کے اعتبار سے اچھا تھا مگر بیان نے اسے جولان گاہِ تضحیک بنا دیا۔

میرزا کا شعر:

ایسے نازک معاملات کو بیان کرنا سہل نہیں۔ دیکھیے میرزا غالب نے اسے کیوں کر باندھا؟ فرماتے ہیں:

ترے وعدے پہ جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا

محبوب نے وعدہ کر لیا اور وفا نا آشنا محبوبوں کا شیوہ ہی یہ ہوتا ہے کہ وعدہ کر لیتے ہیں اور اسے پورا کرنا منظور نہیں ہوتا۔ عاشق خدا جانے ایسے کتنے وعدوں کا تجربہ کر چکا ہے اور اسے یقین ہے کہ نیا وعدہ بھی پورا نہیں ہوگا۔ لہٰذا کہتا ہے ہم تیرے وعدے پر صرف اس لیے جیتے رہے کہ اسے جھوٹا سمجھتے تھے۔ یقین تھا کہ پہلے بیسیوں وعدوں کی طرح یہ بھی پورا نہ ہوگا اگر ہمیں یقین ہوتا کہ تو نے سچا وعدہ کر لیا ہے یا تیرے وعدے میں سچائی کا شائبہ بھی ہوتا تو کیا ہم خوشی سے مر نہ جاتے؟

یہ اس مضمون کے بیان کا طبعی اور وقوعی طریقہ تھا جس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ محبوب کی طرف سے وعدے کا ایفا واقعی عاشق کے لیے خوشی کی فراوانی سے موت کا باعث ہو سکتا ہے۔ ساتھ ہی یہ حقیقت کھول کر بتا دی کہ محبوب کا وعدہ سچا نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اہلِ فکر و نظر کو سیکڑوں مضمون سوجھتے ہیں مگر بہت کم اصحاب ہیں جنھیں قدرت کی طرف سے یہ سلیقہ عطا ہوتا ہے کہ انھیں طبعی انداز میں الفاظ و بیان کا لباس پہنا دیں۔

آب و آتش:

شراب مذہباً حرام ہے اور صحیح اسلامی حکومتوں میں اس کے لیے تعزیز مقرر تھی۔ جب اسلامی حکومتیں نہ رہیں تو دوسرے جرائم کی طرح شراب نوشی کی سزا بھی موقوف ہو گئی۔ میرزا کا ایک شعر ہے:

پاک خور امروز و زنہار از پئے فردا منہ
در شریعت بادہ امروز آب و فردا آتش است

یعنی جو شراب تیرے پاس ہے وہ آج ہی پی جا اور کل کے لیے کچھ نہ بچا۔ شریعت مقدسہ اسلامیہ کے نزدیک شراب کو آج تو محض ایک مشروب کی حیثیت حاصل ہے جیسے پانی پی لیا جاتا ہے لیکن یہی مشروب محاسبۂ آخرت میں آگ بن جائے گا اور آتشِ دوزخ میں جلنے کا موجب ٹھہرے گا۔

آپ ذرا اس شعر کے دقائق پر غور فرمائیں:

۱۔ شاعر کا مقصدِ حقیقی یہ ہے کہ شراب بالکلیہ پی کر ختم کر دینی چاہیے اور کل کے لیے کچھ نہ رکھنا چاہیے۔
۲۔ دوسرے مصرعے میں ایسے الفاظ لائے جن کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ آج شراب محض مشروب ہے اگر اسے محفوظ رکھا جائے گا تو یہی کل آگ بن جائے گی۔ دوسرے وہ معنی جو اوپر بیان ہو چکے یعنی شراب محاسبۂ آخرت میں مستوجب تعزیر ٹھہرے گی اور دوزخ کی آگ میں جلنا ہوگا۔

دیکھیے۔ الفاظ سے دونوں معنی کس طرح خود بخود آشکارا ہو رہے ہیں اور ان کے سلسلے میں کسی تاویل و تصریح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

حال دل اور بے نیازی:

بعض اوقات ایک مضمون فارسی میں ایک خاص طریقے پر ادا کرتے ہیں لیکن اسے اُردو میں لاتے ہیں تو رنگ بالکل دوسرا ہوتا ہے اور اس کی لطافت انتہائی دل پذیری اختیار کر جاتی ہے۔ مثلاً فارسی میں کہتے ہیں:

تا چند نشنوی تو و ماحسبِ حالِ خویش
افسانہ ہاے غیر مکرر کنیم طرح

ہم اپنے حسب حال نئے نئے افسانے تیار کر کر کے پیش کرتے جا رہے ہیں۔ آخر تو کب تک سننے سے بے پروائی پر قائم رہے گا؟

اُردو میں فرماتے ہیں:

بے نیازی حد سے گزری، بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے، کیا؟

یعنی ہم نے جب کبھی دل کا حال بیان کیا تو آپ نے بے نیازی سے فرما دیا، کیا؟ بندہ پرور! آخر یہ صورت حال کب تک چلی جائے گی۔

غم دل اور نکتہ چینی:

''حال دل'' سے ''غم دل'' کا ایک نہایت دل آویز شعر یاد آ گیا:

نکتہ چیں ہے ''غم دل'' اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

آپ خود تجربہ کر لیں کہ اگر کسی کے سامنے کوئی دردناک داستان بیان کرنے لگیں گے اور وہ نکتہ چینی شروع کر دے گا تو اس داستان کے غم و حزن کی آبرو مٹ جائے گی اور اس فضا میں خلل آ جائے گا جو غم انگیز کہانیوں کے بیان و سماعت کے لیے لوازم میں سے ہے میرزا کا محبوب بھی نکتہ چیں اور نقاد

ہے۔ میرزا جب غمِ دل سنانے پر آمادہ ہوتے ہیں، محبوب کی نکتہ چینی کے کچوکوں سے داستان کی غم آگینی اور اندوہ افزائی ختم ہو جاتی ہے اور بالکل وہی نقشہ بروے کار آجاتا ہے جو عدالتوں میں ملزموں یا گواہوں پر نکتہ چیں وکیلوں کی جرح سے پیدا ہوتا ہے، لہٰذا میرزا کہتے ہیں کہ جہاں بات نہیں بنتی وہاں کیا کیا جائے۔

حقیقت و مجاز:

میرزا نے کہا ہے:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

وہ ایک مقام پر حقیقت و مجاز کا فرق ''بادہ و ساغر'' ہی کے انداز میں پیش کرتے ہیں اور دیکھیے سادہ سے الفاظ میں کتنا اہم نکتہ کس درجہ بے مثال طریق پر پیش کر گئے ہیں۔ کہتے ہیں:

زاہد از ما خوشۂ تاکے بہ چشمِ کم مبیں
ہی نمی دانی کہ یک پیمانہ نقصاں کردہ ایم

اے زاہد! ہم نے انگور کا ایک خوشہ بطور تحفہ تیری نذر کر دیا۔ اسے حقیر، کم قیمت اور معمولی شے نہ سمجھ۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ یہ تحفہ تیرے حوالے کر کے ہم نے شراب سے بھرے ایک پیمانے کا نقصان گوارا کر لیا ہے؟

خوشۂ انگور کو ظاہری حیثیت کے لحاظ سے آپ کتنا ہی معمولی تحفہ سمجھیں۔ یہ بھی مانے لیتے ہیں کہ بازار سے ایسے خوشے معمولی قیمت پر مل سکتے ہیں لیکن معنویت اور حقیقت کا لحاظ رکھیں تو اسی خوشے سے اتنی شراب کشید ہو سکتی تھی جس سے ایک پیمانہ بھر جائے۔ گویا تحفہ حقیقتاً خوشۂ انگور نہیں بل کہ پیمانۂ شراب کا تھا جس کی قدر و قیمت کا اندازہ مشکل ہے اور زاہد کے لیے اس تحفے کی موزونیت انتہائی غور کی محتاج ہے۔

ضمناً یہ نکتہ بھی بیان کر دیا کہ جو کچھ ہم پیتے ہیں وہ اصلاً خوشۂ انگور ہی کا افشردہ ہے۔

وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

مطالعہ غالب کی ضرورت:

غرض میرزا کے فکر فلک پیما کی نیرنگیوں کا حصر محال ہے۔ اُردو میں بھی ان بوقلمونیوں کے مرقعے نہایت عجیب ہیں لیکن میرزا کے فارسی کلام میں تو حیرت انگیز نقشے ہر قدم پر ملتے ہیں۔ کاش ان کے نظارے سے ٹھیک لذت اندوز ہونے والی نگاہیں مطالعے کی زحمت برداشت کریں۔ کاش میرزا کے فارسی کلام کے تمام حصے غزلیں، قصیدے، مثنویاں، قطعے اور رباعیاں بہ غور دیکھے جائیں۔ اُردو کلام بھی معجز نمائی میں بہت بلند پایہ ہے لیکن میرزا کا یہ ارشاد آج بھی درست ہے جس طرح آج سے سوا سو سال پیش تر درست تھا:

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگِ من است

افکار۔ کراچی۔ غالب نمبر۔ فروری، مارچ ۱۹۶۹ء

روزنامہ امروز لاہور مورخہ ۳۱۔ جنوری ۱۹۶۹ء

افکارِ غالب کے نئے زاویے

شعر غالب نبود وحی و نگوئیم، ولے
تو و یزداں نتواں گفت کہ الہامے است

میرزا غالب کے اشعار کی تشریح و تفصیل میں سب سے اونچا درجہ خواجہ حالی مرحوم کا ہے، اس لیے بھی کہ وہ خود عالی رتبہ سخن فہم و سخن سنج تھے اور اس لیے بھی کہ انھوں نے اپنے اوقات گرامی کا خاصا حصہ میرزا غالب کی صحبت میں گزارا تھا اور ان سے مختلف اشعار کے متعلق استفسار کرتے رہتے تھے۔

‘‘یادگار غالب’’ کا بہترین اور حد درجہ قیمتی حصہ وہی ہے جس میں خواجہ صاحب مرحوم و مغفور نے میرزا کے منتخب اُردو اور فارسی کلام کی شرح فرمائی ہے اگرچہ اس کی حیثیت زیادہ تر اشاروں کی ہے۔

میں ‘‘یادگار غالب’’ کے ان بیش بہا اوراق پر نظر ڈالتا ہوں تو کئی مقامات پر احساس ہوتا ہے کہ خواجہ مرحوم نے جو کچھ تحریر فرمایا وہ اپنی جگہ بالکل درست ہے لیکن بعض اشعار میں معنویت کے ایسے پہلو موجود تھے جن کی تشریح نہ کی گئی حالاں کہ ضروری تھی۔ اس کی وجہ خواہ یہ ہو کہ خواجہ صاحب کے پیش نظر محض اشارے تھے، تفصیل نہ تھی کیوں کہ وہ شائقین مطالعہ کلامِ غالب کی طرف متوجہ کرنے کے خواہاں تھے، میرزا کے اشعار کی شرح ان کے مقاصد میں شامل نہ تھی۔

شعروں کی تعبیر کا مسئلہ:

مثلاً ‘‘یادگار غالب’’ کے صفحہ ۳۵۵ پر (بالفعل میرے پیش نظر مجلس ترقی ادب کا مطبوعہ نسخہ ہے) ‘‘فخریہ’’ کے زیرِ عنوان یہ شعر درج کیا ہے:

شعلہ چکد غم کرا؟ گل شگفد مزد کو؟
شمعِ شبستانیم، بادِ سحرگاہیم

خواجہ صاحب فرماتے ہیں:

اپنی مصیبت اور اپنی فیض رسانی اور اس پر لوگوں کی بے دردی اور ناقدر دانی ظاہر کرتا ہے کہتا ہے کہ میں گویا ''شمع شبستانی'' ہوں کہ اس میں سے شعلے جھڑتے ہیں مگر کسی کو اس کے ساتھ ہمدردی نہیں اور گویا میں بادِ سحر گاہی ہوں جو پھول کھلاتی ہے مگر اس کی اُجرت کوئی ادا نہیں کرتا۔

خلق کی خدمت گزاری:

اگر میں عرض کروں کہ اس شعر میں میرزا غالبؔ نے انسانیت کے دو نہایت درخشاں وصف انتہائی پُر تاثیر انداز میں حد درجہ اختصار کے ساتھ پیش کر دیے ہیں تو کیا یہ صحیح نہ ہوگا؟ عالی منزلت انسان وہ ہیں جو ہم جنسوں کی بہتری کے لیے شدید مشقتیں برداشت کرتے ہیں، انتہائی دکھ اٹھاتے ہیں مگر کبھی ان کے دل میں یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ ان مشقتوں اور مصیبت خیزیوں کے لیے ہر طرف سے تحسین کی صدائیں بلند ہوں۔ ان کی عظمت اور شیفتگیِ خدمتِ خلق، ایسی چھوٹی چھوٹی اور حقیر خواہشوں کو حاشیہ خیال میں بھی جگہ دینے کی روادار نہیں ہوتی۔ یہ نہایت کم حوصلہ، تنگ ظرف بل کہ خدمت ناشناس لوگوں کا مشغلہ ہوتا ہے کہ کچھ کریں یا نہ کریں مگر ہر وقت بے تاب اور بے قرار رہیں کہ ان کی ستایش کی جائے اور کہا جائے کہ دیکھیے فلاں کا کام کتنا عالی شان ہے۔ ایسے لوگوں کو اپنی عظمت کے نقارے خود بجانے میں بھی تامل نہیں ہوتا۔ کلیم ہمدانی کے قول کے مطابق یہ لوگ:

منت دریا نہند ار قطرۂ احسان کنند

حقیقی اور مخلص خدمت گزاروں کا شیوہ شعار یہ نہیں ہوتا۔

اس مقام پر امیر خسروؔ کے تین حسب حال شعر یاد آگئے، جنھیں یہاں درج کر دینا مناسب ہے:

در جواں مردی و مردی ہر کہ کارے پیش برد ناجواں مردی بود گر برزباں آرد سخن!
آنکہ او کردو نہ گفت آں راشمر مرد تمام وانکہ او کردو بہ گفت اوزن بود بے ہیچ ظن
آنکہ نے کردو نہ گفت آں رامداں جزنیم مرد وانکہ نے کردو بہ گفت آں رامخواں جزنیم زن

بے غرضانہ خدمت:

اسی طرح وہ بلند منزلت اصحاب جو واقعی خدمت انجام دیتے ہیں اس کے لیے کبھی کسی مزد یا کسی معاوضے یا بدلے کے طلب گار نہیں ہوتے انھیں فرض کی بجا آوری اور خدمت کی انجام دہی کے سوا کسی

دوسری بات کا خیال ہی نہیں آتا صرف ایک آرزو ان کے دلوں میں موجزن ہوتی ہے یعنی یہ کہ اپنے ہم جنسوں کے تعلق میں وہ جو کام ضروری سمجھتے ہیں انھیں بہتر سے بہتر شکل میں پورا کردیں بس اس تکمیل کی خوشی اور شادمانی ان کی پہلی اور آخری مراد ہوتی ہے باقی رہا اجر یا مزد خواہ وہ مادی حیثیت کی ہو یا محض مدح و تحسین کی آرزو ہی سمجھی جائے تو اصحاب عظمت و برتری ان چیزوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتے وہ اپنی ہر خدمت گزاری کے لیے صرف خدائے بزرگ و برتر سے اجر کے خواہاں ہوتے ہیں۔

انبیاء کا اسوہ:

قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام کی صدائے عام یہی تھی کہ ہمارا اجر صرف اللہ پر ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا اعلان یہ تھا:

یَا قَوْمِ لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ مالاًؕ اِن اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہ۔	لوگو میں جو کچھ کر رہا ہوں تو اس پر مال و دولت کا تم سے طالب نہیں میری خدمت کی مزدوری جو کچھ ہے صرف اللہ پر ہے۔

(سورہ ہُودؔ)

یہ ہے حقیقی، بے لوث اور بے لاگ خدمت پھر سورہ شعراء میں ہر نبی صادق و برحق کی زبان پر یہی کلمہ آیا ہے:

وَمَا اَسْئَلُکُم عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍاِنْ	میں اس پر تم سے کچھ اجر نہیں مانگتا۔
اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔	میرا اجر صرف جہانوں کے رب پر ہے۔

میرزا کی دعوت:

میرزا غالبؔ نے زیرِ غور شعر میں یہی دعوت پیش کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہم جنسوں کی خدمت انجام دینے میں ہرگز کوتاہی نہ ہو۔ ہر قسم کی مشقتیں اور مصیبتیں صبر و تحمل ہی سے نہیں خوش دلی سے اٹھاؤ کیوں کہ انسان مشقت اٹھائے اور ایثار سے کام لیے بغیر ایک چیونٹی کی خدمت بھی انجام نہیں دے سکتا اور اپنا اجر اللہ سے لو۔

فرماتے ہیں، رات کے وقت جلنے والی شمع کو دیکھو اس میں سے شعلے جھڑتے رہتے ہیں تاہم وہ رات کی تاریکی میں اُجالا کرنے کا وظیفہ نہیں چھوڑتی اور کسی سے ہمدردی و غم خواری کی خواہاں نہیں ہوتی۔ نسیم سحری کو دیکھو وہ چلتی ہے تو کلیاں کھل کھل کر پھول بنتی جاتی ہیں اور ان کی خوشبو سے باغ کی فضا عنبر زار ہو جاتی ہے لیکن کیا نسیم نے کبھی اس خدمت کے لیے کسی سے کوئی اُجرت طلب کی ہے؟ اب اس شعر کو پھر ایک مرتبہ پڑھیے:

شعلہ چکد غم کرا؟ گل شگفد مزد کو؟
شمعِ شبستانیم، بادِ سحر گاہیم

متکلم کو غالبؔ فرض نہ کیجیے، وہ بلند مرتبہ انسان فرض کیجیے جس نے بے تحسین مشقت اٹھانے اور بے مزد خدمت انجام دینے کو اس دنیا میں اپنا نصب العین بنا رکھا ہو۔ اسی نوع کے انسان اس خاکدان تیرہ و تار کے لیے ایسی روشنی کے مینار ہیں جسے آفتاب جہاں تاب کے دامن سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

ایک سوال:

میرے نزدیک تو اس تشریح کے سلسلے میں مجھے لفظوں کی کھینچ تان قطعاً نہیں کرنی پڑی لیکن سوال کیا جا سکتا ہے کہ آیا میرزا کے ذہن میں واقعی یہی معنی تھے۔

اس سلسلے میں پہلی گزارش یہ ہے کہ خواجہ حالیؔ مرحوم نے جو معنی بیان فرمائے وہ بھی تو میرزا غالبؔ کے بیان کردہ نہیں۔ خواجہؔ مرحوم نے خود شعر کے الفاظ سے اخذ کر لیے اگر میں لفظوں کو آگے پیچھے کیے بغیر وہ معنی لے سکتا ہوں جن کی کیفیت اوپر بیان کی تو اس سے اختلاف کس بنا پر مناسب ہوگا؟

علامہ اقبال کا ارشاد:

پھر حضرت علامہ اقبال مرحوم کے ارشادات سے ہمیں ایک ایسی مثال ملتی ہے، جو میرے عرض کیے ہوئے معانی کے لیے دستاویز بن سکتی ہے۔

خان محمد نیاز الدین خاں مرحوم جالندھری نے حضرت علامہ اقبال کو مولانا گرامیؔ مرحوم کا ایک شعر لکھا:

عصیانِ ما و رحمتِ پروردگارِ ما
ایں را نہایتے است نہ آں را نہایتے

حضرت علامہ لکھتے ہیں:

> گرامی کے اس شعر پر ایک لاکھ دفعہ ''اللہ اکبر'' پڑھنا چاہیے۔ خواجہ حافظ تو رہے ایک طرف، مجھے یقین ہے، فارسی لٹریچر میں اس پایے کا شعر کم نکلے گا انسان کی بے نہایتی کا ثبوت دیا ہے مگر اس انداز سے کہ موحد کی رُوح فدا ہو جائے۔
>
> (مکاتیب اقبال ص ۲۲-۲۳)

حضرت علامہ کا یہ ارشاد مولانا گرامی تک پہنچا تو انھوں نے کہا کہ میرے خیال میں تو وہ معنی نہ تھے جو علامہ نے بیان کیے۔ خان محمد نیاز الدین خاں نے یہ بات بھی حضرت علامہ تک پہنچا دی۔ حضرت نے فرمایا:

> یہ کچھ ضروری نہیں کہ صاحب الہام اپنے الہام کی بلاغت سے بھی آگاہ ہو اگر گرامی صاحب کے خیال میں وہ معانی نہ تھے تو کچھ مضائقہ نہیں، ان کے الفاظ میں تو موجود ہیں۔
>
> (مکاتیب اقبال ص ۲۳)

طاعت میں اخلاص:

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ صاحب الہام کے لیے ضروری نہیں کہ وہ اپنے الہام کی بلاغت سے بھی آگاہ ہو اگر الفاظ ان معانی کا ساتھ دیتے ہیں جو شعر پڑھنے والے کے ذہن میں آئے تو اسے پورا حق حاصل ہے کہ ان معانی کی صحت پر اصرار کرے۔ واضح رہے کہ یہ دستاویز بھی اس بلند منزلت شخصیت نے مہیا فرمائی جو خود ایسے معاملات میں حقایق و مقاصد کا بہترین اندازہ داں تھا۔

سب سے آخر میں یہ کہ یہ شعر اس جلیل القدر شاعر کا ہے جس کے نزدیک وہ ''طاعت'' بھی مستحق اعتنا نہیں جو بہشت مل جانے کے خیال سے کی جائے:

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

تمنا و حسرت

میرزا کا ایک نہایت عمدہ شعر ہے:

آیندہ و گذشتہ تمنا و حسرت است
یک ''کاشکے'' بود کہ بہ صد جا نوشتہ ایم

اس کا مطلب عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ میرزا نے اپنی ''قنوطیت'' کا نقشہ کھینچا ہے یعنی جو زندگی گزری وہ یک قلم حسرت میں گزری اور جو باقی ہے وہ تمناؤں میں گزر رہی ہے گویا ہماری زندگی کا حاصل صرف ایک لفظ ''کاشکے'' ہے جو سیکڑوں مقامات پر لکھا اور لکھتے جا رہے ہیں۔

میری گزارش ہے کہ اسے قنوطیت کا مرقع کیوں سمجھا جائے اور میرزا غالبؔ کو قنوطی کہنے کی کون سی وجہ ہے؟ کیا یہ کہ اس نے حقایق حیات پیش نظر رکھے اور زندگی میں غم و شادی دونوں قسم کے حقایق سے انسان کو سابقہ پڑتا رہتا ہے۔

اہلِ حق کا شیوہ:

اس شعر کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ عالمِ انسانیت کا ایک خدمت گزار زندگی کا ایک حصہ ہم جنسوں کے لیے محنت و مشقت میں گزار چکا ہے اس نے اپنی طرف سے کسی بھی موقع پر کوتاہی نہ کی۔ جو کچھ کر سکتا تھا وہ کیا لیکن نتائج اس کی آرزو کے مطابق اطمینان بخش نہ نکلے۔ لہٰذا گزشتہ زندگی کی جد و جہد، سعی و کاوش اور تگ و دو پر نقادانہ یا عرفیؔ کی اصطلاح میں ''منافقانہ'' نظر ڈالی تو اسے جا بجا خامیاں اور کمزوریاں نظر آئیں۔ بالغ نظر داعیانِ حق اپنی خدمت کے نتائج پر نظر ڈالتے ہیں تو جو کچھ نہ ہو سکا اس کے لیے اپنی تدابیر و مساعی ہی کی خامیوں کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔

عزم کی تازگی و استواری:

اب وہ تہیہ کر رہا ہے کہ آیندہ جو خدمت انجام دوں گا، اس کے سلسلے میں زیادہ سرگرمی، زیادہ جوش اور زیادہ انہماک سے کام لوں گا۔ ''حسرت'' و ''تمنا'' کو اس صورت حال پر ڈھال کر یہ شعر پڑھیں گے تو آپ کو ''قنوطیت'' کے بجائے اس میں حد درجہ پختہ ارادے اور زیادہ استوار عزم کی جھلک ملے گی۔ ساتھ ساتھ یہ بھی یقین ہو جائے گا کہ حقیقی اور مخلص خدمت گزاروں کا شیوہ یہی ہوتا ہے۔ وہ اپنی کسی بات پر فخر نہیں کرتے۔ اپنی کسی کوشش پر نازاں نہیں ہوتے۔ یہی سمجھے رہتے ہیں کہ فرض جس انداز میں ادا ہونا چاہیے تھا، ادا نہ ہو سکا اور آیندہ کے لیے زیادہ سرگرمی و احتیاط کا عزم کر لیتے ہیں۔ خدمت خلق اتنی سہل چیز نہیں کہ ادھر کسی نے دل میں ارادہ کیا اور ادھر خدمت پوری ہو گئی۔

قدرت کا ایک غیر معمولی سانچا:

ان معاملات میں بحث کا دائرہ بہت وسیع ہے لیکن میں یہاں صرف یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ میرزا غالبؔ کے اشعار کے متعلق گفت گو کے سلسلے میں ان معانی پر حصر نہ کرنا چاہیے جو اب تک بیان ہوتے رہے بل کہ وسعت نظر سے کام لے کر نئے دوایر کی طرف بھی توجہ منعطف کرنی چاہیے۔ اگر ان اشعار کا مطلب الفاظ کے ہیر پھیر کے بغیر صاف اور واضح طور پر وہ نکل سکتا ہے، جس کی دو مثالیں میں نے سرسری طور پر عرض کر دیں تو محض اس بناء پر ان معانی سے گریز مناسب نہ ہوگا کہ آج تک ان کے وہ معانی بیان میں نہیں آئے۔ میرزا غالبؔ کا غیر معمولی ذہن و دماغ قدرت کا ایک ایسا سانچا تھا جس سے مدت العمر نوادر نکلتے رہے۔ ہمیں میرزا کے ساتھ وہ سلوک نہ کرنا چاہیے جو دورِ گزشتہ کے ایسے شاعروں سے کرتے ہیں جن کے سامنے عالمِ انسانیت کی خدمت کا کوئی خاص مقصد و نصب العین نہ تھا۔

ہمت مردانہ کے تقاضے:

میرزاؔ فرماتے ہیں:

ضعف سے ہے، نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو
ہیں وبال تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

ترکِ جستجو کسی بھی حالت میں مناسب نہیں۔ انسان کی نظر ہر وقت بل کہ ہر لحظہ تلاش و دریافت کے نئے نئے دایروں پر رہنی چاہیے۔ فرد کے لیے وظیفہ انسانیت کی تکمیل کا طریقہ یہی ہے لیکن فرض کیجیے کہ ایک شخص قناعت کا پہلو اختیار کرتا ہے اور وہ اپنے اندر خوبی اور نیکی کے ایک نئے جوہر کی پرورش پر متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس میں جستجو کی ہمت ہے لیکن وہ کچھ عرصہ کے لیے اس سے مزید کام نہیں لینا چاہتا، پہلے سے تلاش کردہ حقایق ہی پر غور و خوض میں لگ جاتا ہے۔ یہ بھی ہمت مردانہ کا ایک درجہ ہے جسے ہم پہلا نہیں بلکہ دوسرا درجہ قرار دے سکتے ہیں لیکن جو شخص اپنے آپ کو جستجو کی ہمت اور قوت ہی سے محروم کر چکا ہے۔ اس کے لیے مردانگی کا دعویٰ کس بنا پر جائز ہے؟ وہ تو مردانگی کے لیے سراپا باعث ننگ ہے۔

گفتار بہ اندازہ کردار:

پھر فرماتے ہیں۔

باخرد گفتم نشانِ اہل معنی باز گوے
گفت: گفتارے کہ باکردار پیوندش بود

حقیقتاً اہل معنی کا بدیہی نشان یہ ہے کہ ان کے قول و عمل میں گہرا پیوند ہو جو کچھ زبان پر لائیں اس پر عمل کر کے دکھائیں۔ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ (کیوں کہتے ہو منہ سے جو نہیں کرتے) کے مصداق نہ بنیں۔ انسان کے لیے معنویت سے بے بہرگی اور محرومی کا نشان اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ وہ جو کچھ کہے اس پر عمل پیرا نہ ہو یعنی اس کے قول و فعل میں مطابقت کا کوئی بھی رشتہ نہ پایا جائے۔

ہمارا فرض:

دورِ حاضر میں بیش تر افراد کی حالت یہی ہے۔ ان کی زبانوں پر کچھ ہے لیکن عمل کا رخ کسی اور ہی طرف ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نوع کے انسان زندگی کے کسی بھی دائرے میں کام یاب نہیں ہو سکتے اور جن قوموں میں اکثریت اس قسم کے افراد کی ہو وہ برابر گرتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ زندگی کی روشنی سے بالکل محروم ہو جاتی ہیں۔ بہ ظاہر وہ زندہ رہتی ہیں لیکن جب دل ہی زندہ نہ رہے تو زندگی کس کام کی ہے اس سے تو موت ہزار درجہ بہتر ہے کہ کم از کم مزید ذلتوں سے تو محفوظ ہو جائیں گی۔

اس گزارش کا مدعا یہ ہے کہ غالبؔ کے کلام کا جائزہ ہمیں ازسرِ نو لینا چاہیے تاکہ اس میں عظمت و صالحیت کے سرمایے کی مقدار کا اندازہ کر سکیں اور اس سے جتنا زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اٹھائیں، نیز میرزا سے ہماری عقیدت محض رسمی نہ رہے بل کہ اس کے لیے محکم بنیادیں مہیا ہو جائیں۔

(صحیفہ۔ لاہور۔ غالب نمبر ۱۹۶۹ء حصہ اوّل)

میرزا غالبؔ کی انسان دوستی

آفاقیت میرزا غالبؔ کے کلام کی ایک بہت بڑی خوبی ہے۔ اسے میرزاؔ کی انسانیت دوست فطرت کا ایک طبعی خاصہ سمجھنا چاہیے۔ آفاقیت اور ہمہ گیری شعر کا جوہر حسن ہے۔ یعنی جو کچھ کہا جائے، وہ معنویت کے اعتبار سے ماحول کی حدوں کو توڑ کر زیادہ سے زیادہ عام ہو جائے۔ کسی خطّے کی زبان یا کہنے والے کا معاشرہ یا اس کے رسوم و اوضاع اس کی عمومیت پر اثر انداز نہ ہو سکیں اور کسی بھی پہلو سے اس کی ترجمانی فطرت انسانی مجروح نہ ہو سکے بل کہ دنیا کے کسی بھی انسان کو اس کی زبان میں وہ کلام سمجھا دیا جائے تو بے تامّل پکار اٹھے:

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

آفاقیت کے دو پہلو ہیں: ایک یہ کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ کسی خاص طبقۂ انسانیت نہیں پورے عالمِ انسانیت کے جذبات و احساسات کا ترجمان ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ کلام کا خاصا بڑا حصّہ ایسا ہے، جسے دین، فلسفے، نفسیات، سیاست، تاریخ، ادب وغیرہ ہر دائرۂ علم و فن کے مباحث و مذاکرات میں استعمال کر سکتے ہیں اور اس کی موزونیت ہر بحث و ذکر میں برابر درخشاں رہے گی۔

میرزا غالبؔ کی انسانیت دوستی کے بھی دو پہلو ہیں، اوّل وہ انسانیت کو اس کائنات کی تخلیق کا مرکزی سبب قرار دیتے ہیں پھر انسان کے شرف و برتری کے اہم اصول و خصائص نئے نئے رنگ اور نئے نئے انداز میں پُرتاثیر طریق پر جابجا پیش کرتے جاتے ہیں تاکہ ہر انسان وہ خصائص پیدا کر کے انھی برتری کو حقیقت ثانیہ بنا دے۔ دوم، وہ ہر انسان سے بہ طور انسان کے محبت کرتے ہیں۔ ان کے ہاں رنگ، نسل، پیشے یا درجے کا کوئی تفاوت اس محبت میں خلل انداز نہیں ہو سکتا۔ ہر انسان کی خیر خواہی میرزا کی زندگی کا نصب العین بنی رہی۔

ان کے اپنے وسائل معاش کسی بھی دور میں زیادہ وسیع نہ رہے۔ جو تھے وہ بھی بعض اوقات سکڑ کر بہت محدود ہو گئے۔ تاہم میرزا غالبؔ کی سراپا ہمدرد فطرت نے نمود و نمایش میں کبھی انقباض گوارا نہ

کیا۔ اس سلسلے میں تفصیلی بحث ونظر کا دائرہ بہت وسیع ہے لیکن موقع اور محل تفصیل کا متحمل نہیں اور میں صرف چند جھلکیاں دکھانے پر قناعت کرتے ہوئے عرض کروں گا:

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

میرزا کی ایک فارسی غزل کا شعر ہے:

ز آفرینشِ عالم غرض جز آدم نیست
بہ گردِ نقطۂ ما دورِ ہفت پرکار است

یعنی کائنات کے پیدا کرنے کی غرض وغایت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ انسان وجود میں آئے۔ انسان ہی کی خاطر یہ وسیع وعظیم کارگاہ عدم سے وجود میں آئی، جو علم کی روشنی زیادہ ہونے کے ساتھ ساتھ پھیل پھیل کر بیکراں سی ہو جاتی ہے۔ ہر پرکار کوئی نہ کوئی نقطہ متعین کر کے گھمائی جاتی ہے۔ سات سیاروں کی پرکار جس نقطے پر گھوم رہی ہے، وہ آدم ہے، وہ انسان ہے۔

ہمارے ہاں ایک روایت مشہور ہے: لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ، یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر رسول (ﷺ) کا وجود مبارک مقصود نہ ہوتا، تو افلاک بھی پیدا نہ کیے جاتے۔ میرے علم کی حد تک یہ حدیث تو نہیں لیکن قول ہر اعتبار سے درست ہے کیوں کہ انسان کائنات کا مرکز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسانیت کا مرکز ومرجع ہیں، لہٰذا یہاں جو کچھ ہے وہ اسی ذات بابرکات کے طفیل ہے۔

پھر میرزا فرماتے ہیں کہ انسان کو جن جن چیزوں کی ضرورت پیش آ سکتی تھی وہ اللہ تعالیٰ نے پہلے پیدا کیں اور انسان کا ظہور ان کے بعد ہوا:

چارہ درسنگ و گیاہ و رنج با جاندار بود
پیش ازاں کایں در رسد آں را مہیّا کردہ ای

بیماریاں اور احتیاجات جان دار کے ساتھ تھیں اور ان کا علاج ومداوا معدنیات ونباتات پر موقوف تھا۔ حکیم مطلق کی شانِ کریمی ملاحظہ فرمایے کہ جان دار کے ورود سے پیش تر معدنیات ونباتات کے بے اندازہ ذخیرے ہر طرف پھیلا دیے گئے۔

غرض میرزا کا بنیادی نصب العین انسانیت ہی تھا جس کے اعلیٰ اوصاف ومحاسن کی دعوت ان

کے کلام میں جا بجا ملتی ہے۔ ذرا غور فرمایے کہ جس شاعر نے انسان کے لیے یہ بلند نقطۂ نگاہ اختیار کیا کیا اس کے لیے یہ تسلیم کرنے میں کوئی تامل ہونا چاہیے کہ اس نے دنیا بھر کے انسانوں کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا؟ نیز وہ محض اسی خطے کا شاعر نہیں جس میں پیدا ہوا اور اس میں زندگی گزاری۔ بل کہ معنوی خدمت گزاری کے اعتبار سے وہ ان تمام خطوں اور ملکوں کا شاعر تھا جن میں اس کے ہم جنس آباد ہیں۔ اسی طرح اس کی شاعری کسی خاص وقت اور خاص زمانے کے لیے نہ تھی۔ بل کہ وہ ہر دور اور ہر عہد کا شاعر تھا۔

سوال یہ نہیں کہ جو کچھ کہا گیا وہ کس زبان میں تھا؟ کہنے والا کون تھا؟ اور کس دور میں اس نے کہا؟ سوال یہ ہے کہ جو کچھ کہا گیا اگر وہ کسی خاص خطے اور خاص دور کے لیے نہ تھا تو اس کی شعر گوئی کو کیوں آفاقی نہ مانا جائے؟

خواجہ سنائیؒ فرماتے ہیں:

سخن کز روے دیں گوئی چہ عبرانی چہ سُریانی
مکاں کز بہر حق جوئی، چہ جابلقا، چہ جابلسا

یہ اس حقیقت کی ترجمانی تھی، جس کی گزارش میں نے کی۔

اقبالؒ بھی کہتے ہیں:

نہ زباں کوئی غزل کی، نہ زباں سے باخبر میں
کوئی دل کشا صدا ہو، عجمی ہو یا کہ تازی

پھر فرمایا:

ترکی بھی شیریں، تازی بھی شیریں
حرفِ محبت نہ ترکی نہ تازی!!

میرزا غالبؔ نے اشرف و برتر انسانیت کے جو اوصاف و خصائص بتائے، ان میں سے صرف چند کا ذکر یہاں اجمالاً پیش کروں گا۔

ان میں سے میرے نزدیک سب سے بڑھ کر خصوصیت اس وصف کو حاصل ہے جسے ہم عموماً بے غرضی اور خلوص سے تعبیر کرتے ہیں یعنی انسان اپنے ہم جنسوں کی خدمت انجام دینے میں کاملاً

بے غرض ہو اور کسی خدمت کے لیے کوئی اجرت، کوئی مزدوری اور کوئی بدلہ طلب نہ کرے بل کہ اعزاز بھی نہ چاہے۔ یہ سمجھ لے کہ جو کچھ اسے کرنا ہے اسے عزم اور اس یقین کے ساتھ کرے کہ زندگی میں اس کا وظیفہ یہی ہے۔

میرزا فرماتے ہیں:

شعلہ چکد غم کرا؟ گل شگفد مزد گو؟
شمعِ شبستانیم، بادِ سحرگاہیم

میں شبستان کی شمع ہوں جو رات بھر جلتی ہے تا کہ اندھیرا نہ رہے اُجالا رہے۔ رات بھر اس سے شعلے جھڑتے رہتے ہیں اور اس کے سوز و گداز میں کوئی فرق نہیں آتا۔ بہ ایں ہمہ اس نے کبھی کسی غم گسار و غم خوار کی آرزو نہیں کی۔ پھر میں صبح کی ہلکی ہلکی ہوا ہوں، جو چلتی ہے تو کلیاں کھل کھل کر پھول بنتی جاتی ہیں۔ اس خدمت کے لیے بھی میں نے کبھی کوئی اُجرت طلب نہیں کی۔ اشرف و برتر انسان کو اپنے ہم جنسوں کی خدمت اسی طرح انجام دینی چاہیے جس طرح شمع رات کے وقت شبستان میں اور بادِ سحر کے وقت باغ و چمن میں انجام دیتی ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کی دعوتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ وہ جب اپنی قوم کو دعوتِ حق دیتے تھے تو یہ بھی فرماتے تھے کہ ہم تم سے کوئی اجر نہیں مانگتے۔ ہمارا اجر تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ یہی شیوہ میرزا غالب کے نزدیک اشرف و برتر انسان کے لیے خدمت انسانیت کے سلسلے میں زیبا ہے۔

میرزا غالب اس امر کے بھی روادار نہیں کہ بہشت کو اس کی نعمتوں کی خاطر طلب کیا جائے۔ فرماتے ہیں:

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

میرزا تو جال پر دانے بکھیر کر پرندوں کی گرفتاری کو بھی نازیبا سمجھتے ہیں کیوں کہ جو پرندے دانوں کی خاطر جال پر گرتے ہیں، وہ دراصل تن پرور ہوتے ہیں۔ ان میں ذوقِ گرفتاری کیوں کر فروغ پا سکتا ہے۔

تا نیفتد ہر کہ تن پرور بود
خوش بود گر دانہ نبود دام را

در دام بہر دانہ نیفتم مگر قفس
چنداں کنی بلند کہ تا آشیاں رسد

میں دانے کی خاطر جال پر نہیں گر سکتا۔ مجھے گرفتار کرنے کا شوق ہے تو قفس کو اتنا بلند کر دو کہ میرے گھونسلے کے برابر پہنچ جائے اور میں محض گرفتاری کے شوق میں گھونسلے سے قفس میں پہنچ جاؤں۔ اقبالؔ نے بھی یہی فرمایا ہے:

جس کا عمل ہے بے غرض، اس کا مقام اور ہے
حور و خیام سے گزر، بادہ و جام سے گزر

انسانیت عالیہ کے خصائص میں ذاتی اغراض سے پاک ہونے کے علاوہ ایک اہم خصوصیّت غیرت و خودداری کی بھی ہے۔ میرزا فرماتے ہیں:

تشنہ لب بر ساحلِ دریا زغیرت جاں دہم
گر بہ موج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

فرض کیجیے کہ پیاس کے مارے میری جان لبوں پر آ گئی ہو اور دریا سامنے آ جائے، جس سے تھوڑا پانی لے کر پیاس کی آگ بجھا سکتا ہوں، تاہم دریا کی سطح پر ہلکی ہلکی لہریں دیکھ کر میرے دل میں گمان گزرے کہ یہ لہریں نہیں جو دریا کی طبعی خصوصیت ہیں بل کہ اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئی ہیں کہ یہ شخص کیوں میرے پانی سے پیاس بجھانے چلا آیا، تو میری غیرت و خودداری پیاس سے مر جانا گوارا کرے گی مگر دریا کے پانی کا ایک قطرہ بھی لبوں تک لے جانا حرام سمجھے گی۔ اسی غیرت و خودداری کی دعوت میرزا کے دوسرے اشعار میں بھی ملتی ہے مثلاً:

بندگی میں بھی آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا!
دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے

اشرف انسان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہمت و مردانگی کا جوہر اعلیٰ پیمانے پر موجود ہو۔ میرزا فرماتے ہیں:

مرد آنکہ در ہجومِ تمنا شود ہلاک
از رشکِ تشنۂ کہ بہ دریا شود ہلاک
نامرد را بہ گلخنہ آسایشِ مشام
مرد از تفِ سموم بہ صحرا شود ہلاک

دیکھیے جن سربفلک چوٹیوں کو آسمان جھک کر چومتا ہے، وہ مردانگی ہی کی بہ دولت سر ہوئیں۔ اتھاہ سمندروں کے سینے چیر کر جہازوں کے راستے پیدا کرنا جان بازوں ہی کا کام تھا۔ پھر بہادروں اور جوان مردوں ہی نے قطبین کے برفشانوں کی چھان بین میں جانیں لڑائیں۔ ہمت وروں ہی نے نئی زمینیں دریافت کیں۔ اب ستاروں پر کمندیں ڈالی جا رہی ہیں۔ انسان اس طرح خلا میں تیرتے پھرتے ہیں جیسے ندیوں کی سطح پر پرندے تیرتے نظر آتے ہیں۔ غرض مردانگی ہی پر علم و فن کی ہر پیش رفت اور ترقی کا انحصار ہے اور یہی تسخیر کائنات کے لیے سبقت و اقدام کی روح رواں ہے۔

مردانگی کے ساتھ محنت طلبی اور جفاکشی بھی لازم ہے کیوں کہ حقیقی انسان کا سب سے بڑا وظیفہ ہم جنسوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت ہے۔ یہ وظیفہ ادا نہیں ہو سکتا جب تک انسان اپنے آپ کو سختی، شدت اور جفاکشی کا عادی نہ بنا لے۔ میرزا کہتے ہیں:

چہ ذوقِ رہروی آں را کہ خار خارے نیست
مرو بہ کعبہ اگر راہ ایمنی دارد!!

جس سفر میں تکلیف، پریشانی اور افتاد کا کوئی اندیشہ نہ ہو، اس میں لطف ہی کیا ہے؟ نفسیات کے نقطۂ نگاہ سے یہ بھی واضح ہے کہ انسان اصل کام میں جتنی مشقتیں اور مصیبتیں اٹھائے گا، تکمیل کار پر اسے اتنی ہی زیادہ مسرّت و شادمانی ہوگی۔ دیکھیے اُردو کے ایک شعر میں میرزا انھی مشقت طلبی اور مشکل پسندی کا اظہار کس ولولہ انگیز ذوق و شوق سے کرتے ہیں:

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہُوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

پاؤں میں چھالے پڑ جائیں تو تلووں میں منہدی لگا کر پابند بستر ہو جاتے ہیں لیکن میرزا کے نزدیک علاج و استراحت قطعاً شایانِ التفات نہیں۔ وہ راستہ کانٹوں سے بھرا ہُوا پاتے ہیں، تو ان کا دل مسرّت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ انھیں چھالوں کا علاج کانٹوں ہی سے کرنا پسند ہے۔ خدمت گزارانِ انسانیت جب تک تکلیف و اذیت برداشت کر لینے کے عادی نہ ہو جائیں گے وہ خدمت کی راہ کے وظائف کیوں کر پورے کر سکیں گے؟

پھر میرزا کے نزدیک کانٹوں پر چلنا بجائے خود ایک نیکی ہے۔ اس طرح کانٹوں کی سوکھی ہوئی زبانوں کے لیے تری اور نمی کا انتظام ہو گا:

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یا رب
اک آبلہ پا وادیِ پُر خار میں آوے!!

میرزا کے نزدیک تو سرزمین حجاز میں کسی دریا کا نہ ہونا بھی قدرت کی ایک خاص مصلحت ہے۔ مقصود یہ ہے کہ جو لوگ حرم محترم کی زیارت کا عزم لے کر اٹھتے ہیں، معلوم ہو سکے کہ تشنگی برداشت کر لینے کے اعتبار سے ان کے ذوق و شوق کا درجہ کیا ہے:

عیار کعبہ رواں تا ز تشنگی گیرند
نہ دادہ اند دراں دشت راہ دریا را

محنت طلبی اور جفا کشی کے شعر بھی بہت ہیں مثلاً:

قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا
خوں بھی، ذوقِ درد سے، فارغ مرے تن میں نہیں
زخم سلوانے میں مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان رنج کی عادت ڈال لے گا تو رفتہ رفتہ احساسِ رنج خود بخود گند ہو جائے گا:

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

مجھے اس بحث کو طول نہیں دینا چاہیے۔ چند اور خصوصیتوں کی ایک ایک مثال سُن لیجیے:

قول اور فعل میں ہم آہنگی:

با خرد گفتم نشانِ اہلِ معنی باز گوی!!
گفت: گفتارے کہ با کردار پیوندش بود

صبر و ثبات:

دوزند گر بہ فرض زمیں را بہ آسماں
حاشا کزیں فشار بر ابرو خَم افگنم

دعوتِ عزیمت:

انسان کو ہمیشہ اولوا العزمی سے کام لینا چاہیے اگر اس سلسلے میں دار و رسن کی منزل بھی پیش آ جائے تو قدم پیچھے نہ ہٹانا چاہیے۔ میرزا فرماتے ہیں:

آخر کار نہ پیداست کہ در تن فزد!!
کف خونے کہ بداں زینت دارے نہ دہی

یعنی کیا یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح آشکارا نہیں کہ خونِ حیات کے جس پہلو کو تو آج سولی کی زینت بنانے کے لیے تیار نہیں، وہ بہ ہر حال کسی نہ کسی وقت تیرے بدن میں افسردہ ہو کر رہ جائے گا کیوں کہ موت ٹل نہیں سکتی اور اس میں دورانِ خون ختم ہو جاتا ہے۔

میرزا کی نظروں میں غم کو خاص قدر و قیمت حاصل تھی۔ خواہ آپ اسے غمِ عشق قرار دے لیں یا غمِ انسانیت۔ غم کی جو کیفیت انھوں نے مختلف مقامات پر بیان کی ہے، اس سے بظاہر غمِ انسانیت ہی مراد ہے۔ وہ ایک غزل کے مطلع میں کہتے ہیں:

غم جو بہم در افگند رو کہ مراد مے دہد
دانہ ذخیرہ مے کند کاہ بہ باد مے دہد

فصل کاٹتے ہیں تو دو چیزیں ملی جلی ہوتی ہیں: ایک غلّہ دوسرا بھوسا۔ غلّہ انسان کھاتے ہیں، بھوسا جانوروں کو کھلایا جاتا ہے۔ میرزا فرماتے ہیں کہ غم ایسی چیز ہے جو انسان کی تمام خامیاں اس

طرح الگ کر دیتا ہے، جس طرح بھوسا غلّے سے الگ ہو جاتا ہے اور انسان میں جو اچھائیاں ہیں وہ محفوظ ہو جاتی ہیں۔

یہی غم ہے، جس کے متعلق میرزا نے کہا تھا:

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یا رب کئی دیے ہوتے

میرزا کو ان لوگوں سے دل بستگی نہیں ہو سکتی جو اپنی آسودگی پر خوش ہوں، یعنی کسی کے لیے ان کے دل میں کوئی دردمندی اور کوئی تڑپ نہ ہو۔ فرماتے ہیں:

حذر از زمہریر سینۂ آسودگاں غالبؔ
چہ منتہا کہ بر دل نیست جانِ ناشکیبا را

اے غالبؔ! آسودہ دلوں سے دُور رہ۔ ان کے سینے زمہریر سے لبریز ہیں۔ جس کی فضا میں پہنچتے ہی ہر شے ٹھنڈی یخ ہو جاتی ہے۔ میرا دل درد سے خالی نہیں اور تجھے کیا بتاؤں کہ میری بے قرار جان کے کتنے احسان میرے دل پر ہیں۔

اب تک میں نے جو کچھ عرض کیا، یہ میرزا کی اُنسان دوستی ہی کی کرشمہ فرمائیاں تھیں۔ اب انسان دوستی کی کچھ عملی مثالیں بھی ملاحظہ فرمالیجیے یا ایسی مثالیں جو آرزوؤں اور تمناؤں کے دشتِ ناپیدا کنار میں مصروف دورو سیر رہتی تھیں۔

خواجہ حالؔی فرماتے ہیں:

> ''اگرچہ میرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل ان کے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا۔ ان کے مکان کے آگے لنگڑے لولے اور اپاہج مرد و عورت ہر وقت پڑے رہتے تھے۔ غدر کے بعد ان کی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپے ماہوار ہو گئی تھی اور کھانے پینے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے، اس لیے اکثر تنگ رہتے تھے''۔

خواجہ حالؔی ایک چشم دید واقعہ تحریر فرماتے ہیں:

''نواب لیفٹننٹ گورنر کے دربار میں ان کو حسبِ معمول سات پارچے کا خلعت مع

> تین رقوم جواہر کے ملا تھا۔ لیفٹننٹ کے چپراسی اور جمعدار قاعدے کے مطابق انعام لینے کو آئے۔ میرزا کو پہلے ہی معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا۔ اس لیے انھوں نے دربار سے آتے ہی خلعت اور رقوم جواہر بازار میں فروخت کرنے کے لیے بھیج دی تھیں۔ چپراسیوں کو الگ مکان میں بٹھا دیا اور جب بازار سے خلعت کی قیمت آئی، تب ان کو انعام دے کر رخصت کیا“۔

خواجہ حالیؔ ہی کہتے ہیں کہ ”ایک مرتبہ دلّی کے عمائدین سے میرزا کے ایک دلی دوست ملنے کے لیے آئے، جن کی حالت غدر میں سقیم ہوگئی تھی اور وہ چھینٹ کا فرغل پہنے ہوئے تھے۔ میرزا نے کبھی انھیں مالیدے یا جامہ دار کا چغہ پہنے بغیر نہیں دیکھا تھا۔ ان کے بدن پر چھینٹ کا فرغل دیکھ کر دل بھر آیا۔ ان سے پوچھا کہ یہ چھینٹ آپ نے کہاں سے لی؟ مجھے اس کی وضع بہت ہی بھلی معلوم ہوئی۔ آپ مجھے بھی فرغل کے لیے یہ چھینٹ منگوا دیں“۔ انھوں نے کہا: ”یہ فرغل آج ہی بن کر آیا ہے اور میں نے اسی وقت پہنا ہے اگر آپ کو پسند ہے تو یہی حاضر ہے“۔ میرزا نے کہا ”جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس وقت آپ سے چھین کر پہن لوں مگر جاڑا شدت سے بڑھ رہا ہے، آپ یہاں سے مکان تک کیا پہن کر جائیں گے؟ پھر ادھر ادھر دیکھ کر کھونٹے سے اپنا مالیدے کا نیا چغہ اتار کر انھیں پہنا دیا اور اس خوبصورتی کے ساتھ وہ چغہ ان کی نذر کیا“۔

یہ دوست مفتی صدرالدین آزردہ مرحوم و مغفور تھے۔ جن کی مدح میں میرزا کا ایک فارسی قصیدہ بھی موجود ہے۔ اس میں فرماتے ہیں:

صدر دین و دولت و صدر الصدورِ روزگار
میرو مخدوم و متاع و والی و مولائے من
خاکِ کوئش خود پسند افتادہ در جذب سجود
سجدہ از بہرِ حرم نگذاشت در سیمائے من
مشتری بامن بہ پوزش کایں بہ مفتی ہم نشیں
بگذرانی از نظر قرطاس استفتائے من

۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ عظیم کے بعد میرزا کی آمدنی کے تمام دروازے بند ہو گئے تھے اور وہ اپنے

کپڑے بیچ بیچ کر گزارا کر رہے تھے لیکن اس دور میں ان کے ہاں کھانا کھانے والے کم و بیش بیس افراد تھے۔ ان میں سے زیادہ تر ملازمین تھے۔ ہندو بھی اور مسلمان بھی۔ ان میں ایک میاں گھمن بھی تھے جو ہنگامے سے پیش تر ملازمت چھوڑ کر چلے گئے تھے لیکن جب گزارا نہ ہو سکا تو بال بچوں سمیت آ گئے اور میرزا نے انھیں قبول کر لیا۔

واجد علی شاہ کے ایک قصیدے میں فرماتے ہیں:

گدائے ترک نژادم زِ دودۂ سلجوق
فراخ تا نہ نہم خواں نمے خورم ناں را

بلاشبہہ میں گدا ہوں اور نسلاً ترک ہوں، سلجوقیوں کے خاندان سے میرا تعلق ہے، میں جب تک اپنا دستر خوان خوب پھیلا کر نہ بچھا لوں، کھانا نہیں کھاتا۔

سلجوقیوں میں سے طغرل، ارپ ارسلان اور ملک شاہ کی فتوحات اور نظام الملک طوسی کے دورِ وزارت میں سلطنت کے انتظام کی داستانیں تاریخ کے صفحات کی زینت ہیں۔ خدا جانے آج بھی انھیں کوئی قابلِ وقعت سمجھتا ہے یا نہیں لیکن میرزا غالبؔ نے سلجوقی خاندان کی جو خصوصیت اس شعر میں بیان کر دی ہے، یعنی کھانا کھانے کے وقت دستر خوان پھیلا کر بچھانا، یہ اس وقت تک سلجوقیوں کے سلطانی جاہ و جلال سے درخشاں تر رہے گی جب تک یہ کائنات اور میرزا کا فارسی کلام باقی ہیں۔

آرزوؤں اور تمناؤں کا ایک مرقع میرزا نے خود نواب علاء الدین خاں علائیؔ کے نام ایک مکتوب میں پیش کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ”اگرچہ یک فنا ہوں مگر مجھے اپنے ایمان کی قسم، میں نے اپنی نظم و نثر کی داد بہ اندازہ بایست پائی نہیں۔ آپ ہی کہا، آپ ہی سمجھا، قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں، بقدر ہزار یک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ٹین کا ایک لوٹا مع سوت کی رسّی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف میں جا پہنچا۔ نہ وہ دست گاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے تو نہ سہی، جس شہر میں رہوں، اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے“۔

یہ میرزا غالبؔ کی انسان دوستی کی چند جھلکیاں تھیں جو آپ کے سامنے پیش کر دیں۔ اصل موضوع بہت وسیع تھا اور اس کے لیے بہت زیادہ شواہد میرزا کے اُردو اور فارسی کلام میں موجود ہیں۔ منتظمین تقریب نے مجھ پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی لیکن خود مجھے مناسب معلوم نہ ہُوا آپ حضرات کو زیادہ زحمت دوں۔ دلی خلوص کے ساتھ آپ کے لطف و کرم اور نوازش کا شکر گزار ہوں۔ آرزو ہے کہ آپ میرزا غالبؔ کے کلام کو پڑھیں اور دیکھیں کہ اس گنجینے میں کیسے کیسے بے بہا گوہر ہیں۔ میرزا نے جب کہا تھا کہ:

باد برد آں گنج باد آورد و غالبؔ را ہنوز
نالۂ الماس پاش و چشمِ گوہر بار ہست

یہ سخن گستری نہ تھی، حقیقت کی جلوہ آرائی تھی۔

(یہ مقالہ بین الاقوامی مذکراۂ غالبؔ منعقدہ لاہور ۱۹۷۰ء میں پیش کیا گیا)

ماخوذ ہفت روز ''لیل و نہار''
کراچی مورخہ ۱۵ فروری ۱۹۷۱ء

داستانِ فرہاد اور غالب کا تصوّرِ محبت

در تہِ ہر حرفِ غالب چیدہ ام میخانہ
تا ز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن

فارسی اور اُردو کے عام شاعروں کی طرح میرزا غالب کے کلام میں بھی جا بہ جا مجنوں اور فرہاد کا ذکر ہے۔ میں دُوسرے شاعروں کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن میرزا نے فرہاد کوہکن اور مجنوں یا قیس کا نام جہاں کہیں لیا ہے، اپنے تصورِ عشق و محبت کا کوئی نہ کوئی پہلو نمایاں کرنے کی غرض سے لیا ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں فرہاد کے متعلق میرزا کے چند فارسی اور اُردو اشعار پیش کر کے میں اپنا نقطۂ نگاہ واضح کروں گا اور مجنوں کو پھر کبھی معرضِ بحث میں لاؤں گا۔

فرہاد اور مجنوں کے متعلق جو کچھ بیان کیا جاتا ہے اس میں شاعرانہ رنگ آمیزی اس پیمانے پر ہو چکی ہے کہ اب اس داستان سرائی میں سچائی اور واقعیت کا دریافت کرنا ممکن نہیں رہا۔ فرہاد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اچانک خسرو پرویز ساسانی کی ملکہ شیریں کو دیکھ کر عاشق ہو گیا۔ پرویز کے مشیروں نے غالباً رسوائی سے محفوظ رہنے کے لیے فرہاد کے ذمے ایک ایسا کام لگا دیا جس کا سرانجام بہ ظاہر غیر ممکن تھا یعنی بے ستوں پہاڑ کو کاٹ کر شیریں کے باغ کے لیے دُودھ کی نہر لانا لیکن جواں ہمت فرہاد نے یہ ناممکن کام بہت جلد پورا کر دیا۔ پھر اسے مروانے کے لیے ایک بڑھیا کو یہ پیغام دے کر بھیجا گیا کہ شیریں اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ فرہاد نے یہ سُنتے ہی تیشہ سر پر مارا اور مر کر اپنی نکالی ہوئی نہر میں گر گیا۔

میں نے بیان کردہ واقعات کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کر دیا اور اس سلسلے میں فردوسی کے شاہ نامے یا نظامی کی مثنوی خسرو شیریں سے تفصیلات پیش کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

تاریخی حقائق:

ایران کے مشہور مغربی شہر کرمانشاہ (جسے پہلے ’’کرمان شاہان‘‘ کہتے تھے) سے جو سڑک ہمدان کی طرف آتی ہے اس پر ’’بے ستوں‘‘ یا ’’بہ ستوں‘‘ اب بھی موجود ہے اور اس کا فاصلہ ہمدان

وکرمانشاہ سے قریباً یکساں ہے۔ یہاں سیاہ پتھروں کے ایک پہاڑ کے دامن میں ہخامنشی یا کیانی اور ساسانی دور کے آثار موجود ہیں۔ اس مقام کو آج کل ''طاق بستاں'' کہتے ہیں۔ سیاہ پہاڑ کا نام اصطخری اور ابن حوقل نے ''بہستون'' یا ''بے ستون'' بتایا۔ ساسانی دور کے آثار میں سے ایک مقام پر خسرو پرویز کو اپنے مشہور گھوڑے شبدیز پر سوار دکھایا گیا ہے اور شیریں اس سے بالاتر کھڑی ہے۔ یہ تمثالیں پتھر تراش کر بنائی گئی تھیں۔ اغلب ہے یہاں کسی زمانے میں خسرو پرویز نے اپنے لیے نہایت عمدہ باغ اور عشرت گاہ تعمیر کرائی ہو جس کے اردگرد رفتہ رفتہ داستان بافیوں کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ ایک عجیب وغریب رومان وجود میں آ گئی۔

عرفیؔ کا مسلک:

عرفیؔ نے لکھا ہے کہ اسے بھی فرہاد و مجنوں کے مشاغلِ خصوصی کا مرحلہ پیش آ گیا تھا لیکن وہ کہتا ہے کہ میں نے ان دونوں کی پیروی گوارا نہ کی یعنی مجنوں کی طرح لیلیٰ کے انتظار میں صحرا کے اندر بالکل بے حس وحرکت نہ کھڑا ہوا کہ چیلیں اور کوّے مجھے لُنڈ مُنڈ درخت سمجھ کر اس پر گھونسلے بنا لیتے۔ فرہاد کی طرح پہاڑ کاٹنے کی محنت ومشقت اٹھانا، اپنے مقام ومنصب کے شایان نہ سمجھا غم کے پہاڑ کو اپنی جُولانیوں سے پیستا ہوا آگے نکل گیا:

رہِ مجنونی و فرہادیم آمد درپیش
رفتم ایں راہ و لیکن نہ چوں ایشاں رفتم
آشیانِ زغن و زاغ نہ بستم برسر
کوہِ غم در تہِ پا سُودہ بجولاں رفتم

مجھے فی الحال عرفیؔ کے مسلک سے بحث نہیں۔ البتہ فرہاد کے متعلق میرزا غالبؔ کے بعض اشعار سے، ان کے تصوراتِ عشق ومحبت کی کیفیت پیش کرنا چاہتا ہوں۔

غیرت وحمیت:

میرزا کے نزدیک عشق ومحبت میں نہایت اہم حیثیت غیرت وحمیت کو حاصل ہے، وہ کہتے ہیں:

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو، کیا خوب!
ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

حقیقتِ حال کی توضیح کے لیے عرض کر دینا چاہیے کہ فرہاد نے جب بے ستوں کو کاٹ کر شیریں کے باغ کے لیے نہر لانے کا ذمہ اٹھایا تھا تو اس کے پیشِ نظر خسرو پرویز کی عشرت گاہ کی رونق یا اس کے باغ کی آب یاری نہ تھی۔ وہ صرف محبوب کے فرمان کی پیروی واجب و لازم سمجھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب عاشق منزلِ رضا و تفویض میں پہنچ جائے تو وہ صرف احکامِ محبوب کے امتثال کا پیکر بن جاتا ہے اور متعلقات پر نظر نہیں ڈالتا لیکن میرزا غالب نے پورے واقعے کا معروضی مطالعہ کیا تو ان کے دل میں کھٹک پیدا ہوئی۔ انھوں نے معاملہ فرمانِ شیریں کے امتثال تک محدود نہ رکھا اور یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اس طرح رقیب کی عشرت گاہ کے لیے رونق و شادابی فراہم کی گئی اگرچہ بلاواسطہ نہ سہی بالواسطہ ہی سہی چناں چہ ان کے نزدیک یہ معاملہ فرہاد کی نیک نامی میں خلل کا باعث بن گیا۔

یہ خیال میرزا کے کلام میں ایک سے زیادہ مقامات پر ظاہر کیا گیا ہے مثلاً:

کوہکن گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب
بے ستوں آئنۂ خوابِ گران شیریں

نیز:

از جوے شیر و عشرت خسرو نشاں نہ ماند
غیرت ہنوز طعنہ بہ فرہاد می زند

میرزا فطرۃً بھی غیور طبیعت کے تھے۔ ایک مقام پر کہتے ہیں:

تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم
گر بہ موج افتد گمانِ چین پیشانی مرا

یعنی اگر میں پیاس بجھانے کے لیے دریا پر جاؤں اور اس کی موجیں دیکھ کر دل میں خیال گزرے کہ دریا کی سطح پر لہریں نہیں، اس کی پیشانی پر شکنیں ہیں کہ کیوں یہ شخص میرے پانی سے استفادے کے لیے آ گیا تو پیاسا مر جاؤں گا لیکن پانی سے لب تر نہ کروں گا۔

پیشوں کا اعزاز و اکرام:

پہاڑ کاٹنے کے لیے فرہاد کو مزدوری کرنی پڑی اور کم از کم میرزا کے عہد کا معاشرہ مزدوری اور

محنت کشی کو کوئی معزز مشغلہ نہیں سمجھتا تھا مگر میرزا اپنے عہد کی اس کم نگہی اور حقیقت ناشناسی کو درخورِ قبول نہیں سمجھتے چناں چہ فرماتے ہیں:

پیشے میں عیب نہیں، رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

یعنی اگر فرہاد نے مزدوری کی، محنت و مشقت کی زحمت اٹھائی تو اس میں عیب کی کون سی بات ہے؟ دنیا کے دوسرے پیشوں کی طرح یہ بھی ایک پیشہ ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اُسے حقیر و کم رتبہ سمجھا جائے۔ اس حقیقت پر نظر رہنی چاہیے کہ اُس نے خاراشگافی کا کارِ دشوار مَردانہ وار اپنے ذمے لے لیا اور اسے پورا کر دیا۔ وہ ہم ہی آشفتہ سروں میں سے تھا جو سچے عاشق ہیں۔ افسوس کہ اس جوانی ہی کے عالم میں جان دے دی۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ میرزا غالبؔ اُردو زبان کے شاعروں میں پہلے فردِ جلیل و عظیم تھے جنھوں نے مزدوروں کے پیشے کی عزّت و حرمت کا ڈنکا پورے زور سے بجایا اور اس طرح تمام پیشوں کی یکساں عزّت و حرمت کے لیے آواز بلند کی۔

رسموں اور ریتوں سے نفرت:

میرزا فطرۃً آزادہ رو تھے۔ پرانی رسموں اور ریتوں سے انھیں ہمیشہ نفرت رہی۔ میرزا حاتم علی بیگ مہرؔ کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

> "تمھارا حلیہ دیکھ کر تمھارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا، کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما تھا۔ تمھارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چنپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستایش کیا کرتے تھے...... جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے، ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقہ، بھٹیارا، جولاہا، کنجڑا، منہ پر داڑھی، سر پر بال۔ فقیر نے جس دن داڑھی رکھی، اسی دن سر منڈوایا"۔

گویا انھیں عمومی احوال میں بھی رسمِ عام کی پیروی منظور نہ تھی پھر وہ فرہاد کے سلسلے میں رسوم و قیود کی پابندی کو کیوں کر پسندیدہ سمجھ سکتے تھے؟ چناں چہ فرماتے ہیں:

تیشے بغیر مر نہ سکا، کوہ کن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

یعنی تیشہ یا کوئی اور چیز سر پر مار کر جان دے دینا ایک دقیانوسی رسم تھی۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ فرہاد سرگشتگی خمارِ رسوم و قیود سے بالاتر نہ ہو سکا گویا میرزا غالبؔ کو عشق و محبت کی جاں بازیوں میں بھی رسمِ عام کی پیروی سخت ناگوار تھی۔

سادگی:

عشق و محبت کا ایک وصف ''سادگی'' بھی ہے جو میرزا کو بہت پسند ہے۔ فرماتے ہیں:

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

پُرکار و عیار بُڑھیا نے بے تکلف فرہاد کو یہ جھوٹی خبر سنا دی کہ شیریں مر گئی۔ بدنصیب عاشق نے یہ سنتے ہی تیشہ سر پر مارا اور مر گیا اس لیے کہ محبوب کے مر جانے کے بعد محبّ و عاشق کے لیے جینا باعث ننگ تھا اگر وہ سادگی کا پیکر نہ ہوتا تو اصل واقعے کی چھان بین کرتا، پوچھتا کہ آخر کیا صورت پیش آ گئی؟ آیا شیریں بیمار ہوئی؟ بیمار ہوئی تو اسے کیا آزار تھا؟ علاج کس سے کرایا گیا؟ یا کم از کم یہی سوچ لیتا کہ ایک بے سروپا بُڑھیا کی بات کو کیوں صحیح سمجھ لیا جائے اور کس وجہ سے حقیقتِ حال کی ٹوہ نہ لگائی جائے؟

غرض میرزا کے نزدیک عاشق مدبّروں، سیاست دانوں اور دانش مندوں کی طرح ہر شنید کا کھوج لگانے کے عادی نہیں ہوتے۔ ہر اُمر کی تحقیق کے درپے نہیں رہتے۔ عشق اتنے تحمل اور غور و فکر کا متحمل کب ہوتا ہے؟

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

فرہاد کو یہ کام سونپا گیا تھا کہ پہاڑ کاٹ کر نہر لے آئے۔ یہ اس کے زورِ بازو اور نیروے تن کی آزمایش تھی جس میں وہ پورا اُترا پھر حوصلہ آزمائی کا مرحلہ پیش آیا تو پہلے ہی قدم میں ناکام رہا اور نامراد دنیا سے رخصت ہو گیا۔ میرزا فرماتے ہیں:

کریں گے کوہ کن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ابھی اس خستہ کے نیروے تن کی آزمایش ہے

جگرِ سنگ چیرنے کی پاداش:

میرزا کے نزدیک کائنات کے ذرّے ذرّے میں روح ہے اور جمادات و نباتات کا دامن بھی قدرت کی اس دولتِ خاص سے خالی نہیں بل کہ ان کا عقیدہ ہے کہ کائنات ہر لحظہ ارتقا کی منزلیں طے کرتی جا رہی ہے اور ہم لوگ اس ارتقا کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ کہتے ہیں:

در ہر مژہ برہم زدن ایں خلق جدید است
نظارہ سگالد کہ ہماں است و ہماں نیست

یہ کائنات ہر پلک جھپکنے میں عملِ ارتقا کی بنا پر نئی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ بہ ظاہر دیکھنے میں ویسی ہی معلوم ہوتی ہے، جیسی پہلے تھی، حقیقت میں ویسی نہیں رہتی۔

چناں چہ میرزا کہتے ہیں کہ تیشہ لے کر پہاڑ کا جگر چیر ڈالنا اچھا فعل نہ تھا۔ فرہاد نے سمجھ لیا کہ پہاڑ بے جان و بے روح ہے لیکن دیکھا اس فعل کی پاداش نے کیا صورت اختیار کی؟ تیشہ جانتا ہے کہ وہ کس طرح قضاے مبرم بن کر فرہاد کے سر پر گرا:

تا نہ دانی جگر سنگ کشودن ہدر است
تیشہ داند کہ چہا بر سر فرہاد آمد

رستمانہ مردانگی کی ادا:

تاہم میرزا کو فرہاد کی بے باکی اور پہاڑ کو چیر کر رکھ دینے میں رستمانہ مردانگی بے حد پسند ہے۔ فرماتے ہیں:

از رشک بخوں خلتم و از ذوق بہ رقصم
زاں تیشہ کہ در پنجۂ فرہاد بجنبد

جو تیشہ فرہاد کے ہاتھ میں لہرا رہا ہے اس پر رشک سے میں خون میں لوٹ رہا ہوں اور سرشاری ذوق سے رقص کر رہا ہوں۔ ایسی کٹھن مہموں کو بے خودانہ بے پروائی سے سر کرنے پر آمادہ ہو جانا اسی لائق ہے کہ اس پر زیادہ سے زیادہ رشک کیا جائے اور روے زمین کو عرصہ گاہ رقص بنا لیا جائے۔

میرزا عشق و محبت میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دینے کو ہرگز پسندیدہ نہیں سمجھتے۔ انھیں مجنوں کا طریقہ شایانِ شان معلوم نہیں ہوتا۔ وہی جاں بازی و ہمت وَری ان کے سازِ وجود کا ترانۂ دلربا و دل آویز ہے جس کا نقشہ فرہاد نے پیش کیا:

ہمت ز دمِ تیشۂ فرہاد طلب کن
مجنوں مشو و مُردن دشوار میاموز

مسئلہ جوے شیر:

آخر میں ’’جوے شیر‘‘ کا مسئلہ اپنے مشاہدات کی بنا پر واضح کر دینا چاہتا ہوں۔

میں بھی ابتدا میں یہی سمجھتا تھا کہ پہاڑ چیر کر ’’جوے شیر‘‘ لانے کا معاملہ حقیقت پر مبنی تھا لیکن پہاڑوں میں چکر لگاتے لگاتے کئی مرتبہ یہ نظارہ دیکھا کہ بلندی سے کوئی چھوٹا سا نالہ نیچے وادی میں اتر رہا ہے اور اوپر سے نیچے تک مسلسل دودھ کی طرح سفید معلوم ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہی ذہن میں آیا کہ پانی چھوٹے چھوٹے سنگ ریزوں سے ٹکراتا ہوا آتا ہے اور اس کے اصل رنگ میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔ نالوں اور ندیوں کے اندر بھی جہاں جہاں تک بہاؤ میں بہت سے پتھر آ جاتے ہیں اور پانی ان سے ٹکراتا ہُوا گزرتا ہے تو ندی دُور سے سفید ہی نظر آتی ہے۔

یہ تو فضول بات ہے کہ شیریں کو تازہ دودھ کی ضرورت تھی اور اسے پہاڑ کٹوا کر اپنے قصر تک لانے کا یہ انتظام سوچا گیا تھا کیوں کہ پینے کا دودھ نہر کی شکل میں لانا بہ ظاہر خارج از بحث تھا اگر اس نہر کی تہ اور اطراف پر شفاف پتھر بھی بچھا دیے جاتے تو دُودھ کو اوپر سے محفوظ رکھنے کی کیا صورت تھی؟ پرندے یا جانور جہاں چاہتے اس میں دُودھ پینے لگتے اور یہ دُودھ استعمال کے قابل نہ رہتا۔ اغلب

ہے پہاڑی سنگ ریزوں سے ٹکراتے ہُوئے آنے والی پانی کی سفیدی دیکھ کر اسے دودھ سے مشابہ سمجھ لیا گیا۔ اس طرح ''جوے شیر'' کا افسانہ داستان فرہاد کا ایک لاینفک جزو بن گیا۔

ویسے میرے نزدیک پوری داستان ہی اپنی تفصیلات کے ساتھ محلِ نظر ہے تاہم شاعروں کی خوش فکریوں کے باعث یہ خاصی دل آویز بن گئی ہے۔

(اُردو زبان - سرگودھا جنوری فروری ۱۹۶۹ء
العلم کراچی جنوری تا مارچ و اپریل تا جون ۱۹۶۹ء)

غالبؔ کا تصورِ جنّت و دوزخ

اصل مضمون کے متعلق بات چیت شروع کرنے سے پہلے یہ عرض کر دینا چاہیے کہ جن شاعروں کو ایک خاص فلسفے کا مالک سمجھا جاتا ہے یا جن کے بارے میں عام عقیدہ ہے کہ وہ ایک خاص تعلیم یا پیغام لے کر دنیا میں آئے تھے اور انھوں نے اپنی پوری زندگیاں اسی تعلیم یا پیغام کی اشاعت میں گزار دیں، ان کے کلام میں بھی ایسے اشعار مل جاتے ہیں جنھیں ان کے فلسفے یا پیغام کے تحت نہیں لایا جا سکتا اگرچہ تاویلات کے سلسلے کو کتنا ہی پھیلا دیا جائے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اچانک خاص حالات پیش آ گئے جن سے شاعر کے دل پر گہرا اثر پڑا اور وہ اثر بے اختیار شعر بن کر زبان پر آ گیا یا شوخیِ طبع کے رباب پر مضراب لگی اور ترانہ پیدا ہو گیا۔ غالبؔ کے اُردو اور فارسی کلام میں بھی ایسے کئی اشعار ملتے ہیں جنھیں جزا و سزا یا آخرت کے متعلق غالبؔ کے مستقل فلسفے سے کوئی مناسبت نہیں اور ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ یا تو وہ خاص تاثرات کے ماتحت کہے گئے یا وہ شاعر کی شوخیِ طبع کے کرشمے تھے مثلاً:

زاہد نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمھاری شرابِ طہور کی

☆

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں، منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

☆

وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام و مشکبو کیا ہے

☆

خوش است کوثر و پاک است بادہ کہ دروست
ازاں رحیقِ مقدس دریں خمار چہ حظ؟

آخری شعر جن حالات میں کہا گیا ہوگا، ذرا غور فرمائیں گے تو ان کا نقشہ کچھ اس طرح کا ہوگا کہ زندگی کی تکلیفیں حدِ برداشت سے بڑھ گئیں۔ حالات کی ناسازگاری نے جینا دُوبھر کر دیا۔ کسی ہمدرد و غم خوار نے دل داری اور حوصلہ افزائی کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ ان پر صبر کیجیے، آخرت میں ان تکلیفوں کا گراں قدر اجر ملے گا۔ جنت نصیب ہوگی اور وہاں پینے کو کوثر کا زلال ہوگا۔ شاعر کو آخرت کے اجر سے انکار نہیں، وہ تسلیم کرتا ہے کہ آبِ کوثر نہایت پاکیزہ اور خوش گوار مشروب ہے لیکن ساتھ ہی خیال آتا ہے کہ خمار نے تو اب جسم و روح کو عذاب کے فولادی شکنجے میں جکڑ رکھا ہے اور کسی پہلو کل نہیں پڑتی۔ اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کی فوری تدبیر ہونی چاہیے۔ کوثر کی بشارت آج کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے؟

یا مثلاً زندگی بھر اتنی مصیبتوں سے سابقہ پڑا کہ دل یاس و افسردگی کا پیکر بن گیا۔ امید و آرزو کے سارے محل ڈھے گئے۔ ہر سمت ویرانی ہی ویرانی نظر آنے لگی۔ شاعر سوچتا ہے کہ مرنے کے بعد جنت عطا ہوگی تو بے شک اس میں سراسر راحتیں اور آسایشیں ہوں گی لیکن یہ راحتیں اور آسایشیں ان رنجوں، غموں، تکلیفوں اور آرزو شکنیوں کی تلافی کیوں کر کر سکیں گی جن سے عمر بھر سابقہ پڑا رہا؟ لہٰذا بے اختیار ہو کر کہتا ہے۔

جنت نہ کند چارۂ افسردگیِ دل
تعمیر بہ اندازۂ ویرانیِ ما نیست

اس سے یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ ہم پر غموں کے ایسے سیل گزرے کہ جنت بھی مل جائے تو ان کی تلافی نہ کر سکے گی۔ یعنی:

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

شوخی طبع کی مثال میں یہ شعر بھی پیش کیا جا سکتا ہے:

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

وقتی حالات سے متاثر ہونے کی نہایت عمدہ مثال سن لیجیے۔ غالبؔ کی طبیعت کا رنگ ڈھنگ

شاہانہ تھا۔ وہ امیر گھرانے میں پیدا ہوے۔ امیری کی فضا میں ابتدائی پرورش پائی۔ وقت کے امیرزادوں کی سی عادتیں پختہ ہوگئیں۔ اس کے مقابلے میں مالی حالات بگڑتے بگڑتے اس درجے پر پہنچ گئے کہ معمولی زندگی گزارنے کے بھی سامان میسر نہ رہے۔ امیرانہ ٹھاٹھ کو قایم رکھنے کے لیے قرض لینا شروع کیا۔ قرض بڑھتا گیا۔ نہ طبیعت کا طور بدلا، نہ مالی حالت بہتر ہوئی اگرچہ اس کی بہتری کی توقعات برابر قایم رہیں۔ قرض خواہوں کے تقاضوں نے ناک میں دم کر دیا۔ آمدنی میں سے ان کو کچھ دے دلا کر مطمئن کرنا چاہا تو گھر کا خرچ چلانے کی کوئی صورت نہ رہی۔ شاعر فطرتاً حساس ہوتا ہے اور غالبؔ کی ذکاوتِ حس تو درجۂ کمال پر پہنچی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے زندگی اس کے لیے عذابِ دوزخ سے سوا ہوگئی۔ اسی حالت میں کہتا ہے کہ فرض کر لے تجھے دوزخ میں ڈال کر غضب باری تعالی کے اس تنور کا منہ سرپوش سے بند کر دیا گیا۔ اس پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ:

واں کہ نہ باشد درآں مضیقِ مصیبت
در طلب جامہ و ناں کش مکش از زن
واں کہ نہ باشد درآں مقامِ صعوبت
شور ناروای تقاضای مہاجن

یعنی یقین رکھ مصیبت کی اس تنگ ناے میں بیوی کی طرح روٹی کپڑے کے لیے کش مکش نہیں ہوگی اور یقین رکھ کہ صعوبت کے اس مقام میں مہاجن اپنا روپیہ مانگنے کے لیے نہیں پہنچے گا اور اس کے بے ہودہ شور سے طبیعت بدمزہ نہیں ہوگی۔

پھر شاعر بعض اوقات ایسی باتیں بھی کہہ جاتا ہے جن کی حقیقت تک عام لوگوں کی نظریں نہیں پہنچتیں۔ الفاظ سے سرسری طور پر معنی پیدا ہوتے ہیں انھی کو صحیح مان کر وہ قناعت کر لیتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ معنی دلوں اور دماغوں میں اس طرح پیوست ہو جاتے ہیں کہ کسی کو مزید غور و فکر اور تحقیق و کاوش کا خیال ہی نہیں آتا۔ غالبؔ کو اس قسم کی سہل انگاریوں اور خوش فہمیوں سے بھی سابقہ پڑتا رہا۔ میں اس سلسلے میں صرف ایک مثال پیش کروں گا۔ اس کا مشہور شعر ہے:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس شعر میں غالب نے جنت کو بے حقیقت اور محض ایک خیال سراب قرار دیا ہے جو دل کو خوش رکھنے یا فریبِ مسرت دینے کے لیے ایجاد کی گئی۔

میں جانتا ہوں کہ سخن وروں کے ہر شعر کو مذہب و شریعت کی میزان میں نہیں تولا جا سکتا جو لوگ ایسے اشعار کے متعلق حسنِ ظن کے مسلک پر چلتے ہیں، وہ یہ کہہ کر گزر جاتے ہیں کہ یہ "رندانہ" بات ہے اور رندی کے معانی کی وسعت محتاجِ تشریح نہیں لیکن اگر غور و تحقیق کا قدم آگے بڑھایا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس شعر کے ایک اور معنی بھی ہو سکتے ہیں جنھیں غالب کی بلند نظری اور ذوقِ عرفان سے زیادہ مناسبت ہے۔

جنّت کے متعلق مذہبی کتابوں میں جو کچھ بیان ہوا ہے حکمت و معرفت کا مذاق رکھنے والے اصحاب اسے محض مجازی رنگ میں قبول کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ خدائے رحیم و کریم اپنے فرماں بردار اور اطاعت گزار بندوں کو نیک عملی کے بدلے میں سرور و راحتِ ابدی کی جو نعمتیں عطا کرے گا ان کی حقیقت ہمارے تصور سے بہت اونچی ہے۔ مذہبی کتابوں میں اس سرور و راحت کو بیان کرنے کے لیے جو تعبیریں اختیار کی گئیں، وہی تھیں جو انسانوں کی سمجھ میں آ سکتی تھیں مثلاً شاداب باغ ہوں گے، ان میں نہریں جاری ہوں گی ایسی حُوریں ہوں گی جن کا دامن جن و انس میں سے کسی کے مس سے میَلا نہیں ہوا۔ سدا بہار میوے ہوں گے۔ میرے خیال میں ان بیانات کا مقصود یہ ہے کہ ان نادیدہ اور ناشنیدہ نعمتوں کی ایک سرسری کیفیت اور ایک سرسری جھلک سامنے آ جائے۔ حقیقت اس سے بہت بلند اور انسانی فہم کی گرفت سے بہت بالا ہے۔ کیوں اس شعر کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ غالب اس حقیقت کا اظہار کر رہا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ جنت اصلاً جو کچھ ہے اسے صرف عارف ہی جان سکتے ہیں۔ عوام نے اظہار و بیان کے مجازی پیرایوں کو حقیقت سمجھ لیا اور اسی کو دلوں کی مسرت و شادمانی کا سرمایہ سمجھ کر قانع ہو گئے۔

لیکن جنت و دوزخ کے بارے میں غالب کا ایک خاص اور مستقل فلسفہ بھی ہے، اس نے محض جزا و سزا کی حقیقت ہی بیان نہیں کی بل کہ محاسبۂ اعمال کے متعلق بھی جا بہ جا حکیمانہ انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے اگر چہ ٹھیٹھ شرعی نقطۂ نگاہ سے اس کے باب میں کوئی رائے قایم نہیں کی جا سکتی اور ظاہر ہے کہ محاسبۂ اعمال کے بغیر جزا و سزا کا فیصلہ نہیں ہو سکتا مثلاً وہ کہتا ہے:

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

یعنی فرشتے ہمارے اعمال کے متعلق جو کچھ لکھتے رہے وہی حساب کتاب کے وقت ہمارے خلاف دستاویز بن گئی۔ ہمیں کیا معلوم کہ وہ کیا لکھتے رہے؟ ہمارا کوئی وکیل یا مختار تو موقع پر موجود نہ تھا، جو اِن کے لکھے ہوئے پر اعتراض کر سکتا۔ اس یک طرفہ تحریر کو کس بنا پر قبول کر لیا جائے؟ یہ شعر درحقیقت کتابتِ اعمال کے متعلق عام تصور پر مبنی ہے ورنہ بارگاہ باری تعالیٰ میں کسی کو اس قسم کی بات کہنے کی کب مجال ہے جہاں انسان کے اپنے اعضاو جوارح اس کے نیک یا بداعمال کے گواہ ہوں گے؟

پرسشِ اعمال کے سلسلے میں دو رائیں ہیں: ایک گروہ انسان کو مجبور مانتا ہے۔ دوسرا اسے مختار تسلیم کرتا ہے۔ غالب کے ہاں دونوں گروہوں کے افکار و خیالات کا ثبوت موجود ہے مثلاً:

نیکی زتست، از تو نخواہیم مزدِ کار
ورخود بدیم کارِ تو ایم انتقام چیست؟

یعنی اے خدا! تو نے جیسا ہمیں بنا دیا ویسے ہی اعمال ہم سے سرزد ہوتے رہے، جو صلاحیتیں ہمارے وجود میں رکھ دیں وہ بروئے کار آتی رہیں اگر ہم سے کوئی نیک عمل بن آیا تو وہ تیری رحمت کا کرشمہ تھا، اس کے لیے ہم کوئی اجر اور کوئی انعام مانگنے کے حق دار نہیں۔ اس لیے کہ اس میں ہمارا ہاتھ نہ تھا۔ اسی طرح اگر ہم بُرے ہیں اور ہم سے برائیاں ہی برائیاں سرزد ہوتی رہیں تو تیرے بنائے ہوئے تھے پھر سزا کیوں دی جاتی ہے؟

اس شعر میں انسان کو مختار نہیں مجبور مانا گیا ہے اگر اسے ایک خاص دائرے میں مختار مانا جائے تو غالب کہتا ہے کہ بے شک مجھ سے ایسے افعال سرزد ہوتے رہے جن کا ارتکاب گناہ تھا اور ان کے لیے ضرور سزا ملنی چاہیے لیکن اس سلسلے میں بعض افعال کی حسرت بھی رہ گئی اس لیے کہ بہ قدر آرزو اسباب میسّر نہ آئے۔ اب اگر گناہوں کا جائزہ لے کر مجھے سزا کے قابل ٹھہرایا جاتا ہے تو میری حسرتوں اور ناکامیوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، ان کا صلہ بھی دیا جائے۔ کردہ گناہوں کی سزا اور ناکردہ گناہوں کی حسرتوں کو بالمقابل رکھا جائے گا تو معاملہ برابر ہو جائے گا:

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

اندرآں روز کہ پرسش رود از ہرچہ گذشت
کاش با ما سخن از حسرتِ ما نیز کنند

مثنوی ''ابر گہر بار'' کی مناجات میں اس مضمون کو نہایت پُر تاثیر انداز میں پھیلا پھیلا کر پیش کیا ہے اور اپنی حالت کا نقشہ ایسے رنگ میں کھینچا ہے کہ ہر حساس آدمی اسے پڑھ کر بے اختیار پکار اُٹھے گا، یہ شخص واقعی لائقِ بخشش ہے۔

دوزخ کو غالب عذاب نہیں بل کہ ذریعہ اصلاح اور تازیانہ تادیب مانتا ہے۔ کہتا ہے اس زندگی میں انسان سے اچھے بُرے دونوں قسم کے افعال سرزد ہوتے ہیں۔ طبیعتوں میں میل کچیل کے اجزا باقی رہ جاتے ہیں اور نیک عملی سے ان کا تنقیہ یہاں نہیں ہوسکتا۔ خدائے پاک نے ان اجزا کو دامن طبیعت سے چھڑانے کے لیے ایک گرمابہ تیار کر دیا، وہ دوزخ ہے اس گرمابے کا مقصد یہ نہیں کہ ہمیں دُکھ اور اذیت پہنچائے بل کہ ہماری طبیعتوں سے میل کچیل دور ہو جائے اور ہم پاک و صاف ہو کر اس کی رضا و خوش نودی کے مستحق بنیں:

گشت گرمابہ ساز از دوزخ   تا بشوید نہادِ ما زِ وسخ

غالب کا نظریہ ہے کہ جس چیز میں ثبات و استقامت نہیں اور بدلتی رہتی ہے، وہ آرزو کے لائق نہیں۔ حسرت و شادمانی کا رنگ بدل جانے کا ڈر دل کو ہر لحظہ پریشان رکھتا ہے یاس و نومیدی اگر مستقل ہو تو اس پر غم گین ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

گردشِ رنگ طرب سے ڈر ہے
غمِ محرومی جاوید نہیں

اس نظریے کی بنا پر دوزخ کے متعلق لکھتا ہے:

زینہار از تعبِ دوزخِ جاوید مترس
خوش بہاری است کز وبیم خزاں برخیزد

یعنی دوزخ کے دائمی عذاب سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ تو ایک ایسی بہار ہے جس پر کبھی خزاں نہیں آئے گی۔ جس بہار کو خزاں کا کوئی خوف باقی نہ رہے، اسے کون پسندیدہ اور مرغوب نہ سمجھے گا؟ پھر وہ صرف رضائے خدا یا محض خدا کا طلب گار ہے۔ جنت کو اپنا نصب العین نہیں بنانا چاہتا۔ اس کے نزدیک جنت کی آرزو، درحقیقت اپنے احساسات لذت کی تسکین کی آرزو ہے۔ اس میں للّٰہیت نہیں۔ عمل وہی قابلِ قدر ہے، جس میں للّٰہیت ہو، جو خالصتاً خدا کے لیے ہو۔ اپنی کوئی غرض اس میں شامل نہ رہے:

طاعت میں تا رہے نہ می و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

اس نے اپنے دل کو تمام آرزوؤں سے پاک کرلیا تھا صرف ایک آرزو اور ایک طلب باقی رہ گئی تھی اور وہ یہ کہ خدا کی رضا کیا ہے؟ وہ خوش ہوکر اپنے بندے کو کیا دیتا ہے؟ غالب کہتا ہے کہ جن لوگوں کو اپنے اچھے اعمال پر ناز ہے اور ان کے نشے میں مست ہیں یعنی ان کی جزا کے طلب گار ہیں ان کی خواہش یقیناً یہی ہوتی ہے کہ دوزخ سے بچ جائیں اور بہشت میں جگہ پائیں۔ میری نظر مالکِ کُل کی عطا پر ہے۔ اس کی بارگاہِ لطف سے شعلہ ملے یا پھول، دوزخ کی آگ ملے یا بہشت کی بہار، اسی کو تمام آرزوؤں کا ماحصل اور تمام تمناؤں کا نچوڑ سمجھتا ہوں اگر اپنی خواہش کو اس کی عطا پر مقدم رکھوں تو یہ بات مقامِ رضا میں ثبات کے خلاف ہوگی۔

مخمورِ مکافات بہ خلد و سقر آویخت
مشتاقِ عطا شعلہ زِ گُل باز ندانست

یہی مقام ہے جہاں پہنچ کر اس نے کہا:

ستایش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گل دستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

جس باغ رضواں کی ستایش میں زاہد اس قدر سرگرم ہے ہم بے خُودانِ عشقِ حق نے اسے طاقِ نسیاں کا ایک گل دستہ سمجھ رکھا ہے یعنی بالکل بھلا دیا ہے اور ہمارے ذہن اور دماغ میں اس کے تصور کی ایک ہلکی سی جھلک بھی کبھی نہیں گزری۔ اس مضمون کو فارسی کی ایک رباعی میں بھی بیان کیا ہے:

آں را کہ عطیۂ ازل در نظر است
ہر چند بلا بیش، طرب بیش تر است
فرق است میانِ من و صنعاں در کفر
بخشش دگر و مزدِ عبادت دگر است

ایک جگہ کہتے ہیں کہ اے محبوب ازلی! ہم تو تیرے دیدار کے پیاسے ہیں، ہمیں بہشت کی آرزو کیوں ہو؟ وہ تو ہماری نظر میں محض ایک سراب ہے، جس سے پیاس نہیں بجھ سکتی، بل کہ تیز تر ہوگی:

لب تشنۂ دیدار ترا خلد سراب است

پھر عارفوں کے انداز میں فرماتا ہے کہ بندے اور باری تعالیٰ کے درمیان ایک راستہ ہے جسے طے کیے بغیر بندہ حضوری کا مقام حاصل نہیں کرسکتا۔ بہشت کی خاص چیزیں کیا ہیں؟ کوثر اور طوبیٰ۔ عارفوں کے نزدیک حضوری کے راستے میں کوثر ایک چشمہ ہے اور طوبیٰ ایک سایہ دار درخت یعنی وہ منزلِ مقصود نہیں:

راہی است زعبد تا حضور اللہ
خواہی تو دراز گیر، خواہی کوتاہ
ایں کوثر و طوبیٰ کہ نشانی دارد
سرچشمہ و سایہ ایست در نیمۂ راہ

بخشش کا کون طلب گار نہیں؟ لیکن غالب کے نزدیک محض مہربانی اور رعایت کی بنا پر بخشا جانا باعثِ شرم ساری ہے اور شرم ساری اس درجہ اذیت پہنچاتی ہے کہ سات دوزخوں کی آگ بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی:

ہفت دوزخ در نہاد شرم ساری مضمر است
انتقام است ایں کہ با مجرم مدارا کردہ ای

خدا نے لطف و نوازش سے ہمیں بخش دیا۔ ہم شرمندگی سے پانی پانی ہوگئے۔ غیرت کا تقاضا یہی تھا۔ اس شرمندگی نے ہمارے دل کو جو دُکھ پہنچایا اس میں سات دوزخوں کے برابر عذاب تھا بلاشبہ ہم پر مہربانی ہوئی اور ہمارے ساتھ رعایت برتی گئی لیکن بدعملی کا عذاب اس سے بہ درجہا بہتر تھا۔ دیکھیے اس شعر میں حسنِ عمل کا کتنا پاکیزہ سبق موجود ہے۔

اس بات چیت کو میں غالب کی تین رباعیوں پر ختم کرتا ہوں جن سے اندازہ ہو سکے گا کہ اس کے بدن کا ہر قطرۂ خون عشقِ حق کی حرارت سے کس درجہ معمور تھا:

یا رب نفسِ شرارہ بیزم بخشند
یا رب مژہ ہاے دجلہ ریزم بخشند
بے سوزِ غمِ عشق مبادا زنہار
جانے کہ بروزِ رستخیزم بخشند

اوراست اگر ہزار چیزم بخشند
اوراست اگر بہشت نیزم بخشند
بر دوست فدا کنم بہ صد گونہ نشاط
جانے کہ بہ روزِ رستخیزم بخشند

قانع نیم ار بہشت نیزم بخشند
از بخشش خاص تاچہ چیزم بخشند
امید کہ صرف رونمای تو شود
جانے کہ بہ روزِ رستخیزم بخشند

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان) ماہِ نو کراچی فروری ۱۹۵۶ء
ماہِ نو کراچی جنوری - فروری ۱۹۶۹ء
فروغ اُردو لکھنؤ فروری ۱۹۶۹ء
روزنامہ کوہستان لاہور ۱۹۶۹-۲-۱۶

میرزا غالبؔ کے چند شعر

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

یہ کہنا یقیناً مشکل ہے کہ قدرت کی کون کون سی بخششیں اور موہبتیں شعر گوئی کے لیے حقیقی بنیادی اوصاف و خصائص مہیا کرتی ہیں پھر ان اوصاف و خصائص کے بلوغ و نمو میں مشق و ریاضت کا حصہ کس قدر ہے۔ ہمارے سامنے ایسے شاعروں کی ایک طویل صف موجود ہے جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ شعر میں بسر ہوا مگر وہ ایک محدود دائرے سے باہر قدم نہ رکھ سکے انھوں نے ہوش کی آنکھ کھولی تو دیکھا کہ سیکڑوں شاعر ہزاروں مضامین مختلف صورتوں میں باندھ چکے ہیں۔ بس انھوں نے اپنی عمریں انھیں میں سے عام مضامین کی الٹ پلٹ، ادھیڑ بن اور کشاد و بست میں گزار دیں۔ کبھی کسی مضمون کی بندش میں ذرا چستی پیدا ہو گئی یا کوئی محاورہ ذرا زیادہ موزوں انداز میں بندھ گیا تو خوش ہو گئے کہ بڑا کارنامہ انجام پا گیا۔ سطح بیں عوام کی طرف سے ستائش و آفریں کی صدائیں بلند ہوئیں۔ نام ابھرا، شہرت ہو گئی اور انھیں آگے بڑھنے یا بلند تر فضا میں اڑنے کا کبھی خیال ہی نہ آیا یا یہ سمجھ لیجیے کہ ان کے فکر و نظر میں رفعت پرواز یا تعاقب حقائق کی ہمت و صلاحیت ہی موجود نہ تھی۔

حقیقی شاعر:

کبھی کبھی ایسے شاعروں کی جلوہ آرائی سے بھی عالمِ وجود منوّر ہوتا رہا، جنھوں نے کبھی یہ نہ دیکھا عوامی تحسین کا معیار کیا ہے؟ یا ماحول میں شہرت کیوں کر حاصل ہو سکتی ہے؟ ہمیشہ یہ سوچا کہ جو کچھ کہا جائے وہ پختہ، پایدار، استوار اور تہ دار ہونا چاہیے اگرچہ ماحول معاً اس پر دل پسندی کے موتی نچھاور کرنے کے لیے تیار نہ ہو، وہ نظیریؔ کے قول کے مطابق ہمیشہ اس حقیقت پر کاملاً مطمئن و فارغ البال رہے کہ:

مشتری گو رد کن و دلال گو در پا فگن
جنس گر خوب است خواہد کرد پیدا قیمتے

میرزا غالب:

میرزا غالب ایسے ہی شاعروں میں سے تھے۔ ان کے لیے ابتدائی دور میں ماحول جس درجہ ہمت شکن اور حوصلہ فرسا تھا، اس کی تفصیل میں جانا غیر ضروری ہے۔ خود میرزا کے فارسی اور اُردو کلام میں اس کی خاصی شہادتیں موجود ہیں مثلاً:

نہ ستایش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں میرے اشعار میں معنی نہ سہی
برنجم غالب از ذوقِ سخن، خوش بوے، ار بودے
مرا لختے شکیب و پارۂ انصاف یاراں را
تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی
مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست
غالب سوختہ جاں راچہ بہ گفتار آری
بہ دیارے کہ نہ دانند نظیری ز قتیل
تا ز دیوانم کہ سر مستِ سخن خواہد شدن
ایں مے از قحطِ خریداراں کہن خواہد شدن

شعر گوئی کی امتحان گاہ:

شعر گوئی کے وقت حقیقی سخن ور پر جو حالت طاری ہوتی ہے، مجھے معلوم نہیں کہ کسی شاعر نے اسے بیان کیا ہے یا نہیں۔ عرفی کے ہاں بعض اشارے ملتے ہیں مثلاً:

از برونِ لب نہ دانم چوں شود؟ لیک آگہم
کزتہ دل تالبم افسانہ در خوں می رود
بسکہ خون آلودہ خیزد دود از شمعِ دلم
در ہواے محفلم پروانہ درخوں می رود

یعنی مجھے معلوم نہیں کہ بات لب سے باہر نکلتی ہے تو کیا کیفیت پیدا کرتی ہے لیکن یہ جانتا ہوں کہ دل کی گہرائی سے اٹھ کر لب تک آتی ہے تو خون میں لت پت آتی ہے۔ میرے دل کی شمع سے جو دُھواں اٹھتا ہے وہ خون سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ میری محفل میں پروانہ شمع کی طرف جاتا ہے تو خون میں تیرتا ہُوا جاتا ہے۔

میرزا غالب نے اپنی شعر گوئی کی حالت ایک جگہ وضاحت سے بیان کر دی ہے اگرچہ اس کا صحیح اندازہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک خود اپنے اُوپر یہ حالت نہ گزر جائے۔ ایک غزل کے مقطع میں کہتے ہیں:

بینیم از گدازِ دل، در جگر آتشے چو سیل
غالب اگر دمِ سخن رہ بہ ضمیرِ من بری

یعنی اے غالب! اگر شعر گوئی کے وقت تو میرے ضمیر میں راہ پا سکے تو دیکھے گا کہ دل سراپا گداز ہے اور جگر میں آگ کا ایک سیل موجزن ہے۔

غور فرمایئے کہ ہمارے ہاں کتنے شاعر گزرے ہیں جنھوں نے باطن کی اس قیامت خیز امتحان گاہ میں بیٹھ کر شعر کہے۔

میرزا کی پیش گوئیاں:

میرزا غالب نے اپنی شاعری کے متعلق کچھ پیش گوئیاں بھی کی تھیں، جو درست ثابت ہوئیں مثلاً کہا تھا:

کوکبم را در عدم اوج قبولے بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

میرزا کی زندگی کے آخری دور میں ان کی شاعری خاصی شہرت پا چکی تھی لیکن کوئی شبہ نہیں کہ قبول عام کا جو مقام انھیں مرنے کے بعد حاصل ہوا، اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ کل کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا تاہم اب تک کہ ان کی وفات پر ایک سو سال گزر چکے ہیں، ان کی شہرت میں اضافہ ہی ہوتا رہا اور پاک و ہند کا شاید ہی کوئی شاعر ہو جس پر اتنی کتابیں اور اتنے مضامین و مقالات لکھے گئے ہوں، جتنے میرزا غالب پر لکھے گئے اور ابھی تک لکھے جا رہے ہیں۔ بعض رسائل و جرائد نے تو میرزا کی برسی پر ہر سال نمبر مرتب کرنے کا التزام کر رکھا ہے۔ اس اعتبار سے صرف اقبال کو میرزا کا ہم سر قرار دیا جا سکتا ہے۔

روشنی کے مینار:

یہ چند سطریں بے اختیار زبان قلم پر آ گئیں حالاں کہ میں میرزا غالبؔ کے چند شعروں کی کیفیت سرسری طور پر پیش کرنا چاہتا تھا تا کہ اندازہ ہو سکے، میرزا کے کلام سے جو اعتنا کیا گیا، وہ ان کے غیر معمولی تنوع کی بارگاہ میں ایک موزوں ہدیہ عقیدت تھا۔ یہ میرزا پر احسان نہ تھا بل کہ اپنے حسنِ ذوق اور بلوغِ فکر کا مظاہرہ تھا۔ ہر دایرے کے بڑے آدمی دراصل روشنی کے مینار ہوتے ہیں جن سے بعد میں آنے والوں کو سراغِ راہ اور نشانِ راہ ملتا ہے۔ وہ قدرت کی طرف سے آئینے بن کر آتے ہیں جنھیں سامنے رکھ کر اپنے اسلوبِ فکر و نظر کی خامیاں دُور کی جاتی ہیں اور آرایش و زیبایش کا کام لیا جاتا ہے۔ میرزا نے کلکتہ کے ایک مشاعرے کی غزل میں کہا تھا۔

عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختۂ
چوں من از دودۂ آتش نفساں برخیزد

تو یہ شاعرانہ ادّعا نہ تھا بل کہ ایک حقیقت کا اظہار تھا اور میرزا کا یہ دعویٰ بھی ہر اعتبار سے درست ہے کہ:

بِک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

میرزا کی ایک خصوصیت:

میرزا کے اشعار میں ایک نہایت عجیب چیز مشاہدے کے بعض معجز نما کرشمے ہیں۔ بادی النظر میں حیرت ہوتی ہے کہ جس فرد فرید کی زندگی آگرہ و دہلی کی شہری آبادی میں گزری اور وہ عمر بھر کرائے کے ایسے مکانوں میں رہا جن کے ساتھ کوئی باغ یا چمن نہ تھا اسے ایسے مشاہدات کا موقع کہاں ملا جنھیں تخیل کی تخلیق نہیں کہا جا سکتا ایسی باتیں کسی چیز کو ایک مرتبہ دیکھ لینے سے نہیں بل کہ کئی مرتبہ مسلسل و متواتر مشاہدہ کرتے رہنے سے لوحِ ذہن پر مرتسم ہوتی ہیں۔ اس کے بعد وہ شعر کے سانچے میں ڈھلنے کے قابل بنتی ہیں۔

پہلی مثال:

مثلاً میرزا کا ایک مشہور شعر ہے:

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستاں کا

ظاہر ہے کہ ”شبنمستاں“ کا وہ عالم گھر کے اندر بیٹھے بیٹھے نظر نہیں آ سکتا جو اس شعر کے مضمون کی جان ہے کیوں کہ وہی محسوس و مشہور تشبیہ ہے۔ جس سے مصرع اولیٰ کی حقیقت واضح ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان طلوعِ آفتاب سے پیش تر باہر کھیتوں میں نکل جائے۔ سردی کا موسم ہو۔ کھیت سیراب ہوں۔ فصل کو اُگے ہوئے زیادہ سے زیادہ ایک مہینہ گزرا ہو۔ جب سورج کی ابتدائی شعاعیں فصل پر پڑتی ہیں تو شبنم کا ایک ایک قطرہ اس طرح چمک اٹھتا ہے جیسے شعاعوں کے سامنے آتشیں شیشے کے ٹکڑے رکھ دیے گئے ہوں پھر درخشاں قطرے ایک دو چار نہیں بل کہ ہزاروں اسی کیفیت میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ اس وقت صحیح اندازہ ہو سکتا ہے کہ محبوب کے جلوے نے آئینہ خانے کا نقشہ کیا بنا دیا تھا۔

دُوسری مثال:

فارسی کا ایک شعر ہے:

یخ فروشم در تموز و کلبہ دور از چار سو ست
می رود سرمایہ از کف تا خریدارے رسد

یعنی گرمی کا موسم ہے جھونپڑی کے چاروں طرف دُور دُور تک کوئی مکان نہیں اور اس جھونپڑی میں فروخت کے لیے جو جنس میں نے چُنی ہے وہ برف ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک گرمی کی حدّت و تیزی برداشت کرتے ہوئے لوگ برف خریدنے کی غرض سے آئیں گے۔ اس وقت تک میرا سرمایۂ تجارت پانی بن کر بہ جائے گا اور کسی گاہک کو دینے کے لیے کچھ باقی نہیں رہے گا۔

شعر میں اصل نکتہ یہ ہے کہ برف کے خریدار معمولاً یہ جنس قریب کی دکانوں سے خریدتے ہیں تاکہ جنس کا بیش تر حصّہ محفوظ گھر پر پہنچ جائے۔ گرمی میں فاصلۂ دُور و دَراز طے کر کے الگ تھلگ جھونپڑی تک کسی کے آنے کی کیا امید ہو سکتی ہے؟ انھیں یہی خیال ہو گا کہ سفر دراز کی مشقت برداشت کرتے ہوئے جھونپڑی تک پہنچ بھی گئے تو جو برف خریدیں گے وہ راستے ہی میں ختم نہ ہو جائے گی؟

گویا میرزا نے بہ ظاہر دکان داری کے مراسم قایم رکھے ہیں لیکن حقیقتاً وہ سامع کو یہ یقین دلانا

چاہتے ہیں کہ میرے پاس جو جنس ہے، اس کے بکنے اور فروخت ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ وہ یوں ہی برباد ہو جائے گی۔

اب یہ منظر محض زورِ تخیل سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ یقین ہے کہ اس کے مختلف اجزا مختلف مشاہدات ہی کا نتیجہ ہو سکتے ہیں اور یہ مشاہدات گھر کے اندر بیٹھے بیٹھے نہیں کیے جا سکتے۔

تیسری مثال:

فارسی کا ایک اور شعر ہے:

براہِ کعبہ زادم نیست شادم کز سبک باری
بہ رفتن پائے برخارِ مغیلانم نمی آید

فرماتے ہیں: میں نے حرم پاک کا سفر اختیار کر لیا ہے لیکن زادِ راہ پاس نہیں اور یہ امر محتاجِ تصریح نہیں سمجھا جا سکتا کہ کوئی بھی سفر زاد کے بغیر طے نہیں کیا جا سکتا۔ اس بے مائگی سے میرزا نے دل کی تسلّی کے لیے ایک نکتہ پیدا کر لیا اور مشوش ہونے کی بجائے خوش ہو گئے۔ نکتہ یہ ہے کہ اگر زاد کا سروسامان پاس ہوتا تو اسے اٹھانا پڑتا اور یقیناً وہ بہت بھاری بوجھ ہوتا۔ جب انسان بھاری بوجھ سر پر اٹھاتا ہے تو چلتے وقت وہ سنبھل سنبھل کر پاؤں نہیں رکھ سکتا۔ بوجھ جتنا زیادہ وزنی ہوگا، انسان کا چلنا اتنا ہی اضطراری ہو جائے گا۔ راستے میں کانٹے بھی ہوتے ہیں اور سنگ وخشت بھی۔ حالتِ اضطرار میں وہ اِن آزار رَساں چیزوں سے بچتا ہوا نہیں چل سکے گا۔ اس کے برعکس اگر سر پر بوجھ نہ ہو تو وہ ہر قدم دیکھ دیکھ کر رکھے گا اور کانٹوں سے محفوظ رہتا ہوا منزل طے کرتا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ مضمون بھی گہرے مشاہدے کا نتیجہ ہے جس میں میرزا نے بہ غور دیکھا ہوگا کہ جب لوگ بھاری بوجھ سر پر اٹھاتے ہیں تو ان کی کیفیت کیا ہوتی ہے اور اگر سر و دوش وزن سے آزاد ہوں تو چلنا کس درجہ سہل ہوتا ہے اور پاؤں کو ہر گزند سے کیوں کر محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔

مجاز و حقیقت:

آپ نے مجاز و حقیقت اور صورت و معنی کے بہت سے شعر سنے ہوں گے۔ میرزا کا یہ شعر بھی ملاحظہ فرمائیے:

زاہد از ما خوشۂ تاکی بچشمِ کم مبیں
ہی نمی دانی کہ یک پیمانہ نقصاں کردہ ایم

یعنی اے زاہد! ہم نے آپ کو انگور کا ایک خوشہ بہ طور تحفہ بھیجا تو اسے معمولی اور حقیر شے نہ سمجھیے۔ بلاشبہہ بہ ظاہر یہ انگور کا ایک خوشہ ہے جس کی قیمت زیادہ نہیں لیکن اس کی حقیقت و معنویت پر نظر رکھی جائے تو شراب کا ایک پیمانہ ہے جسے ہم نے آپ کی نذر کر دیا اور خود نقصان اٹھایا۔ نقصان اس لیے کہ اس معنویت سے آپ لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ وہ صرف ہم رندوں ہی کے ذوق اور سیرابی کام و دہن کا سرمایہ ہے۔

بندش مضمون کا کمال:

میرزا کا ایک کمال یہ ہے کہ وہ ہر مضمون کو صحیح اور ہر اعتبار سے موزوں محل و موقع کے لیے استعمال کرتے ہیں، ہر شاعر اس پر قادر نہیں۔ کئی ایسے مضمون ہیں جو دوسروں کو سوجھے لیکن وہ انھیں فطری اور طبعی انداز میں باندھ نہ سکے۔ میرے سامنے اس کی متعدد مثالیں ہیں لیکن یہاں میں صرف ایک مثال پیش کروں گا۔

زرگر اصفہانی کا ایک شعر ہے:

چو کرد لب بہ مے آلودہ ترک بادہ پرستم
بہ ریخت خون جہانے بہ ایں بہانہ کہ مستم

یعنی جب میرے بادہ پرست محبوب نے اپنے لب شراب سے آلودہ کر لیے تو اس بہانے ایک جہاں کا خوں بہا دیا کہ میں مست ہوں اور عالمِ مستی میں کسی سے عقل و ہوش کی امید ہی نہیں رکھی جا سکتی۔ مجھے شعر کے بارے میں اس کے سوا کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ مست و مدہوش ہو کر کسی کا قتلِ عام پر آمادہ ہو جانا بل کہ قتلِ عام کر دینا کوئی طبعی واقعہ نہیں۔

میرزا فرماتے ہیں:

ہم سے کھل جاؤ بہ وقت مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن

ہم تو مے پرست ہیں ہی، آؤ تم بھی بے تکلف ہو کر ہمارے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ خوب پیو اور پلاؤ

اگر یہ نہ کیا تو دیکھو ابھی بتائے دیتے ہیں کہ ہم کسی روز آپ کو چھیڑیں گے اور ہمارا عذر یہ ہوگا کہ پی کر مست ہو گئے تھے اور کچھ خیال نہ رہا، کیا حرکت کر رہے ہیں۔ یہ اس مضمون کی طبعی صورت تھی اور مدہوشی کے عالم میں محبوب کی مجلس کے آداب سے بے پروا ہو جانا تو سمجھ میں آ جاتا ہے۔ ایک جہان کا خون بہا دینا کیوں کر ذہن میں سما سکتا ہے؟

میرزا کے فطری جوہر:

آخر میں اتنا اور عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ میرزا غالبؔ کا یہ دعویٰ بھی حقیقت پر مبنی تھا:

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ
شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

ان میں خدا جانے کیا کیا جوہر تھے جن کی صرف ایک ہلکی سی جھلک ''اردوے معلّٰی'' اور ''عود ہندی'' میں ملتی ہے۔ کاش اہل ذوق ان پر بہ قدر ضرورت متوجہ ہو سکیں۔

(ماہ نو-کراچی-فروری ۱۹۶۷ء)

غالب: دوشعر دوستارے

درتہ ہر حرف غالبؔ چیدہ ام میخانۂ
تاز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن

کسی شاعر کے کلام پر نقد وتبصرہ کے سلسلے میں ایک دستور یہ بھی ہے کہ اس کے بعض اشعار کا موازنہ اساتذۂ شہیر کے بعض اشعار سے کیا جائے لیکن ظاہر ہے کہ اسے فضیلت و برتری کی مستند دستاویز نہیں سمجھا جاسکتا۔ بعض اشعار میں ایک استاد کا دوسرے پر سبقت لے جانا بالکل ممکن بل کہ اغلب ہے مگر من حیث الکل ترجیح کا فیصلہ یوں نہیں ہوسکتا۔ میں تو اس کا بھی قائل ہوں کہ ایک نوآموز اتفاقاً ایسا شعر کہہ سکتا ہے جس کی مثال اکابر کے کلام میں بھی شاید ہی مل سکے۔

''آبِ حیات'' میں ایک واقعہ مرقوم ہے کہ ایک دن میرزا رفیع سوداؔ مشاعرے میں بیٹھے تھے لوگ باری باری اپنی غزلیں پڑھ رہے تھے۔ ایک صاحب زادے نے جس کی عمر بارہ تیرہ برس کی تھی غزل پڑھی۔ مطلع یہ تھا:

دل کے پھپھولے جل اُٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

گرمئی کلام سے سوداؔ بھی چونک پڑے۔ پوچھا! ''کس نے مطلع پڑھا''؟ لوگوں نے صاحب زادے کی طرف اشارہ کیا۔ سوداؔ نے بہت تعریف کی۔ کئی مرتبہ مطلع پڑھوایا اور کہا: ''میاں لڑکے! جوان تو ہوتے نظر نہیں آتے''۔ خدا کی قدرت کہ انھی دنوں میں لڑکا جل کر مر گیا۔

یہاں سوال سوداؔ کی پیش گوئی یا اس کے ثبات ومحکمیت کا نہیں، سوال صرف یہ ہے کہ بارہ تیرہ برس کے لڑکے نے ایسا مطلع کہہ دیا جو مشاق اور مسلّمہ استاد کے لیے بھی باعثِ فخر تھا۔ سوداؔ بھی ایسے مطلع کو اپنی شان سے فروتر نہ سمجھتے۔

غرض اس قسم کا موازنہ کسی ایک کی فضیلتِ کلّی کا معیار نہیں بن سکتا لیکن یہ طریقہ محاسن و دقائقِ شعر کی توضیح کے لیے بہت موزوں ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ اگر ایک نقاد ایسے موازنے میں ایک استاد کو دوسرے پر ترجیح دیتا ہے تو اسے بہ ہر حال مسلّم مانا جائے۔ ممکن ہے کسی دوسرے صاحبِ ذوق کو دوسرے استاد ہی کا کلام بہتر نظر آئے اور وہ اسی کی خوبیوں کے مختلف پہلو پیش کر دے مگر اس طرح محاسنِ اشعار کے نکات بہ خوبی بروے کار آ جاتے ہیں اور یہ امر بجاے خود مفید و نفع بخش ہے۔

زندگی میں انسان کو گوناگوں تجربے ہوتے ہیں۔ اربابِ غور و فکر انھیں تجربات سے بنیادی اصول و حقائق وضع کر لیتے ہیں لیکن یہ چیز دقیقہ سنجی اور دُور اندیشی کی محتاج ہے اور دقیقہ سنج نظر سے ہر انسان بہرہ مند نہیں ہوتا۔

تقریباً ہر فرد اس حقیقت سے آگاہ ہوگا کہ انسان نے سر پر بھاری بوجھ اٹھا رکھا ہو تو اس کے چلنے میں اختیار کی جگہ اضطرار رونما ہو جاتا ہے۔ وہ بوجھ سے دبا ہوا پاؤں اٹھاتا ہے تو سنبھل کر نہیں رکھ سکتا اور گراں باری اسے راستے کے نشیب و فراز یا کسی دوسری آزار رساں چیز کی دیکھ بھال کی مہلت بھی نہیں دیتی چناں چہ ایسے آدمی کے لیے ٹھوکروں سے بچے رہنا یا سنگ ریزوں اور کانٹوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے لیکن جس شخص کے سر پر کوئی بوجھ نہ ہوگا وہ اس قسم کے ہر خطرے سے مامون رہے گا۔ کیچڑ سے دامن بچائے گا۔ سنگ ریزے اور کانٹے راستے میں دیکھے گا تو اُٹھا کر ایک طرف پھینک دے گا تاکہ بے خبری میں کسی دوسرے کے پاؤں زخمی نہ ہوں۔

یہ عام تجربہ ہے مگر اس سے صرف میرزا غالبؔ ہی کا دل و دماغ ایک اعلیٰ درجے کا اصول پیدا کر سکا۔ وہ کہتا ہے:

براہِ کعبہ زادم نیست، شادم کز سبک باری
بہ رفتن پاے برخارِ مغیلانم نمی آید

”میں نے کعبے کا قصد کر رکھا ہے، سفر میں جو ضروری چیزیں درکار ہوتی ہیں، وہ پاس نہیں، تاہم خوش ہوں کہ اگر وہ چیزیں پاس ہوتیں تو سر پر بھاری بوجھ اٹھانا پڑتا اور راستے کی آزار رساں چیزوں سے بچتے ہوئے سفر طے نہ کیا جا سکتا۔ اب بوجھ سے آزاد ہوں اور ببول کے کانٹوں سے بچتا ہوا آگے بڑھ رہا ہوں“۔

یوں یہ اصول سامنے آ گیا کہ دنیا کی کوئی بھی حالت نہ علی الاطلاق اطمینان بخش ہے اور نہ علی الاطلاق غیر اطمینان بخش۔ ایک پہلو اطمینان کا ہے تو ساتھ بے اطمینانی بھی موجود ہے۔ جس کے پاس زادِ راہ ہو، اس کے لیے جراحتِ پا کے خطرے موجود ہیں۔ بے زاد آدمی کو ایسا کوئی اندیشہ نہیں ہو سکتا البتہ بے زاد ہونا بجائے خود جس تشویش کا باعث ہے، اس سے وہ بچ نہیں سکتا۔

اساتذہ ایک دوسرے کے کلام سے استفادہ بھی کرتے رہتے ہیں جسے حق ناشناس لوگ سرقہ قرار دے لیتے ہیں۔ بعض اوقات یہ استفادہ علم و شعور پر مبنی ہوتا ہے مثلاً کسی استاد کا کوئی شعر دیکھا تو خیال ہوا کہ مضمون اچھا ہے مگر ایسے انداز میں نہیں بندھ سکا، جس سے اس کی تمام خوبیاں پوری نمایاں ہو جائیں چناں چہ بعض نکات کا اضافہ کر کے اسے دوبارہ باندھا اور اس کی شان بہ درجہا بلند تر کر دی۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ شاعر کو کوئی پرانا مضمون باندھتے وقت یاد ہی نہ رہے کہ یہ پہلے بندھ چکا ہے۔ تمام متاخرین متقدین کے کلام کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں اور مختلف مضامین ان کے ذہن میں محفوظ ہوتے جاتے ہیں پھر ہر شاعر اپنے مشاہدے، احساس اور تخیل سے نئے نئے مضامین پیدا کرتا ہے بعض اوقات اس کے حافظے سے کوئی پرانا مضمون نکل کر اچانک سامنے آ جاتا ہے اگر ایسا کوئی مضمون متقدم کے کلام سے بہتر طریق پر بندھ جائے تو سمجھنا چاہیے کہ اصل مضمون متاخر کا ہو گیا لیکن اگر بہتر نہ بندھ سکے تو ماننا پڑے گا کہ ایک استاد کے کلام کو بگاڑ دیا۔

میرزا غالبؔ کے کلام میں بھی استفادے کی مثالیں ملتی ہیں جس طرح تمام دوسرے اساتذہ کے ہاں ایسی مثالیں موجود ہیں مگر میری نظر سے اب تک میرزا غالبؔ کا کوئی شعر نہیں گزرا جو استفادے پر مبنی ہو لیکن بہ درجہا بہتر انداز میں نہ بندھا ہو خواہ میرزا کا استفادہ علم و شعور پر مبنی سمجھا جائے یا اسے لاشعور کا نتیجہ قرار دیا جائے۔

پہلا شعر:

میرزا غالبؔ کا ایک مشہور شعر ہے:

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو

نفسِ مضمون میں اس سے ملتا جلتا ایک شعر نظیریؔ نیشاپوری کا بھی ہے:

بہ عریانی ازاں شادم کہ از تشویش آزادم
گریبانی ندارم تا کسی از دستِ من گیرد

دیکھیے! دونوں کا بنیادی مضمون ایک ہے یعنی دنیا کا ساز و سامان اور علائق انسان کے لیے تشویش و اضطراب کا سرچشمہ ہیں، ان علائق سے آزاد رہنا باعثِ اطمینان ہے لیکن دونوں کے بیان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ نظیریؔ کہتا ہے: ”میرے پاس لباس تک نہیں لہٰذا تشویش سے فارغ البال ہوں اگر کوئی چیز پاس ہوتی تو یہ اندیشہ رہتا کہ چھین لی جائے گی، اب ایسی کسی صورت کے وقوع کا امکان ہی نہیں“۔

تاہم یہ ادّعائے محض ہے۔ میرزا غالبؔ نے ادعا کافی نہ سمجھا۔ وہ کہتے ہیں: ”میرے پاس ساز و سامان تو تھا مگر دن کے وقت رہزن لوٹ کر لے گیا اور میں قلاش محض رہ گیا۔ جب تک سامان تھا خبرداری کی تشویش موجود تھی۔ رات کے وقت اطمینان کی نیند نہیں آتی تھی کیوں کہ چوری کا اندیشہ لاحق رہتا تھا، اب رات کو بے خبر سوتا ہوں اور رہزن کو دعا دیتا ہوں کہ اگر وہ دن کے وقت سب کچھ ہتھیا نہ لیتا تو میرے لیے رات کو بے خبر ہو کر سونا کیوں کر ممکن تھا۔ پھر میرزا کی دقیقہ سنجی کے کمالات دیکھیے:

۱۔ انھوں نے دو شخص پیدا کیے جو سامان لے جا سکتے تھے۔ ایک رہزن جو دن دہاڑے زور و قوت سے سب کچھ لوٹتا ہے، دُوسرا چور جو رات کو چھپ چھپا کر سامان اٹھاتا ہے۔

۲۔ یقیناً رہزن اور چور دونوں موجبِ تشویش ہیں لیکن رہزن دن کو لوٹتا ہے اس لیے نیند میں خلل انداز نہیں ہو سکتا۔ چور رات کو چوری کرتا ہے اور اس کے متعلق اندیشہ رات کی نیند حرام کر دیتا ہے۔

۳۔ انسان رات ہی کو سوتا ہے اور اسے اطمینان و فارغ البالی کی سب سے بڑھ کر ضرورت رات ہی کو پیش آتی ہے۔ رہزن نے دن کو دستِ تغلّب دراز کیا اور رات کے اطمینان کا سامان فراہم کر دیا لہٰذا میرزا کے نزدیک وہ دعا کا مستحق ٹھہرا۔

۴۔ پھر میرزا نے یہ پورا واقعہ اس انداز میں پیش کیا گویا یہ ہو چکا ہے، یہ نہیں کہ ہونے والا ہے۔ اس طرح نظیریؔ کے مقابلے میں پورے واقعہ کو ایک وقوعی اور عامتہ الورود صورت دے دی اور مضمون کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ گویا اگر استفادہ بھی کیا تو اس شان سے کہ مضمون نظیریؔ کا نہ رہا، اپنا بنا لیا۔

دوسرا شعر:

میرزا غالبؔ کا ایک شعر ہے:

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پر گہر ہونے تک

اس سے ملتا جلتا ایک شعر نظیریؔ کا بھی ہے، جس میں وہ "کام نہنگ" تک استعمال کر گیا ہے۔ کہتا ہے:

تمنائے گہر سرگشتہ ام دارد بہ دریائے
کہ در ہر گام صد جا راہ بر کامِ نہنگ افتد

یعنی گوہر کی آرزو مجھے اس سمندر میں سرگرداں لیے پھرتی ہے جہاں راستہ اس درجہ خطرناک ہے کہ قدم قدم پر سیکڑوں نہنگ منہ کھولے بیٹھے ہیں۔

یقیناً مضمون نہایت اچھوتا ہے اور اس حقیقت کا آئینہ دار کہ انسان انتہائی مشکلات سے گزرے بغیر کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دے سکتا اور کسی بلند و شایان مقصد پر نہیں پہنچ سکتا۔ گوہر کی آرزو میں سرگشتگی یعنی تردد و بے قراری انسان کو تمام مشکلات سے بے پروا کر دیتی ہے۔

میرزا غالبؔ نے اس مضمون میں اتنی جدّتیں پیدا کر لیں کہ اسے اپنا مستقل مضمون بنا لیا، مثلاً فرمایا:

۱۔ ہر موج ایک جال لیے ہوئے ہے اور مشاہدہ اس کا شاہد ہے۔

۲۔ یہ جال کیسے ہیں؟ ڈوریوں سے تیار نہیں ہوئے بل کہ سیکڑوں مگر مچھ منہ کھول کر بیٹھ گئے اس طرح ان کے تسلسل و تواتر سے ہر جال کے حلقوں نے ترکیب پائی۔

۳۔ خطرات و مہالک کا یہ نہایت دہشت ناک منظر پیشِ نظر لا کر سوچتے ہیں کہ قطرے کو اسی ماحول میں گوہر بننا ہے وہ جب تک ان تمام خطروں کو صبر و استقامت سے انگیز نہ کر لے گا، اس کے لیے درجۂ کمال پر پہنچنے کا کوئی امکان نہیں۔

۴۔ تمام خطرات بیان کر دیے مگر معین طریق پر یہ نہ بتایا کہ عملِ ارتقا میں قطرے پر کون کون سی آفتیں آئیں گی اس لیے کہ ان کا تعین ہو ہی نہیں سکتا تھا اور عدمِ تعین کی حالت میں بھی شعر پڑھنے والا خود خطرات کا اندازہ کر سکتا ہے حقیقتاً عدمِ تعین زیادہ لطف انگیز ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ شعر بھی نظیری کے شعر سے بہ درجہا بلند تر ہے اگرچہ ''کامِ نہنگ'' کی ترکیب صاف ظاہر کر رہی ہے کہ میرزا کا شعر نظیری کے شعر سے مستفاد ہے۔

پھر عرض کرتا ہوں کہ یہاں نظیری اور غالب کا موازنہ مقصود نہیں نظیری بہت بڑا شاعر ہے اور محض دو چار یا دس بیس اشعار میں میرزا غالب یا کسی دوسرے شاعر کی افضلیت ثابت بھی ہو جائے تو نظیری کے مقام و مرتبہ پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ میرے نزدیک تو اساتذہ میں تفاضل کا طریقہ ہی نامناسب ہے۔ سب نے بہ حیثیت مجموعی حقایق کے شہ سوار گوہروں سے ادبیات کے دامن بھرے اور وہ سب خوش ذوق انسانوں کے احترام و سپاس کے مستحق ہیں۔

عرفی اور اقبال

اساتذہ میں ایسی مثالیں بے شمار ملتی ہیں کہ ایک کے پیدا کیے ہوئے مضمون میں دوسرے نے نئی خوبی اور نئی شان پیدا کر دی۔

سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ طُور پر موسیٰ کو خدا سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا تو خدا نے پوچھا: ''موسیٰ تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟'' اس کا صاف جواب تھا: ''عصا یعنی لاٹھی ہے۔'' مگر حضرت موسیٰ نے اس پر قناعت نہ کی بل کہ کہا: ''یہ میرا عصا ہے چلنے میں اس کا سہارا لیتا ہوں، اسی سے اپنی بکریوں کے لیے درختوں کے پتے جھاڑ لیتا ہوں اور میرے لیے اس میں اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں''۔

ظاہر ہے، جواب اصل سوال سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ بالغ نظر عرفی نے اس سے یہ مضمون پیدا کر لیا کہ داستاں پُر لطف اور شیریں تھی اس لیے حضرت موسیٰ نے کلام کو زیادہ سے زیادہ طول دے دیا۔ یہی مثال سامنے رکھتے ہوئے کہا:

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم
چناں کہ حرفِ عصا گفت موسیٰ اندر طُور

عرفی کا شعر نہایت شگفتہ اور پُر لطف تھا۔ اقبال نے محض داستان کی لذت و شیرینی کو طولِ کلام کا موزوں عذر نہ سمجھا بل کہ ایک نیا پہلو پیدا کیا جو اتنا دلآویز ہے کہ سنتے ہی دل بے اختیار اس کی تصدیق پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

به حرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را

یعنی دنیا بھر کی تمنائیں ایک حرف میں سما سکتی ہیں مگر حضوری کی لذت میں داستاں کو طول دیتا گیا کہ جب تک عرض کرتا جاؤں گا، حضوری حاصل رہے گی۔ ظاہر ہے کہ داستاں کی لذت کے بجائے ''ذوق حضوری'' کو طول کلام کا مدار قرار دینا بہ درجہا زیادہ معقول اور دل کش ہے۔

اس سلسلے میں عرفؔی کا ایک شعر اور بھی سن لیجیے، کہتا ہے:

تمام بود بہ یک ''حرفِ گرم'' و ما غافل
حکایتے کہ ہمہ ناتمام می گفتند

یعنی جو حکایت سب سناتے رہے مگر اسے پورا نہ کر سکے۔ حقیقتِ حال کے اعتبار سے وہ ایک ''حرفِ گرم'' میں پوری کی جا سکتی تھی لیکن ہم غفلت کے باعث یہ راز پا نہ سکے ''حرفِ گرم'' صرف عرفی کہہ سکتا تھا اور عشق و عمل کا کون سا پہلو ہے جو اس حرف میں مضمر نہیں؟

(ماہ نو- کراچی- فروری ۱۹۶۳ء)

غالبؔ کے آٹھ شعر

گزشتہ سال فروری کے خاص نمبر کے لیے میں نے میرزا غالبؔ کی شاعری پر جو مضمون لکھا تھا اس کے آخر میں یہ ذکر بھی کیا تھا کہ بعض اربابِ علم و فضل نے میرزؔا کے بعض اُردو اشعار سے بہ ظاہر ملتے جلتے اشعار پیش کر دیے ہیں، جو مختلف اساتذہ نے کہے تھے اور اس طرح یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ میرزؔا نے بعض افکار و تراکیب دوسروں سے لی ہیں۔

مجھے ابتدا ہی میں کہہ دینا چاہیے کہ ان سب کے محرکات یکساں نہ تھے:

۱۔ بعض کے پیشِ نظر صرف تقابل تھا یعنی میرزؔا نے جو کچھ کہا، قریباً ویسی ہی چیزیں، دوسرے اصحاب نے بھی کہیں۔ خوانندہ کو چاہیے کہ مختلف اشعار کے اسلوبِ فکر و نظر پر غور و خوض سے دقائق شعر میں مزید بصیرت حاصل کرے۔

۲۔ بعض کی رائے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ میرزؔا نے بعض مضامینِ شعری کے مختلف اجزا کسی اور جگہ سے لیے پھر انھیں فکر کے سانچے میں ڈھال کر اس رنگ میں پیش کر دیا جسے بہ ظاہر ماخذ سے زیادہ مناسبت نہ رہی۔

۳۔ بعض حقیقت ناشناس لوگ صرف یہ چاہتے تھے کہ میرزؔا پر الزام سرقہ کے لیے تقویت کا سامان بہم پہنچائیں

میرا مقصد:

میں بہ وجوہ اس موضوع پر بحث میں متامل تھا اور جس مضمون کا حوالہ دے چکا ہوں، اس کے آخر میں صرف ایک شعر بہ طور مثال لکھ کر اس معاملے سے قطع نظر کر لیا تھا۔ بعد میں بارہا خیال آیا کہ ممکن ہے یہ پہلو بعض احباب کے لیے بھی باعثِ خلجان بن گیا ہو، اس لیے کچھ نہ کچھ ضرور لکھ دینا چاہیے تا کہ حقیقتِ حال کا اندازہ کرنے میں سہولت رہے۔

میرزا غالبؔ انسان تھے۔ غلطی اور خطا سے پاک نہ تھے اگر ان کے کلام میں کچھ خامیاں ہیں تو

محاسن کی ستایش کے ساتھ خامیوں کی نشان دہی بھی عین مقتضائے انصاف ہے لیکن اگر خامیوں کی حیثیت محض نمایشی ہے اور حقیقی نہیں تو اس عظیم القدر شاعر کو کیوں موردِ طعن بننے دیا جائے جو کلاسیکی شاعری کا آخری بڑا آدمی اور نئے اسلوبِ فکر ونظر کا بانی ہے؟ اس لیے میں نے بیان کردہ اشعار میں سے چند سرسری طور پر چُن لیے ہیں تاکہ غور کر لیا جائے، ان کی حقیقت کیا ہے اور میرزا کے مختلف اشعار کو ان سے کتنی مناسبت ہے۔ اس بحث سے ایک فائدہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود ہمیں میرزا کے بعض اشعار پر زیادہ گہری نظر ڈالنے کا موقع مل جائے گا جس کی نوبت عام حالات میں شاید نہ آتی اور ہم ان پر زیادہ توجہ نہ کرتے۔

پہلا شعر

اب میں میرزا غالبؔ کا ایک ایک شعر سامنے رکھ کر اس کا مقابلہ مختلف اساتذہ کے ان اشعار سے کروں گا جن سے میرزا کے اشعار مستفاد قرار دیے گئے ہیں۔

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

کہا گیا ہے کہ یہ شعر نعمت خان عالیؔ کے مندرجہ ذیل شعر سے ماخوذ ہے:

خواستم آتشِ دل را بنشانم بہ سرشک
ایں قدر ہم جگر سوختہ ام آب نداشت

سرسری نظر ہی سے واضح ہو جاتا ہے کہ دونوں شعروں میں نفسِ مضمون، اسلوبِ بیان، تراکیب بل کہ الفاظ کے اعتبار سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ میرزا کہتے ہیں کہ میں ''اندوہِ وفا'' سے نجات حاصل کرنے کا خواہاں تھا جس کا وسیلہ موت کے سوا کچھ نہ تھا لیکن ستمگر محبوب میرے مر جانے پر بھی راضی نہ ہوا۔

عالیؔ کہتا ہے، میں نے دل کی آگ آنسوؤں سے بجھانی چاہی تھی لیکن دیکھا تو جگر بری طرح جل چکا تھا اور اس میں اتنا پانی ہی نہ تھا جو بہ قدرِ ضرورت آنسو مہیا کر سکتا۔

ظاہر ہے کہ ان دونوں کے عام انداز میں بھی کوئی یکسانی نہیں تاہم میرزا کے شعر پر ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حقیقتاً اس میں متعدد پہلو موجود ہیں مثلاً:

۱۔ عہدِ وفا پر قایم و استوار رہنا بے حد مشکل اور صبر آزما ہے۔ بڑے بڑے جاں بازوں کے پائے ثبات میں بھی تزلزل پیدا ہو جاتا ہے۔

۲۔ پھر یہ ایک مستقل غم، لامتناہی رنج اور ناقابلِ برداشت اندوہ ہے اور انسان انتہائی استقامت و پایہ داری کے باوصف گھبرا جاتا ہے۔

۳۔ مردانِ کار کے لیے وفا سے دست بردار ہونے کا سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ وہ جیتے جی اس امتحان گاہ سے باہر نہیں نکل سکتے۔ اس اندوہ سے نجات پانے کا ان کے لیے صرف ایک راستہ ہے اور وہ یہ کہ زندگی سے دست بردار ہو جائیں۔

۴۔ میرزا اسی نتیجے پر پہنچے اور مرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

۵۔ یہ فیصلہ یک طرفہ تھا اور وفا کا تقاضا یہ تھا کہ خود محبوب کی رضا بھی کسی نہ کسی ذریعے سے معلوم کر لی جاتی۔ اس کے بغیر اصل فیصلے کو لباس عمل پہنانا ممکن نہ تھا۔

۶۔ محبوب پر میرزا کا یہ عزم واضح ہوا تو اس نے رضامندی کا اظہار نہ کیا اور میرزا کو اپنے عزم سے دست بردار ہونا پڑا۔

۷۔ عاشق کو اندوہِ وفا کا پابند رکھنا محبوب کی ستم گری کا ایک کرشمہ تھا لہٰذا اسے صرف ''ستم گر'' کہہ کر یہ پوری حقیقت واضح کر دی۔

سوچیے کہ بہ ظاہر ایک سادہ سے شعر میں معنویت کے کتنے پہلو موجود ہیں پھر چُنے ہوئے الفاظ نے شعر میں بلا کی جو تاثیر پیدا کر دی ہے، وہ بیان کی محتاج نہیں اور بیان سے اس کا حق بھی ادا نہیں ہو سکتا۔ یہ پورا واقعہ ماضی کے ایک سانحے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اُس خیال نے جس قلب میں ارتقا کی منزلیں طے کر کے شعر کا قالب اختیار کیا، غور فرمائیے یہ کہتے وقت اُس کی کیفیت کیا ہو گی؟

دوسرا شعر

میرزا کا ایک شعر ہے:

بہ قدرِ ذوق ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تُو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

کہا جاتا ہے کہ یہ شعر ناصر علی سرہندی کے مندرجہ ذیل شعر سے ماخوذ ہے:

چو تو ساقی شوی دردِ تنگ ظرفی نمی ماند
بہ قدرِ بحر باشد وسعت آغوش ساحل ہا

دونوں شعروں میں ساحل اور دریا یا ساحل اور بحر کے الفاظ تو موجود ہیں لیکن مضمون دونوں کے مختلف ہیں۔ میرزا کہتے ہیں کہ شراب نہ ملنے کے باعث جو خمار انسان پر طاری ہوتا ہے وہ عرق نوش کے ذوق ومشرب کے مطابق ہوتا ہے۔ کسی کے خمارِ تشنہ کامی کا اندازہ کرنے کے لیے پیمانہ درکار ہو تو وہ ذوق یا مے کشی کی ہمت، حوصلے، ظرف اور قوت کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ جو رند جتنی شراب پی سکتا ہے، اسی کے مطابق اس کی تشنہ کامی کا خمار ہوگا۔ اے ساقی! جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے کہہ سکتا ہوں کہ اگر تو شراب کا دریا یا سمندر ہے تو سمجھ لے کہ اس دریا یا سمندر کا ساحل میں ہوں۔ برابر ساتھ ساتھ چلا جا رہا ہوں۔ تیرا کوئی مد، کوئی جوار، کوئی جست وخیز، کوئی جوش میری حد بندی سے باہر نہیں جا سکتا۔

اس کے برعکس ناصر علی کہتا ہے کہ اے محبوبِ حقیقی! جب تیرا لطف وکرم شرابِ محبت پلانے پر آ جائے تو ظرف کی تنگی اور فرومایگی کی کوئی شکایت باقی ہی نہیں رہ سکتی کیوں کہ تیرا لطف وکرم محض تشنگی ہی فرو نہیں کرتا، تنگ ظرفی کا مداوا بھی کر دیتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ سمندر کی وسعت و پہنائی کے مطابق اس کے ساحل کی آغوش کشادہ ہوتی ہے۔ بحیرہ قلزم اور خلیج فارس کے کنارے اتنے قریب ہیں کہ ایک طرف کھڑے ہو جائیں تو دوسری سمت نظر آتی ہے لیکن اوقیانوس اور بحرالکاہل کی وسعت کا اندازہ ہفتوں کی دریا نوردی کے بعد بھی نہیں ہو سکتا۔

غور فرمائیے کہ دونوں کا مضمون ایک کیوں کر ہو گیا؟ محض بحر وساحل کے لفظ یا تمثیل اختیار کر لینا ایسے دعوے کی بنیاد کیوں کر بن سکتا ہے؟ بیسیوں تمثیلیں ہیں جن سے مختلف شعرا نے کام لیا، تاہم ان کے مضامین وافکار بالکل جداگانہ تھے۔

تیسرا شعر

میرزا کا شعر ہے:

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

فرمایا گیا ہے کہ اس کا ماخذ عرفیؔ کا مندرجہ ذیل شعر ہے:

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ
ایں ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

ظاہر ہے کہ ان شعروں کا مطلب بھی قطعاً ایک نہیں۔ میرزؔا مخاطب سے کہتے ہیں کہ تیرے کان نواہائے راز کے محرم ہی نہیں ورنہ جن چیزوں کو تُو پردے سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ انھوں نے حقیقتیں چھپا کر رکھی ہیں وہ پردے بھی دراصل ساز کے پردے ہیں جو نغموں کا خزانہ ہیں گویا یہ پردے خود بج کر اور بول بول کر راز آشکارا کر رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ جن چیزوں کو مانع کشفِ راز سمجھا جاتا ہے، وہی دراصل کاشفِ راز ہیں۔

معرفت کے نقطۂ نگاہ سے کہہ سکتے ہیں کہ کائنات میں جتنی چیزیں موجود ہیں، وہ وجودِ باری تعالیٰ کے لیے پردہ ہیں لیکن یہی پردے اس وجود کے اثبات کا ناطق ثبوت ہیں۔

عرفیؔ کہتا ہے کہ جو باتیں عوام کو معلوم ہیں یہی درحقیقت اسرار ہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ ہر فرد اسرار کا شناسا نہیں۔ اس کی مثال یہ ہوسکتی ہے کہ عام لوگ مختلف درختوں کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ فلاں درخت آم کا ہے۔ فلاں جامن کا، فلاں شفتالو کا اور فلاں بادام کا لیکن نباتیات کے ماہر اِن درختوں کو جس نظر سے دیکھتے ہیں، وہ بالکل دوسری ہے۔ یہی کیفیت عام اشیا کی ہے۔ راز شناس عوام ہی کی جانی پہچانی چیزوں سے نہایت دقیق حقایق پیدا کر لیتے ہیں۔

غرض دونوں شعروں کے مضمون بالکل الگ ہیں اور ان کی حیثیت ایک نہیں۔

چوتھا شعر

میرزؔا کا شعر ہے:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

کہا گیا ہے کہ یہ شعر عالمگیر کے مندرجہ ذیل شعر سے ماخوذ ہے؟ حالاں کہ شعر عالمگیر کا نہیں وارستہؔ ایرانی کا ہے البتہ عالمگیر نے اس میں خفیف سا تصرف کر کے رُقعات میں نقل کیا ہے:

آں چہ پُرجستیم و کم دیدیم و درکار است و نیست
نیست جز انساں دریں عالم کہ بسیار است و نیست

ان دونوں شعروں کا مضمون بھی ایک نہیں جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں۔ دوسرا شعر عالمگیر کا نہیں کسی پرانے شاعر کا ہے اور میری معلومات کے مطابق ''رُقعاتِ عالمگیری'' میں دو جگہ نقل ہوا ہے۔ شعر کا مفہوم یہ ہے: جس شے کو زیادہ سے زیادہ ڈھونڈا اور بہت کم پایا وہ انسان ہے۔ دنیا میں اس نوع کی کمی نہیں بل کہ بہت کثرت ہے لیکن حقیقتاً انسان بہت کم نظر آتے ہیں۔

شعر اس اعتبار سے بھی کچھ اچھا نہیں کہ پہلا مصرع تکلفات کا مرجع ہے اور دونوں مصرعوں میں سے ایک کی ردیف سراسر حشو و بے کار ہے، اسے خواہ مخواہ مطلع بنانے کی کوشش کی گئی۔ یہ مضمون کوئی اچھا شاعر بیان کرتا تو اس کی صورت بالکل مختلف ہوتی۔

میرزاؔ کے شعر کا مضمون ہی یہ نہیں۔ ان کے فکر کی بنیاد و اساس تو یہ ہے کہ ہر کام کا آساں ہونا دشوار ہے۔ بعض کام بہ ظاہر بہت سہل نظر آتے ہیں مگر حقیقتاً بے حد مشکل ہیں۔ مثال میں یہ کہتے ہیں کہ دیکھیے، آدمی کے لیے انسان بننا کس قدر مشکل ہے! عالم انسانیت کی کوئی جد و جہد ایسی نہیں جس میں آدمی کے لیے انسان بننے کے وسیلے اور طریقے مہیا نہ کیے گئے ہوں اور ان سے کام نہ لیا گیا ہو لیکن کتنے تھوڑے آدمی اس جد و جہد میں بہ قدرِ اطمینان و آرزو کامیاب ہو سکے۔

فارسی کے شعر میں یہ کہا گیا کہ انسان ہیں تو بہت لیکن حقیقی انسان اتنے کم ہیں، گویا نہیں۔ میرزا نے شعر کی بنیاد اس حقیقت پر رکھی کہ جو کام بہ ظاہر نہایت آسان معلوم ہوتے ہیں وہ بھی حد درجہ دشوار ہوتے ہیں اور مثال کے لیے دو چیزیں تلاش کیں۔ اوّل آدمی یعنی حضرت آدمؑ کی اولاد، جس کی کثرت و فراوانی سب پر آشکارا ہے، دوم انسان، جو ہر آدمی کا نصب العین ہے۔ انبیاے کرام، آسمانی کتابوں، حکما کی حکمت طرازیوں، داعیانِ اخلاق کے وعظوں اور تہذیب کے مدعیوں سب نے جو کچھ پیش کیا اس کا مدعا صرف یہ تھا کہ آدمی انسان بن جائے۔ بہ ظاہر آدمی کا انسان بن جانا ہرگز مشکل نہیں کیوں کہ اس کی شکل و صورت انسان ہی کی ہے مگر معنوی اعتبار سے انسانیت کے جوہر اپنے اندر پیدا کر لینا بہت کٹھن اور دُشوار ہے۔

خواجہ حالیؔ نے لکھا ہے کہ وہ منطقی استدلال نہیں، شاعرانہ استدلال ہے اور شاعر اس سے بہتر استدلال پیش ہی نہیں کر سکتا۔

یہ بالکل درست ہے لیکن اگر استدلال کا مقصد یہ ہے کہ اصل مطلب ٹھیک ٹھیک انسان کے دل میں اتر جائے تو کوئی منطقی اور فلسفیانہ استدلال اس سے زیادہ دل آویزی کیوں کر پیدا کر سکتا ہے جو میرزاؔ کے شاعرانہ استدلال میں موجود ہے، پھر سادگی ملاحظہ ہو کہ معمولی فہم و بصیرت کا آدمی بھی، اس سے یکساں مستفید ہو سکتا ہے:

”آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا“

پانچواں شعر

میرزاؔ کا شعر ہے:

بساطِ عجز میں تھا ایک دل، یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

کہا جاتا ہے کہ اس شعر کی بنیاد مندرجۂ ذیل شعر ہے:

دریاب کہ ماندہ است ز دل قطرۂ خونے
آں قطرہ زہم دست تو لبریز چکیدن

یہ فارسی شاعر کا بتایا گیا ہے لیکن حقیقۃً نعمت خان عالیؔ کا ہے اور اس غزل کا پانچواں شعر ہے جس کا مطلع یہ ہے:

از دست اگر رفتہ مرا پای دویدن
تا گوئی تو خود را برسانم بہ تپیدن

میرزاؔ اور عالیؔ دونوں کے شعر الگ الگ مضمون کے حامل ہیں البتہ دونوں میں ”دل“ ”قطرۂ خوں“ اور ”چکیدن“ مشترک ہیں۔ عالیؔ کہتا ہے کہ اے محبوب! دیکھ دل کا سارا خون بہ گیا، صرف ایک قطرہ باقی ہے اور وہ قطرہ بھی تیرے ہاتھوں اس نوبت کو پہنچ گیا ہے کہ اس کا پیمانہ ”ٹپک پڑنے سے لبالب بھر گیا ہے“ گویا ٹپکنے ہی والا ہے۔

میرزاؔ کہتے ہیں کہ میں بے سروسامان اور بے نوا تھا۔ میرے پاس صرف ایک دل تھا اور وہ بھی خون کا صرف ایک قطرہ تھا۔ وہ قطرۂ خون بھی ٹپک پڑنے کے انداز میں سرنگوں ہے بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ عالیؔ کے بعض الفاظ لے کر میرزاؔ نے ایک نیا مضمون پیدا کیا لیکن اس کی عام وضع و ہیئت عالیؔ کے شعر سے

بہ درجہا بہتر ہے۔ اول اس میں محبوب کے ظلم و ستم کا کوئی ذکر نہیں یعنی یہ نہیں کہا کہ محبوب کے ہاتھوں دل میں ایک قطرۂ خوں باقی رہ گیا اور وہ بھی ٹپک جانے والا۔ یہ کہا کہ میری کل کائنات ہی دل تھی اور دل ایک قطرۂ خوں تھا وہ بھی اپنی جگہ قایم و اُستوار نہ رہا، اس طرح سرنگوں ہے گویا ابھی ٹپک پڑے گا۔

میرزاؔ کے شعر کی ایک خوبی یہ ہے کہ ”بہ انداز چکیدن“ کہہ کر دل کی حقیقت زیادہ مشہور و روشن شکل میں پیش کر دی کوئی باکمال مصور چاہے تو اس کی تصویر بنا سکتا ہے لیکن ”لبریز چکیدن“ کو تصویر کے لباس میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔

چھٹا شعر

میرزاؔ کا شعر ہے:

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

اسے فارسی کے مندرجہ ذیل شعر سے ماخوذ قرار دیا گیا ہے:

آب و رنگِ گلستانِ عشق اکنوں از من است
عندلیباں ہرچہ می گویند، مضموں از من است

یہ بھی نعمت خان عالیؔ ہی کا ہے۔ ان دونوں شعروں میں بھی اس کے سوا کوئی یکسانی نہیں کہ ”عندلیب“ اور ”گلستاں“ کے لفظ دونوں میں موجود ہیں۔ عالیؔ فخریہ انداز میں کہتا ہے کہ اب عشق کے باغ میں رونق و ہنگامہ میرے دم سے ہے۔ بلبلیں جو کچھ کہتی ہیں وہی کہتی ہیں جو میں پیش کرتا ہوں۔

اس کے مقابلے میں میرزاؔ نے بالکل دوسری بات کہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میری آہ و فغاں میں وہی رنگ پیدا ہو گیا ہے جو ابتدا سے بلبلوں کی نالہ کشی کا سرمایہ تھا۔ اب صورت یہ ہے کہ میں باغ میں پہنچ کر صدائے درد بلند کرتا ہوں تو بلبلیں سمجھتی ہیں کہ کسی نئے ہم صفیر نے فریاد شروع کر دی چناں چہ وہ بھی پُر سوز ترانے گانے لگتی ہیں۔ شعر کی بے مثال خوبی یہ ہے کہ چمن کو دبستاں سے تشبیہ دے دی گئی۔ استاد مکتب میں پہنچ کر چند لفظ بولتا ہے تو ایک دم بچے انھیں کو دہرانے لگتے ہیں اور پورا مکتب گونج اٹھتا ہے۔ بالکل یہی کیفیت اس وقت رونما ہوتی ہے جب میرزاؔ چمن میں پہنچ کر نالہ زنی کرتے ہیں۔ میرزاؔ کے شعر میں محض اتنی بات نہیں کہ بلبلیں پورا مضمون ان سے لے لیتی ہیں، اصل

چیز یہ ہے کہ میرزا کے جاتے ہی چمن بچوں کے مکتب کی صورت اختیار کر لیتا ہے اگر بہ درجۂ تنزل مان لیا جائے کہ اصل مضمون کسی نہ کسی شکل میں عالیؔ نے پیش کر دیا تھا تو اس میں غالباً کسی کو کلام کی گنجایش نہ ہوگی کہ میرزا نے اس مضمون کو معجز نما طریق پر پُر تاثیر بنا دیا اور بالکل نیا رنگ دے دیا۔

ساتواں شعر

میرزا کا شعر ہے:

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہے، کھائیں گے کیا

فرمایا گیا ہے کہ یہ شعر شیخ سعدیؔ کے شعر ذیل پر مبنی ہے:

سعدیا! حب وطن گرچہ حدیثی ست صحیح
نتواں مُرد بہ شیراز کہ ایں جا زادم

ان شعروں کا مضمون بھی ایک نہیں۔ شیخ سعدی کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ وطن سے محبت کی حدیث صحیح ہے لیکن میں صرف اس بنا پر شیراز میں مر نہیں سکتا کہ یہاں پیدا ہوا تھا یعنی یہ کہ وطن سے محبت طبعاً ہر فرد کو ہوتی ہے مگر ایسے اسباب پیدا ہو گئے ہیں کہ میں محض جائے پیدایش ہونے کی بنا پر شیراز میں ہر مصیبت کاٹنے پر راضی نہیں ہو سکتا۔ ضمناً یہ بھی عرض کر دوں کہ ”حب الوطن من الایمان“ جو حدیث بیان کی جاتی ہے، وہ حدیث نہیں اگرچہ اصل بات بالکل درست ہے یعنی ہر شخص کو وطن سے یقیناً محبت ہونی چاہیے اور ہوتی ہے۔

میرزا نے ایک نہایت بلیغ بات کہی ہے، وہ وطن کو زمین کا ایک خاص ٹکڑا نہیں سمجھتے بل کہ اس کی معنوی حیثیت پر زور دیتے ہیں، یعنی وطن زمین کے اس ٹکڑے کو کہنا زیبا ہے۔ جس میں بسنے والے ایک دوسرے سے محبت رکھیں۔ ان کے درمیان خلوص و یک رنگی ہو۔ ہر طرف الفت و ہمدردی نظر آئے۔ جب زمین کے کسی ٹکڑے میں بسنے والوں کے اندر یہ اوصاف و خصایص باقی نہ رہیں تو اس ٹکڑے اور ایسے ہی دوسرے ٹکڑوں میں وجۂ امتیاز کیا رہ جائے گی؟ اسی لیے میرزا کہتے ہیں کہ اب دلّی میں تو غمِ الفت و محبت کا قحط پڑ گیا اور وہی چیز ہماری غذا ہے یہاں رہنا منظور کر لیں تو سوال یہ ہے کہ کھائیں گے کیا؟

وطن کی جو معنویت میرزا نے پیش کر دی ہے، اس سے غالباً کسی کو بھی اختلاف نہ ہوگا اور حبِ وطن کی بنیاد اسی پر ہے نہ کہ زمین کے کسی خاص ٹکڑے پر جسے ایک خاص نام دے دیا گیا ہو۔

آٹھواں شعر:

میرزا کا شعر ہے:

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان، جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

کہا جاتا ہے کہ یہ میکلی کے مندرجہ ذیل شعر پر مبنی ہے:

بیم از وفا مدار و بدہ وعدہ کہ من
از ذوقِ وعدۂ تو بہ فردا نمی رسم

بلاشبہہ دونوں شعروں کا بنیادی مضمون یہ ہے کہ محبوب وعدۂ وصل کی خوش خبری سنا دے تو عاشق کو شادی مرگ ہو جائے گی لیکن میکلی نے یہ مضمون جس انداز میں پیش کیا، صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ غیر طبعی ہے یعنی اسے یقین ہے کہ وعدۂ وصل سننے کے بعد مر جاؤں گا اور محبوب کو اس وعدے کے ایفا کی ضرورت پیش نہ آئے گی چناں چہ وہ کہتا ہے کہ اے محبوب! تو وعدہ کر لے اور اس الجھن میں نہ پڑ کہ اس کا ایفا کیوں کر ہوگا؟ کیوں کہ تیرے وعدے کے بعد میں کل تک زندہ ہی نہ رہوں گا پھر اسے پورا کرنے کی نوبت کیوں آئے گی؟ گویا میکلی نے وعدۂ وصل کو ''خودکشی'' کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی اور یہ صورت طبعی اور وقوعی نہیں۔

اس کے برعکس میرزا کہتے ہیں کہ اے محبوب! تو نے وعدہ تو کر لیا تھا مگر ہمیں اس پر اعتبار نہ تھا۔ ہم جانتے تھے کہ تو جھوٹے وعدے کرنے کا خوگر ہے اگر ہمیں تیرے وعدے پر اعتبار ہوتا تو کیا اب تک شادی مرگ نہ ہو چکے ہوتے؟

یہ اس مضمون کے پیش کرنے کی طبعی، وقوعی اور صحیح صورت تھی۔ بالغ نظر استاد کوئی پرانا مضمون لے کر صحیح انداز میں پیش کر دے تو یہ شایان مدح ہے نہ کہ مستوجب قدح۔ چند اور اشعار بھی ایسے ہیں لیکن ان پر گفت گو کسی دوسری فرصت پر اٹھا رکھتا ہوں۔

(ماہ نو-کراچی-فروری ۱۹۶۵ء)

غالبؔ — چند گزارشیں

میرزا غالبؔ کی شعر گوئی کا آغاز دس بارہ سال کی عمر میں ہو گیا تھا مگر ابتدائی دور کے شعر یقیناً ایسے نہ ہوں گے کہ انھیں محفوظ رکھا جاتا۔ البتہ پندرہ سولہ برس کی عمر کے اشعار کا خاصا حصہ ''نسخۂ امروہہ'' میں دیکھا جا سکتا ہے، جو بہ ظاہر میرزا کے اُردو کلام کا پہلا مجموعہ ہے۔ اسی نسخے نے جزوی ترمیمات کے بعد ''نسخۂ حمیدیہ'' کے نام سے اشاعت پائی۔ مزید اضافوں کے بعد وہ مرقع وجود پذیر ہوا جو ''نسخۂ شیرانی'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ ابتدائی دور میں میرزا غالبؔ فارسی کی طرف متوجہ ہوئے۔ پھر خاصی طویل مدت تک وہ فارسی ہی کے شاعر سمجھے جاتے تھے اگرچہ وقتاً فوقتاً اُردو شعر بھی کہہ لیتے تھے۔

غرض میرزا نے عمر گراں مایہ کے کم و بیش ساٹھ سال شعر گوئی میں صَرف کیے۔ اس مُدّت کے مختلف دور ہیں۔ مولانا شبلی مرحوم نے ''شعر العجم'' میں لکھا ہے کہ میرزا کی طبیعت میں جدّت کا مادہ شدت سے تھا۔ معنی آفرینی سے انھیں خاص مناسبت تھی۔ اس لیے میرزا بیدلؔ کا کلام دیکھا تو اس سے بہ درجہا غایت متاثر ہوئے۔ اس کی مثالیں ان کے ابتدائی اُردو کلام میں ملتی ہیں:

اسدؔ ہر جا سخن نے طرحِ باغِ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگِ بہار ایجادیِ بیدلؔ پسند آیا

☆

ساز پر رشتہ پئے نغمۂ بیدلؔ باندھا
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدلؔ کا

میرزا بیدلؔ کا اثر:

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میرزا بیدلؔ کا یہ اثر صرف مختصر سی مُدّت کے لیے قایم رہا اور آپ جانتے ہیں کہ فکر و نظر کے ارتقائی دور میں انسان کے لیے مختلف مراحل پیش آتے ہیں اگر وہ کسی مرحلے میں رک جائے تو ارتقاء پایۂ کمال پر نہیں پہنچ سکے گا۔ بلند پایہ ہستیاں ایسے مراحل سے جلد گزر جاتی ہیں۔

میرزا خود کہتے ہیں:

در طریقت ہر چہ پیش آمد گزشتن داشتم
کعبہ دیدم نقش پائے رہرواں نامیدمش

جب وہ فارسی کی طرف متوجہ ہوئے تو میرزا بیدؔل کی حقیقی حیثیت ان پر آشکارا ہوگئی۔ یہاں تک کہ چودھری عبدالغفور سرؔور مارہروی کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''ناصر علی اور بیدؔل اور غنیمتؔ۔ ان کی فارسی کیا''؟

گویا میرزا غالبؔ پر بالکل ابتدائی دور میں بیدؔل کا اثر بہت زیادہ تھا۔ ''نسخہ امروہہ'' کے آغاز میں بھی انھوں نے ''بسم اللہ'' وغیرہ کے بعد تبرکاً لکھا:

''ابو المعانی عبد القادر بیدؔل رضی اللہ عنہ'' (نسخۂ امروہہ شایع کردہ ''نقوش'' ص ۵۱) اور آخر میں بھی یہ عبارت ملتی ہے:

''از تحریر دیوانِ حسرت عنوانِ خود فراغت یافتہ بہ فکر کاوش مضامینِ دیگر رجوع بہ جناب روحِ میرزا علیہ الرحمۃ آورد''۔ (نسخۂ امروہہ ص ۲۹۷)۔

ظاہر ہے کہ اُردو کے بالکل ابتدائی کلام کے سوا میرزا غالبؔ کے فارسی کلام یا اُردو کلام میں میرزا بیدؔل کے اثر کا کوئی پرتو نظر نہیں آتا۔ تعجب ہے کہ ہمارے ہاں اب تک میرزا غالبؔ کے متعلق کچھ لکھا جاتا ہے تو بیدؔل کے اس ابتدائی اثر پر اس طرح زور دیا جاتا ہے گویا میرزؔا نے جو کچھ سیکھا وہ بیدؔل ہی سے سیکھا حالاں کہ یہ دور غالبؔ کے ذہنی ارتقاء میں ایک مرحلہ تھا اور ایسے مراحل سے اکثر بلند پایہ شاعروں کو گزرنا پڑتا ہے۔

اُردو کی ''بیرنگی'':

اسی طرح میرزا کے فارسی قطعات میں ایک قطعہ ہے جس میں بہ ظاہر خطاب شیخ ابراہیم ذوقؔ مرحوم سے ہے۔ اس میں فرماتے ہیں:

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگِ من است

نیست نقصاں یک دو جزو است ارسواد ریختہ
کاں دژم برگے زنخلستانِ فرہنگ من است

یہ قطعہ کیوں لکھا گیا؟ اس کا سبب قطعے کے پہلے ہی شعر میں بیان کر دیا گیا یعنی:

اے کہ در بزمِ شہنشاہ سخن رس گفتہ ای
کاے بہ پُر گوئی فلاں در شعر ہم سنگ من است

ذوقؔ سلامت رو، مرنجان مرنج آدمی تھے۔ ان کا مقصد غالباً یہ نہ تھا کہ میرزا کے اُردو کلام کی تحقیر کریں۔ یہ اس دور کا معاملہ ہے جب میرزا غالبؔ صرف فارسی کے شاعر مانے جاتے تھے اور ان کا اُردو دِیوان بہت مختصر تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ میرزا تک یہ ذکر تعریض کے انداز میں پہنچا۔ لہٰذا انھیں یہ قطعہ کہنا پڑا۔

اب ہمارے ہاں اس قطعے کے اشعار کا ذکر چھڑتا ہے تو ایسے انداز میں چھڑتا ہے گویا میرزا اپنے اُردو کلام کو واقعی ‘‘بیرنگ’’ سمجھتے تھے حالاں کہ حقایق و وقائع کی بنا پر یہ بھی درست نہیں۔

حقیقت حال:

جب میرزا شاہی دربار سے وابستہ ہونے کے بعد التزاماً اُردو شعر کہنے لگے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اپنے ان اُردو اشعار کی گراں مایگی کا خاصا احساس تھا چناں چہ شیخ نبی بخش حقیرؔ کو انھوں نے اپنی غزل ‘‘نمایاں ہو گئیں’’ ‘‘پنہاں ہو گئیں’’ بھیجی تو مکتوب میں فرماتے ہیں:

> ‘‘بھائی خدا کے واسطے غزل کی داد دینا اگر ریختہ یہ ہے تو میرؔ اور میرزاؔ کیا کہتے تھے اگر وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے’’؟

(نادراتِ غالبؔ حصہ دوم ص ۲۶)

میرؔ و میرزاؔ سے مراد میر تقی اور میرزا سوداؔ ہیں۔ ایک اور مکتوب میں اُردو کی دو غزلیں بھیجیں جن میں سے ایک ‘‘گو آئے’’ ‘‘کھو آئے’’ تھی اور دوسری ‘‘چھپائے نہ بنے’’ ‘‘سنائے نہ بنے’’ فرماتے ہیں:

> ‘‘داد دینا اگر ریختہ پایۂ سحر یا اعجاز کو پہنچے تو اس کی یہی صورت ہو گی یا کچھ اور شکل’’۔

(نادرات غالبؔ حصہ دوم ص ۱۲)

اپنے اُردو مکاتیب کے باب میں انھوں نے جابجا جو کچھ فرمایا وہ محتاج اعادہ نہیں۔ ان مکاتیب پر ایک سو سال گزر چکے ہیں۔ ہمارے ہاں کے مشہور انشا پردازوں کے مکاتیب موجود ہیں مگر ایک میں بھی میرزا کے مکاتیب کی شان نظر نہیں آتی۔

غرض یہ معاملہ بھی ایسا ہے کہ اربابِ فکر و نظر صرف ایک خاص وقت کی تحریر سامنے رکھ کر اسے ایک مستقل اظہارِ رائے سمجھ لیتے ہیں حالاں کہ اس کے خلاف شواہد موجود ہیں اور ان سے قطعِ نظر کرتے ہُوئے محض ایک وقتی رائے کو مدارِ نقد و نظر بنا لینا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اس سے پڑھنے والوں کے سامنے تصویر کا صرف ایک رُخ آتا ہے۔ دوسرا رُخ ان کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے حالاں کہ صحیح دُوسرا ہی رُخ ہے۔

”ہم بھی کیا یاد کریں گے“:

اسی طرح میرزا غالبؔ کے بعض اشعار کا مفہوم بھی صحیح نہیں سمجھا جاتا۔ ظاہر الفاظ کی بنا پر ایک مفہوم ذہن میں بٹھا لیا جاتا ہے۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کلام شاعر کا ہے اور وہ بعض اوقات خاص امور کے اثبات کے لیے ایک خاص طریقہ اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے نہ سمجھنے سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ میرزا کا مشہور شعر ہے:

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

یہ شعر جن احوال و وقائع پر مبنی ہے وہ چنداں تشریح کے محتاج نہیں۔

جب کوئی فرد مصائب و شدائد کے لامتناہی چکروں میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اسے بار بار احساس ہوتا ہے کہ ان کا سبب کیا ہے۔ مجھ پر تکلیفوں کا ہجوم کس وجہ سے ہوا؟ میرے لیے آرام و عافیت کی صورت کیوں پیدا نہیں ہوتی؟ مصائب کے تواتر اور شدائد کے تسلسل کا تار کیوں نہیں ٹوٹتا یا ان میں کمی کیوں نہیں آتی؟ یہ عام انسانی احساسات ہیں اگر میرزا غالبؔ نے ان کا اظہار کر دیا تو ایک ایسی حقیقت بیان کی جو عام ہے۔ پریشانیوں میں ہر انسان اللہ تعالیٰ کی صفات ربوبیت و رحمت کا ظہور ایسے انداز میں چاہتا ہے جس کا وہ متوقع ہو۔ اس ظہور کی خواہش کے لیے میرزا کو یہ اسلوب زیادہ موثر معلوم ہُوا کہ تکلیفوں کی بے نہایتی کا ذکر کر کے کہہ دیا:

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پھر وہ اپنے اعمال کا جائزہ لیتے ہیں تو انھیں کوئی بات ایسی نظر نہیں آتی جس کی سنگینی کے باعث انھیں سخت سزا ملی۔ مثنوی ''ابر گہربار'' کی مناجات میں وہ خدا سے مخاطب ہیں اور کہتے ہیں:

ہمانا تو دانی کہ کافر نیم
پرستار خورشید و آذر نیم
نہ کشتم کسے را بہ اہرمنی!
نہ بردم ز کس مایہ در رہزنی

یعنی اے خدا تو جانتا ہے کہ میں کافر نہیں۔ سورج یا آگ کو نہیں پوجتا۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا، کسی کے مال پر ڈاکہ نہیں ڈالا۔

اسلوبِ بیان کی نیرنگیاں:

اگر ایک انسان پروردگار کی بارگاہ میں اپنی مصیبتوں کی داستان سناتا ہے تو اسے غیر شایان معنی کی طرف کیوں کھینچا جائے؟ فارسی میں بھی میرزا نے یہ مضمون باندھا ہے:

گفتنی نیست کہ بر غالبؔ ناکام چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نہ داشت

یعنی میری حالت ایسی ہے کہ کوئی دیکھے تو کہہ دے کہ اس بندے کا شاید خدا ہے ہی نہیں۔

یہاں بھی صرف ربوبیت و رحمت کا ظہور نہ ہونے کی طرف توجہ دلائی گئی اور اسلوب بیان میں اپنی حالت کی انتہائی خستگی کا نقشہ پیش کر دیا ہے پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ میرزا غالبؔ نے دوسرے مقام پر وہی کہا ہے جو ایک صابر و شاکر صاحب ایمان کو کہنا چاہیے:

بیگانگیِ خلق سے بے دل نہ ہو غالبؔ
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

شاعر بعض اوقات اپنے بیان کو زیادہ موثر بنانے کے لیے ایک خاص اسلوب مناسب سمجھتا

ہے۔ اس کے ظاہری الفاظ کی وجہ سے غلط فہمی نہ پیدا ہونی چاہیے۔ دُوسرے شعرا کے سلسلے میں بھی ہمارا شیوا تاویل کا ہے۔ مثلاً اقبالؔ فرماتے ہیں:

چناں بزی کہ اگر مرگِ تست مرگِ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد!!

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

ریختہ رشکِ فارسی:

اسی طرح میرزا غالبؔ کا ایک مشہور شعر ہے:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کر اسے سنا کہ یوں

میرے اندازے کے مطابق اس کا مطلب بھی عموماً صحیح نہیں سمجھا جاتا۔ عام تصور یہ ہے کہ فارسی میں اضافتیں زیادہ ہوتی ہیں چوں کہ میرزا غالبؔ کے ابتدائی کلام میں فارسی ترکیبیں اور اضافتیں زیادہ تھیں، اس لیے انھوں نے اپنے اُردو کلام کو فارسی کے لیے باعثِ رشک قرار دے دیا۔ خدا کے لیے غور فرمائیے کہ یہ تعبیر میرزا کے لیے کس وجہ سے باعثِ اعزاز ہو سکتی ہے۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ فارسی نثر یا اشعار بہت سادہ اور عام فہم ہوتے ہیں۔ بہترین اشعار میں سے شاید ہی کسی میں الجھاؤ ہو۔ ''گلستان'' فارسی نثر کی بہترین کتاب ہے، اس کی عبارت بہت سہل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ میرزا اپنے اُردو کلام کی مستقل معنوی حیثیت پیش کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں فارسی زبان میں شاعری کا بہت قیمتی سرمایہ موجود ہے اگر کوئی شخص پوچھے کہ ریختہ فارسی کے لیے باعث رشک کیوں کر ہو سکتا ہے تو اسے غالبؔ کا کہا ہوا اُردو کلام سنا دینا چاہیے۔

یقیناً یہ کلام اس زمانے میں بھی فارسی کے لیے باعثِ رشک تھا اور آج بھی باعثِ رشک ہے۔ اس مختصر سے اُردو دیوان میں ایسے شعر خاصے ہیں جو فارسی کے بہترین اشعار کے مقابلے میں بے تکلّف پیش کیے جا سکتے ہیں مثلاً:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

یہ حضرت آدمؑ کے قصّے کی طرف اشارہ ہے یعنی جب فرشتوں کو سجدے کا حکم ہوا تو ایک نے جو بڑے اُونچے درجے پر فائز تھا انکار کر دیا اور اس کی گستاخی کا نتیجہ یہ نکلا کہ خدا نے اسے ٹھکرا دیا۔ فارسی میں بھی میرزا نے کہا ہے:

اے آنکہ از غرور بہ ہیچم نمی خری!
زاں پایہ باز گوئی کہ پیش از ظہور بود!

چند رَشک انگیز اشعار:

مندرجہ ذیل اشعار کو کون فارسی کے لیے باعثِ رشک قرار نہ دے گا:

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہُوا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ ہنر کے ساتھ
لیکن عیارِ طبع خریدار دیکھ کر
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

پالتو بلّی پر نظم:

میرزا غالبؔ نے فارسی نظم و نثر میں مختلف موضوعات پر لکھا ہے۔ فارسی قطعات میں ایک نظم انھوں نے اپنی پالی ہوئی بلّی پر لکھی تھی۔ ذیل میں اس کے کچھ اشعار مع ترجمہ سپردِ قلم کرتا ہوں۔ مغربی شعرا ایسے موضوعات پر عموماً لکھتے رہتے ہیں۔ کسی پرانے باکمال شاعر کے کلام میں بلّی پر ایسی نظم مل جائے تو مجھ ناچیز کو بھی آگاہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں:

سرمستِ ادا چوں بہ زمیں باز خرامد
از خاک دمد غنچہ ز نقشِ قدمِ او

(میری بلّی جب ادا کی سرمستی میں خراماں ہوتی ہے تو زمین پر جہاں جہاں اس کا قدم پڑتا ہے، اس کے نقش سے غنچہ اُگتا ہے۔ واضح رہے کہ زمین پر بلّی کا نقشِ قدم ہو بہو غنچے جیسا ہوتا ہے)۔

چوں صورتِ آئینہ ز افراطِ لطافت
آید بہ نظر بچّۂ او در شکمِ او

(لطافت کی فراوانی سے بلّی کا شکم آئینے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ یہاں تک کہ ہم اس کے شکم میں بچّے کو دیکھ سکتے ہیں)۔

ہم شیر ژیانی کہ بہ بنی بہ نیستاں
دارد سرِ دریوزہ غرّش زِ دمِ او

(نیستاں میں ہر شیر ژیاں کی آرزو یہ ہے کہ میری بلّی کے دم سے آواز کی بھیک مانگے)۔

گر جانورِ مردہ بہ بیند سرِ راہے
از پاکیِ طینت نخورد غیر غمِ او

(اگر کوئی مردہ جانور راستے میں پڑا مل جائے تو میری بلّی طینت کی پاکیزگی کے باعث صرف

اس کے مرنے کا غم کھاتی ہے۔ مطلب یہ کہ مردہ جانور قطعاً نہیں کھاتی۔

آرے بود از غیرت انداز خرامش
بر کبک و تدرو است اگر خود ستمِ او

(چکور اور تدرو کو تو میری بلّی سے کبھی کوئی آزار نہیں پہنچا۔ البتہ دونوں جانور بلّی کے اندازِ خرام پر غیرت سے مرے جا رہے ہیں)۔

رخشندہ ادیم تنش از لطفِ زبانش
گوئی بہ اثر تاب سہیل است نمِ او

(بلیاں عموماً اپنا جسم چاٹتی رہتی ہیں۔ میرزا کہتے ہیں میری بلّی کے جسم چاٹتے رہنے سے اس کا چمڑا چمک اٹھا ہے۔ گویا کہا جا سکتا ہے کہ اس کے لعابِ دہن میں سہیل ستارے کی جلوہ افروزی کا اثر ہے)۔

جوشِ گل و بالیدگیِ موجۂ رنگ است
دم لابہ کناں آمدنِ دمبدمِ او

(پالتو بلیوں کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ بار بار مالک کے پاس پیار کی غرض سے دُم ہلاتی ہُوئی آتی ہیں۔ میرزا فرماتے ہیں اس طرح اس کا آنا دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ پھول جوش میں آ گئے ہیں اور رنگ کی لہریں بالیدگی اختیار کر گئی ہیں)۔

در عربدہ چوں بند ز دُم باز کشاید
لرزد شکن طرۂ خوباں زِ خمِ او

(حالتِ جنگ میں میری بلّی دُم کی گرہ کھولتی ہے تو اس سے حسینوں کے طرے کی شکن میں لرزہ پیدا ہو جاتا ہے)۔

تا مُہرہ کشِ صفحۂ افلاک برد مہر
بادا کفِ دست من و پشت و شکمِ اُو

(جب تک آسمان پر سورج کا مہرہ گردش کر رہا ہے، خدا کرے میرا ہاتھ ہو اور بلّی کی پشت اور شکم یعنی جی چاہتا ہے کہ اس کی پشت اور پیٹ پر پیار سے ہاتھ پھیرتا رہوں)۔

(ماہِ نو۔ کراچی فروری ۱۹۷۱ء)

میرزا غالبؔ کے ہم معنی اُردو اُور فارسی اشعار

مضمون، بیان اور زُبان کی مناسبت

میرزا غالبؔ کی متعدد خصوصیتیں ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کے باکمال شاعر تھے اور اس خصوصیت میں میری دانست کی حد تک اقبالؔ کے سوا کوئی اُردو شاعر میرزا کا شریک و سہیم نہیں۔ میرا مطلب خدانہ خواستہ یہ نہیں کہ بعض دوسرے مشہور اساتذۂ اُردو نے فارسی میں شعر نہیں کہے یقیناً کہے بل کہ بعض کے تو مطبوعہ فارسی دیوان بھی موجود ہیں لیکن یہاں شعر گوئی کا معاملہ مطلوب نہیں بل کہ شعر گوئی کا ایک خاص پیمانہ پیشِ نظر ہے۔

شعر گوئی کی مجمل کیفیت:

میرزا نے بالکل ابتدائی دور میں زیادہ تر اُردو شعر کہے۔ پھر ان کی زندگی کا بڑا اور بہترین حصّہ فارسی شاعری کی نزہت گاہ میں بسر ہوا اور ان کا منظوم فارسی کلام آج بھی اُردو کے مقابلے میں کم از کم پانچ گنا ہے۔ متوسط دور کے آخر میں پھر ان کی توجہ اُردو کی طرف مبذول ہوئی۔ جب لال قلعے سے مستقل تعلق قائم ہوگیا تو وہ زیادہ تر بہادر شاہ کی فرمائش پر اُردو شعر کہتے رہے۔ خود لکھتے ہیں:

> ”جب حضور میں حاضر ہوتا ہوں تو اکثر بادشاہ مجھ سے ریختہ طلب کرتے ہیں۔ سو وہ کہی ہوئی غزلیں تو کیا پڑھوں، نئی غزل کہہ کر لے جاتا ہوں۔ آج میں نے دوپہر کو ایک غزل لکھی ہے کل یا پرسوں جا کر پڑھوں گا“۔

میرزا کا بہترین اُردو کلام زیادہ تر اسی دور کا ہے اگر چہ پہلے دور کی بھی بعض چیزیں ایسی ہیں کہ ان کی مثالیں مشکل سے ملیں گی۔

شیرانی مرحوم کا مقالہ:

میرا احساس یہ ہے کہ میرزا کی اس خصوصیت پر بہت کم اصحاب علم و فضل نے توجہ فرمائی اور

جنھوں نے اس کا اندازہ فرمالیا تھا وہ بھی مفصل بحث کی فرصت نہ نکال سکے۔ میرے علم کی حد تک سب سے پہلے حافظ محمد محمود خاں شیرانی مرحوم و مغفور نے ایک مختصر سا مقالہ اس موضوع پر تحریر فرمایا تھا جو رسالہ ''غالب'' (امرتسر) میں شائع ہوا تھا (جلد اول ۷ جون ۱۹۲۷ء)۔ اس میں فاضل موصوف نے میرزا کے بائیس یا تیئس ہم مضمون اُردو اور فارسی اشعار بالمقابل درج کیے تھے۔ ساتھ ہی لکھ دیا تھا:

> ''میرزا غالب اگر اس التفات کا نصف حصہ بھی اُردو پر صَرف کرتے جو انھوں نے فارسی کے لیے مخصوص کیا تھا تو ان کی اُردو، ان کی فارسی سے بلاشبہہ گوے سبقت لے جاتی۔ تاہم میں اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میرے قلب پر جو وجدانی کیفیت ان کے اُردو کلام سے طاری ہوتی ہے، وہی لذت ان کے میخانے کی شراب شیراز سے حاصل نہیں ہوتی۔ یہ عقیدہ ممکن ہے ملحدانہ مانا جائے اور بہ نظرِ امعان بے بنیاد ثابت ہو لیکن ذوق و وجدان کے معاملات میں بحث کرنا میں جانتا ہوں ایک بے سُود فعل ہے''۔

مسئلہ ذوق و وجدان:

بلاشبہہ ذوق و وجدان کے معاملات پر بحث بے سود ہوتی ہے تاہم ذوق و وجدان کی حیثیت بھی ایسے صفحے یا تختی یا سلیٹ کی نہیں جس پر کچھ مرقوم نہ ہو۔ یہ بھی تحصیلِ علم اور مطالعے کے ساتھ نشو و ارتقا پاتا رہتا ہے جو شخص فارسی شعر و ادب کا مطالعہ وسیع پیمانے پر پہنچا دے گا اور مشہور اساتذہ شعر کے کلام کی مزاولت جاری رکھے گا اس کا ذوق ہر ایسے شخص کے ذوق سے یقیناً مختلف ہوگا، جس کا مطالعہ صرف اُردو شعر و سخن تک محدود رہے گا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ایک زبان کے وسیع مطالعے کے باوصف مختلف اصحاب کا ذوق و وجدان مختلف رہے۔ بعض معنی آفرینی اور حقیقت گوئی کو رفعتِ کلام کا معیار بنالیں اور بعض کے ذوق کی پرواز لطف زبان کے دائرے ہی میں محدود رہ جائے۔

مشترک مضمون کے اشعار:

میں نے سرسری طور پر محض غزلیات اور ایک قصیدے کی تشبیب سے اُردو اور فارسی کے ہم مضمون اشعار منتخب کیے اور ان کی تعداد چالیس سے بھی زیادہ نکل آئی۔ بعض کی حیثیت محض ترجمے کی ہے اور بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ایک مضمون فارسی میں باندھا گیا پھر اسے اُردو میں بھی لے لیا

گیا۔ بعض شعروں میں مضمون ایک ہے لیکن جب اُردو میں اسے باندھا تو اس میں نہایت پُر لطف اضافہ ہو گیا۔ بعض اُردو اور فارسی اشعار میں محض جزوی اشتراک ہے۔

اس سلسلے میں غور و فکر اور جائزے کی اصل بنیاد میرے نزدیک یہ تھی کہ آیا مضمون فارسی میں بہتر طریق پر ادا ہوا ہے یا اُردو میں؟ اسے فی الجملہ اُردو کی فطرت سے زیادہ مناسبت ہے یا فارسی کی فطرت سے؟ یا دونوں میں ہر مضمون کی حیثیت یکساں رہی ہے؟

غور و بحث کی ابتدا:

مجھے بے تامل اعتراف کر لینا چاہیے کہ میرا مطالعہ اور علم محدود ہے۔ کم از کم میری نظر سے اب تک کوئی ایسی تحریر نہیں گزری جس میں اُردو اور فارسی کے ہم مضمون اشعار پر اس نقطۂ نگاہ سے بحث کی گئی ہو۔ میں بحث کا حق تو ادا نہیں کر سکتا لیکن چاہتا ہوں، اس کی ابتدا ہو جائے۔ شاید یہی ابتدا اصحابِ فکر و نظر کے لیے توجہ فرمائی کا سبب بن جائے۔

انسان کی طلب و تلاش:

میرزا ایک قصیدے کی تشبیب فرماتے ہیں:

جز در آئینہ نہ دیدم اثر سعیِ خیال
ہر قدر بہر طلب گاری انساں رفتم

انسان کی تلاش اور عالمِ حقیقت میں اس کی نایابی یا کم یابی نیا خیال نہیں۔ ایک ایرانی شاعر کہتا ہے:

باصد ہزار دیدہ بگردد جہاں سپہر
جویاے آدمی است، ولے آدمی کجاست؟

وارستہؔ چکنی کہتا ہے:

آنچہ پُر جستیم و کم دیدیم و درکار است و نیست
درحقیقت نیست جز انساں کہ بسیار است و نیست

عالمگیر اعظم نے وارستہؔ کے دوسرے مصرعے میں نہایت عمدہ تصرف کیا اور اس کے رقعات میں

یہ شعر ایک سے زیادہ مرتبہ نقل ہوا ہے:

آنچہ پُر جستیم و کم دیدیم و درکار است و نیست
نیست جز آدم دریں عالم کہ بسیار است و نیست

میرزا غالبؔ نے اُردو میں یہی مضمون ایسے انداز میں باندھ دیا کہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

ظاہر ہے کہ یہ اُردو شعر نہ محض میرزا کے فارسی شعر پر بل کہ بعد کے دونوں فارسی شعروں پر بہ درجہا فائق ہے اور یہ معاملہ میرے اندازے کے مطابق بحث کا محتاج نہیں۔

طور و تجلّی طور:

میرزا فارسی میں کہتے ہیں:

چرا بہ سنگ و گیا پیچی اے زبانۂ طور!!!
زراہِ دیدہ بہ دل در رو و ز جاں برخیز

یعنی اے طور کی تجلّی تو جمادات و نباتات سے کیوں اُلجھتی ہے؟ اپنے کرشمے حجر و شجر کو کیوں دکھاتی ہے؟ آ اور میری آنکھوں کے راستے دل میں اُتر جا، پھر جان سے ابھر کر ہوش افگن جلووں کا تماشا دکھا۔

اُردو میں یہی مضمون زیادہ پُر تاثیر اور مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

گرنی تھی ہم پہ برق تجلّی، نہ طُور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر!

جو برق تجلّی طُور پر گری اس کا اصل نشانہ ہم تھے، طُور نہ تھا۔ شراب ہر مے خوار کو اس کے ظرف یعنی حیثیتِ برداشت کے مطابق دیتے ہیں۔ یہ مناسب نہ تھا کہ طُور کی حیثیتِ برداشت کا اندازہ ملحوظ رکھے بغیر اسے ایسی تیز و تند شراب پلا دی جاتی، جس کا وہ حریف نہ تھا۔

دیکھیے اس شعر میں، جو صرف سولہ الفاظ پر مشتمل ہے۔ اپنے ذوقِ طلب اور مطلوب کے لیے

انتہائی بے تابانہ تڑپ کا اظہار بھی نہایت موثر انداز میں کر دیا۔ طُور پر جو قیامت گزری اس کا سبب بھی آشکارا ہو گیا۔ اس کے ساتھ اظہارِ ہم دردی بھی کر دیا گیا اور سب سے آخر میں سورۂ احزاب کی اس آیت کے مضمون کی طرف بھی اشارہ فرما دیا جس میں امانت کا ذکر ہے اور جس کی بنا پر خواجہ حافظ نے کہا تھا:

آسماں بار امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بہ نامِ منِ دیوانہ زدند

تسکینِ شوق کا معاملہ:

میرزا کا ایک خاص مضمون یہ ہے کہ شوق اگر واقعی ''شوق'' ہے اور وہ ہوس کے ہر شائبے سے پاک ہے تو محبوب و مطلوب تک رسائی ہو جانے پر بھی اس کی بے تابیوں اور بے قراریوں کو آسودگی نصیب نہیں ہو سکتی۔ وصال بھی اس کی دہکتی ہوئی آگ کے لیے سکون و اطمینان کا پانی مہیا نہیں کر سکتا۔ فارسی میں فرماتے ہیں:

بلبل بہ چمن بنگر و پروانہ بہ محفل
شوق است کہ در وصل ہم آرام نہ دارد

چمن بلبل کے لیے محبوب کا کاشانہ ہے جہاں ہر طرف اور ہر سمت پھول ہوتے ہیں لیکن دیکھیے بلبل چمن میں بھی مصروفِ آہ و فغاں رہتی ہے۔ اس کے حلق سے بہ دستور دلدوز نالے بلند ہوتے ہیں۔ شمع محفل میں روشن ہوتی ہے تو پروانوں کا ہجوم شروع ہو جاتا ہے۔ وہ محبوب کے وصال سے لطف اندوز ہونے کے بجائے تڑپ تڑپ کر اس پر گرتے ہیں اور جب تک جل جل کر اپنی ہستی فنا نہیں کر لیتے ان کے جوش بے تابی کا سمندر سکوں پذیر نہیں ہوتا۔

دونوں مثالیں ایسی ہیں جن سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اُردو میں یہی مضمون پیش کیا تو اثبات حقیقت کے لیے تیسری مثال لے آئے۔ فرماتے ہیں:

گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

یعنی اگر تیرے دل میں خیال ہو کہ وصال میں شوق کی آگ ٹھنڈی پڑ جاتی ہے تو دیکھ کہ موج سمندر میں رہ کر بھی بدستور ہاتھ پاؤں مارتی چلی جا رہی ہے اور اس کی بے تابی میں کوئی کمی نہیں آتی یہ

اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ حقیقی شوق کی تیزی و تندی پر وصال قطعاً اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

دیکھیے اُردو اور فارسی کا اصل مضمون ایک ہے لیکن دونوں جگہ مثالیں الگ الگ پیش کیں اس سے یہ ثبوت بھی ملتا ہے کہ کسی ایک حقیقت کی توضیح کے بعد بھی اس پر غور و فکر کا سلسلہ بدستور جاری رہتا تھا۔

مصائبِ حیات کی تلافی:

میرزا کہتے ہیں کہ جنّت کتنی ہی بیش بہا متاع ہو جو اہل ایمان کو عمل صالح کے صلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے گی۔ ان کے نزدیک انسان کو زندگی میں جو مشقتیں اٹھانی اور جو مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں جنّت کو ان کی تلافی کا متوازن صلہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ فارسی میں کہتے ہیں:

جنّت نہ کند چارۂ افسردگی دل
تعمیر بہ اندازہ ویرانیِ ما نیست

یعنی زندگی میں پے در پے دل پر جو افسردگی طاری ہُوئی اس کا مداوا جنت نہیں کر سکتی۔ ہمارے لیے تعمیر کا جو سامان مہیّا کیا گیا، اسے ہماری تخریب سے کوئی مناسبت نہیں۔ اُردو میں فرماتے ہیں:

دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے
نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

مضمون وہی ہے البتہ مثال دوسری پیش کر دی۔ فارسی میں تعمیر و تخریب کا تقابل تھا اُردو میں فرمایا کہ ہم خمار کے شکنجے میں جتنی مصیبتیں اٹھا چکے ہیں ان کے برابر شراب نہیں ملی، جسے پی کر سابقہ مصیبتوں کی تلخیوں کا ازالہ کر سکتے۔

مطالعہ کائنات:

میرزا نے خود کائنات کا مطالعہ کیا اور وہ اس مطالعے کی دعوت ہر فرد کو دیتے ہیں۔ اس کے دو حصّے ہیں: اوّل ہر شے، جس شکل اور جس صورت میں نظر آ رہی ہے اس کے مطالعے پر خاص توجہ کی جائے۔ دوم ہر شے میں گونا گوں جو بھید چھپے ہوئے ہیں ضروری ہے کہ گہرے اور مسلسل غور و فکر کے بعد ان کے چہرے سے پردے اٹھائے جائیں۔ آج تک انسانوں نے جتنے علوم پیدا کیے اور عالم انسانیت کی ترقی و تعالی کے لیے جو کارنامے انجام دیے وہ اسی مطالعے کا نتیجہ ہیں۔ میرزا فارسی میں فرماتے ہیں:

عالم آئینۂ روز است چہ پیدا چہ نہاں
تاب اندیشہ نہ داری بہ نگاہے دریاب

یہ جہان رازوں اور بھیدوں کا آئینہ ہے خواہ اس کے ظواہر پر نظر ڈالی جائے یا بواطن پر۔ دونوں صورتوں میں بھید کھلتے جائیں گے۔ اے مخاطب اگر تجھ میں غور و فکر کی صلاحیت نہیں تو محض نظر اٹھا کر ظواہر ہی سے بصیرتیں اور عبرتیں حاصل کر لے۔

اُردو میں اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے:

نہیں گر سر و برگ ادراک معنی
تماشائے نیرنگ صورت مبارک

یعنی اگر تجھ میں معنویت سے لذت اندوز ہونے کی صلاحیت نہیں تو نہ سہی صرف نیرنگ صورت ہی کا تماشا اپنے لیے باعثِ برکت سمجھ۔

غالبؔ کی برزخیت:

واضح رہے کہ اس قسم کے اشعار میرزا سے پیش تر شاذ ہی نظر آتے تھے۔ پھر ان کے بیان میں طرز و انداز کی جدت کہاں تھی؟ حقائق کے ایسے جواہر پارے میرزا ہی کی بہ دولت اُردو کے دامن میں پہنچے۔ ایسے ہی مطالب کی بنا پر میرزا نے قدیم و جدید کے درمیان برزخ کی شان پیدا کر لی۔ عام نہج و اسلوب قدیم، معنویّت زیادہ تر نئی، پھر اندازِ بیان میں ایسی وسعت کے دروازے کھول دیے کہ جو شاعری عموماً عامیانہ ہوسناکیوں کے لیے وقف ہوگئی تھی اس میں ہر قسم کے مطالب کو قبول کر لینے کی صلاحیت آشکارا کر دی خواہ ان کا تعلق حقائق حیات سے تھا یا حقائق کائنات سے۔

چند مثالیں:

ایسے اشعار کہاں ملتے ہیں جیسے مثلاً یہ ہیں:

در شاخ بود موج گل از جوش بہاراں
چوں بادہ بہ مینا کہ نہان است و نہاں نیست
ماہ و خورشید دریں دایرہ بیکار نیند
تو کہ باشی کہ بخود زحمت کارے نہ دہی؟

چارہ درسنگ و گیاہ و رنج با جاندار بود
پیش ازیں کیں در رسد آں را مہیا کردہ ای

ہر چند در دیدہ عیان است نگاہش دارند
ہرچہ در سینہ نہان است زسیما بینند

یخ فروشم در تموز و کلبہ دور از چار سوست
مے رود سرمایہ از کف تاخریدارے رسد

مرد نبود کز ستم برخاطرش بارے رسد
ہم زخود رنجم گرم از دوست آزارے رسد

پیشہ اور غیرت وحمیت:

میرزا کے دل میں غیرت وحمیت کے لیے خاص تڑپ نظر آتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جس انسان میں غیرت نہ ہو اس میں کوئی بھی خوبی نہیں رہ سکتی۔ فرہاد نے ''مزدوری'' کا کام کیا یعنی عام افسانے کے مطابق بے ستوں پہاڑ کاٹنے اور شیریں کے باغ کے لیے نہر لانے پر آمادہ ہو گیا۔ وہ باغ دراصل پرویز کی عشرت گاہ تھا۔ مزدوری کے پیشے پر طعن میرزا کو گوارا نہ ہوا۔ فرماتے ہیں:

پیشے میں عیب نہیں، رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

لیکن جب غیرت کا پہلو سامنے آیا تو اس ''آشفتہ سر جواں میر'' کے خلاف فیصلہ صادر کرنے میں ایک لمحے کے لیے میرزا کو تامل نہ ہوا۔ فارسی میں فرماتے ہیں:

از جوے شیرو عشرتِ خسرو نشاں نہ ماند
غیرت ہنوز طعنہ بہ فرہاد می زند

جوے شیر یا خسرو پرویز کے مقام عیش ونشاط کا نشان تک باقی نہ رہا۔ وہ سب آثار مٹ گئے اور تاریخ ماضی کے محض افسانے رہ گئے، تاہم غیرت آج بھی فرہاد پر طعنہ زن ہے جس نے پہاڑ کاٹ کر

پرویز کی عشرت گاہ کے لیے نہر بہم پہنچائی یا جوے شیر کھودی اور پرویز لاریب فرہاد کا رقیب تھا۔

اُردو میں یہی مضمون یوں ادا کیا ہے:

عشق و مزدوری عشرتگہ خسرو؟ کیا خوب!
ہم کو مطلوب نکو نامیِ فرہاد نہیں

نیز

کوہکن گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب

عظمت انسان:

میرزا کا ایک خاص مضمون انسان کے درجے کی انتہائی بلندی کا ہے۔ فارسی کے ایک شعر میں کہتے ہیں:

ز آفرینش عالم غرض جز آدم نیست
بہ گرد نقطۂ ما دورِ ہفت پرکار است

یہ مضمون انھوں نے کئی مقامات پر نئے انداز میں باندھا ہے۔ ایک غزل میں فرماتے ہیں:

اے آنکہ از غرور بہ ہیچم نمی خری
زاں پایہ باز گوی کہ پیش از ظہور بود

یعنی آج تو غرور کا یہ عالم ہے کہ مجھے مفت بھی لے لینے پر آمادہ نہیں۔ کیا تجھے میرا وہ مرتبہ یاد نہیں جو اس دنیا میں ظہور سے پیش تر مجھے حاصل تھا؟

یہی مضمون اُردو میں یوں بیان کیا اور ایسا شعر کہہ دیا جس کی مثالیں ہمارے ہاں بہت کم ملیں گی:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

آہ و فغاں اور آداب و قواعد:

جو فرد ماتم و سوگواری کا نشانہ بنا ہوا ہو اور اس کے قلب و روح کو حزن و اندوہ کے تواتر نے بے طرح مجروح کر رکھا ہو، اس سے کوئی طبعی صورتِ حال کے آداب و قواعد کی پابندی کا امیدوار نہیں

ہوسکتا۔ ماتم زدہ کی ہر حرکت سوگواری کا مرقع ہوگی جس کے دل میں امیدوں اور آرزوؤں کا خون موجزن ہو، اس سے یہ توقع نہ رکھنی چاہیے کہ کسی کے ساتھ اسی انداز میں باتیں کرے گا جیسی عام حالات میں کرسکتا تھا۔

میرزا غالبؔ نے ''ابر گہر بار'' کی مناجات میں ایک مقام پر اپنی مصیبتیں بیان کرتے ہوئے بارگاہِ ایزدی میں عرض کیا:

دریں خستگی پوزش از من مجوی
بود بندۂ خستہ گستاخ گوی

یہ ایک بدیہی مضمون تھا۔ میرزا فارسی میں کہتے ہیں:

از نغمۂ مطرب نتواں لخت دل افشاند
اے نالہ پریشاں رو و ہنجار میاموز

مطرب کا گانا مقررہ قواعد و آداب موسیقی کا پابند ہوتا ہے۔ ان آداب و قواعد کی پابندی کا لحاظ رکھتے ہوئے دل کے ٹکڑے اُچھالنا ممکن نہیں۔ اے میرے نالے تو تمام آداب و قواعد سے کنارہ کش رہتے ہوئے جس انداز پر رَواں دواں رہنا چاہتا ہے، رہ، تجھے آداب و قواعد سیکھنے کی ضرورت نہیں۔

پھر یہی مضمون اُردو میں بیان کیا تو صرف گیارہ لفظوں میں وہ حقیقت انتہائی درد و گداز کے ساتھ واضح کردی اور ان گیارہ لفظوں میں بھی چار لفظ دو مصرعوں کی دو ردیفوں کے ہیں۔ حقیقتاً صرف سات لفظ استعمال کیے:

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابند نَے نہیں ہے

پھر ''نے'' کے ساتھ ''پابند'' کی خوبی کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ ایسے ہی مقامات ہیں جہاں شاعری اک گونہ اعجاز کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔

متاع اور رہزن:

یہ حقیقت محتاجِ بیان نہیں کہ جس کے پاس کوئی متاع ہوگی، چور یا رہزن سے اسی کو ڈر ہوگا۔ جس کے پاس کچھ ہے ہی نہیں وہ قلندرانہ شان کے ساتھ جہاں پھرے گا، بے خوف و خطر پھرے گا۔

میرزا فرماتے ہیں:

تو داری دین و ایمانے بہ ترس از دیو و نیرنگش
چو نبود توشۂ راہے چہ باک از راہزن باشد

تیرے پاس دین و ایمان کی متاعِ عزیز ہے، اس لیے شیطان کی عیاریوں اور فریب کاریوں سے خوف زدہ ہونا سمجھ میں آ سکتا ہے۔ یہ ڈر ہو سکتا ہے کہ انسان کا یہ دشمنِ قدیم اس قیمتی متاع کو اُچک نہ لے جائے۔ جس کے پاس توشہ ہی موجود نہیں، بھلا اسے رہزن کا کیا ڈر ہو سکتا ہے اور کیوں ہو۔

اُردو میں یہی مضمون دوسرے انداز میں باندھا اور حقیقتِ حال کے اعتبار سے اسے انتہائی بلندی پر پہنچا دیا۔ فرماتے ہیں:

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

دنیوی علائق کے لوازم:

فارسی کے شعر میں توشے سے یاد آ گیا کہ زادِ راہ کا مضمون ایک اور فارسی غزل میں بھی خوب باندھا ہے یعنی:

براہِ کعبہ زادم نیست شادم کز سبک باری
بہ رفتن پائے بر خارِ مغیلانم نمی آید

کعبے کا راستہ اختیار کر لیا ہے مگر زادِ راہ پاس نہیں لیکن خوش ہوں کہ سر پر کوئی بوجھ نہیں ہلکا پھلکا چلا جا رہا ہوں اور چلنے میں کانٹوں، پتھروں اور دوسری ایذا رساں چیزوں سے بچتا بچاتا منزل طے کر رہا ہوں اگر زادِ راہ کا بھاری بوجھ سر پر ہوتا تو راستے میں پاؤں اپنی مرضی کے مطابق دھرنے کی گنجایش کہاں رہتی؟ رفتار میں اضطرار آ جاتا پھر کانٹوں سے بچتا ہوا کیوں کر نکل سکتا؟

ایمان و اخلاص:

میرزا اسی ایمان کو حقیقی ایمان سمجھتے تھے جو تمام اغراض کے لوث سے بالکل پاک و مبرا ہو۔ یہاں تک کہ اسے بہشت کی گوناگوں نعمتوں سے بھی کوئی دل بستگی نہ ہو۔ صرف رضائے ذات

باری اس کا محور و مرکز ہو۔ جو ایمان نعائم جنت کی امید اور عقوبت جہنم کے خوف کی آغوش میں پرورش پائے گا، اس میں روحِ اخلاص کے لیے بالیدگی کی کون سی گنجایش ہو سکتی ہے؟ انسان کی خواہشات کا سدرۃ المنتہیٰ رضائے باری تعالیٰ ہے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ جنت رضائے باری تعالیٰ ہی کا ایک انعام ہے اور دوزخ سے بچنے کا طریقہ بھی یہی ہے کہ انسان کا ہر فعل اور ہر عمل رضائے خدا کے عین مطابق رہے لیکن میرزا کے نزدیک یہ چیزیں مقصود نہ ہونی چاہئیں چناں چہ وہ فرماتے ہیں:

ایماں اگر بہ خوف و رجا کردم استوار
اخلاص در نمود وفائم دو رُو گرفت

اگر میں خوف اور رجا کی بنا پر ایمان استوار کروں تو اخلاص میں دورَنگی پیدا ہو جائے گی۔ اُردو میں یہ حقیقت ایک اور ہی انداز میں بیان فرمائی۔ کہتے ہیں:

طاعت میں تا رہے نہ مئے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

بہشت کو دوزخ میں ڈال دینے پر اس لیے آمادہ ہو گئے کہ شراب اور شہد نیز دوسری نعمتوں کا ذکر بہشت ہی کے سلسلے میں آیا ہے نہ یہ چیزیں موجود ہوں گی اور نہ کوئی ان کی خاطر بندگی اختیار کرے گا۔

تن پروری اور اسیری:

اغراض سے کاملاً پاک رہنے کی ستایش میرزا کے کلام میں جا بہ جا ملتی ہے مثلاً:

تا نیفتد ہر کہ تن پرور بود
خوش بود گر دانہ نبود دام را

جال بچھا کر اس پر دانے ڈال دیتے ہیں تا کہ ان کے لالچ میں پرندے درختوں سے اتر آئیں اور جال میں پھنسا لیے جائیں۔ میرزا کے نزدیک یہ گرفتاری اور اسیری پرندوں کی تن پروری کا نتیجہ ہے۔ کہتے ہیں کیا ہی اچھا ہو کہ جال بچھائے جائیں تو ان پر دانے نہ ڈالے جائیں تا کہ تن پروروں کے لیے پھنسنے کی کوئی گنجایش باقی نہ رہے جو پھنسیں بے غرضانہ پھنسیں۔

اس کا مطلب صاف الفاظ میں یہ ہے کہ بلند مقاصد کے لیے کام حقیقتاً وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دل میں اپنی ذات کے لیے قطعاً کوئی خواہش نہ ہو۔ خواہشات کے بندے جو کچھ بھی کریں گے ذاتی اغراض کے لیے کریں گے۔ ایسی سرگرمیوں کو مقاصد کی حقیقی اور پُرخلوص کوشش قرار نہیں دیا جا سکتا۔

میرزا کا مسلک:

میرزا کا مسلک یہ ہے:

مخمورِ مکافات بہ خلدو مقر آویخت
مشتاقِ عطا شعلہ زگل باز نہ دانست

جس شخص کو حسن عمل کا غرۃ ہے وہ بہشت و دوزخ کے جھگڑے میں اُلجھ سکتا ہے لیکن جس کی آرزو کا مرکزی نقطہ یہ ہو کہ جو کچھ ذات پاک باری تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو، وہی حقیقی دولت ہے۔ اسے پھول اور شعلے میں امتیاز پیدا کرنے کا خیال کب آ سکتا ہے۔ پھر نعمتوں سے بھرے ہوئے باغ ملیں تو خوش، دہکتی ہوئی آگ کے شعلے میسر آئیں تو خوش۔ عطا کے مشتاق کی نظروں میں ہر شے مرغوب و مطلوب ہی ہو گی نامرغوب یا نامطلوب کبھی نہ ہو گی۔ اس کی پوری دولت نفس عطا ہے جنس عطا پر نظر جا ہی نہیں سکتی۔

پسندیدہ مضامین:

جو مضمون میرزا کو پسند آ جاتا ہے اسے وہ بار بار مختلف صورتوں میں پیش کرتے ہیں اور ہر اندازِ بیان میں اس کے اندر ایک نیا لطف، نئی لذت اور نئی جاذبیت پیدا کر لیتے ہیں۔

مثلاً ان کے نزدیک وہی شے اچھی ہے جس سے گردش و تغیر کی خصوصیت زائل ہو جائے یعنی ایک حالت پر رہے اس میں تبدیلی نہ آنے پائے۔ ایک مقام پر کہتے ہیں:

زینہار از تعب آتش جاوید مترس
خوش بہارے است کزو بیم خزاں برخیزد

دوزخ کے دوامی عذاب سے ڈرنے کا کیا مطلب؟ کیا وہ بہار ہر اعتبار سے قابلِ خیر مقدم نہیں جس میں خزاں کا کوئی خوف باقی نہ رہے؟

فیض عیش نو روزی جاودانہ خوش باشد
روز من ز تاریکی باشبم برابر کن

عیش نوروز میں دوام کی شان پیدا ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔ اے کارفرمائے گردش ایام! میرے دن کو اتنا تاریک بنا دے کہ وہ میری رات کے برابر پہلو مارنے لگے۔

نومیدیِ ما گردشِ ایام نہ دارد
روزے کہ سیہ شد سحر و شام نہ دارد

میری مایوسی میں زمانے کی گردش کا کوئی دخل نہیں۔ ہر لحہ ایک ہی حالت برقرار رہتی ہے ظاہر ہے کہ جو دن سیاہ ہو جائے اس میں شام وسحر کے تغیرات کیوں کر نظر آئیں گے؟

ایک مقام پر کہتے ہیں:

گشتہ در تاریکیِ روزم نہاں
کو چراغے تا بجویم شام را

میری شام دن کی تاریکی میں گم ہوگئی ہے۔ ایسا چراغ کہاں سے ہاتھ آئے جو اس کی جستجو میں معاون بن سکے؟

اب میں تشریحات سے کنارہ کش ہو کر صرف ہم معنی اشعار (کلاًیا جزواً) درج کر دینے پر اکتفا کرتا ہوں:

فارسی: رمز بشناس کہ ہر نکتہ ادائے دارد
محرم آن است کہ رہ جز بہ اشارت نہ رود
اردو: چاک مت کر جیب بے ایام گل
کچھ ادھر کا بھی اشارا چاہیے

☆

فارسی: رسیدہ ایم بہ کوے تو جاے آں دارد
کہ عمر صرف زمیں بوسی قدم گردد

اردو: واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو
صدرہ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہم کو

☆

فارسی: دیگر ز ساز بے خودی ما صدا مجو
آوازے از گسستن تار خودیم ما

اردو: نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

☆

فارسی: بنازم سادگی، طفل است و خونریزی نمی داند
بہ گل چیدن ہماں ذوقِ شمارِ کشتگاں دارد

اردو: ہوائے سیر گل آئینۂ بے مہری قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

☆

فارسی: در آئینۂ ما کہ ناساز بختیم
خطِ عکسِ طوطی بہ زنگار ماند

اردو: کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

☆

فارسی: دہد بہ مجلسیاں بادہ و بہ نوبتِ من
بمن نماید و در انجمن فرو ریزد

اردو: مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

فارسی: لالہ و گل دمد از طرفِ مزارش پسِ مرگ
تاچہا در دلِ غالبؔ ہوس روے تو بود

اردو: مشہد عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
کس قدر یا رب ہلاک حسرت پابوس تھا

☆

فارسی: سرت گردم، بہ زن تیغ و درے برروے دل بکشا
دلم تنگ است، کار از زخم پیکاں بر نمی آید

اردو: نہیں ذریعۂ راحت جراحت پیکاں
وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے

☆

فارسی گریہ کرد از فریب و زارم کشت
نگہ از تیغ آبدارتر است

اردو: کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

☆

فارسی: ناکس ز تنومندی ظاہر نہ شود کس
چوں سنگِ سرمہ کہ گران است و گراں نیست

اردو: قدرِ سنگِ سرمہ رکھتا ہوں
کتنی ارزاں ہے گرانی میری

☆

فارسی: در مژدہ زجوے عسل و کاخ زمرّد
چیزے کہ بہ دل بستگی ارزد مئے ناب است

اردو: وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

☆

فارسی: عہد وفا ز سوے تو نا استوار بود
بشکستی و ترا بہ شکستن گزند نیست

اردو: تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

☆

فارسی: دریوزۂ راحت نتواں کرد ز مرہم
غالبؔ ہمہ تن خستۂ یار است گدا نیست

اردو: جس زخم کو ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
یا رب اسے لکھ دیجیے قسمت میں عدو کی

☆

فارسی: گفتنی نیست کہ بر غالبؔ ناکام چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نہ داشت

اردو: زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

☆

فارسی: کفِ خاکیم از ما بر نہ خیزد جز غبار آنجا
فزوں از صرصری نبود قیامت خاکساراں را

اردو: بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

☆

فارسی:
در آغوشِ تغافل عرض یک رنگی تواں دادن
تہی تا می کند پہلو بہ ما بنمودہ ای جا را

اردو:
تغافل دوست ہوں میرا دماغ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے

☆

فارسی:
اندر آں روز کہ پرسش رود از ہرچہ گذشت
کاش با ما سخن از حسرتِ ما نیز کنند

اردو:
آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

نیز:

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

☆

فارسی:
با تغافل بر نیامد طاقتم لیک از ہوس
در تمنائے نگاہ بے محابایم ہنوز

اردو:
نگاہ بے محابا چاہتا ہوں
تغافلہائے تمکیں آزما کیا

☆

فارسی:
تاخود از بہر نثاری کیست، می میرم زرشک
خضرو چندیں کوشش و عمر دراز آوردنش

اردو:
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے

☆

فارسی: بنائے خانہ ام ذوق خرابی داشت پنداری
کز آمد آمد سیلاب در رقص است دیوارش

اردو: مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

☆

فارسی: اختلاطِ شبنم و خورشیدِ تاباں دیدہ ام
جرأتے باید کہ عرض شوق دیدارش کنم

اردو: پر تو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

☆

فارسی: آغشتہ ایم ہر سرخارے بخونِ دل
قانونِ باغبانی صحرا نوشتہ ایم

اردو: لختِ جگر سے ہے سر ہر خار شاخ گل
تاچند باغبانی صحرا کرے کوئی

☆

فارسی: تاحسن ز بے پردگیِ جلوہ صلا زد
دیدیم کہ تارے ز نقاب است نظر ہم

اردو: نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

☆

فارسی: رنگہا چوں شد فراہم مصرفے دیگر نہ داشت
خلدرا نقش و نگارِ طاقِ نسیاں کردہ ام

اردو: یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہوگئیں

☆

(سہ ماہی اردو - کراچی - غالب نمبر ۱۹۶۹ء - حصہ اول)

میرزا غالبؔ کا فارسی کلام

ما نہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ
شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما!

میرزا غالبؔ کی فارسی شاعری پر مقالہ لکھنا اس اعتبار سے انتہائی خوشی کا باعث ہے کہ اُردو اور فارسی کے ایک بہت بڑے شاعر اور مشرقی دنیا کی شاعری کی ایک غیر معمولی شخصیّت کے معجزہ ہائے فن اہل امریکہ اور دوسرے اہل مغرب کے سامنے پیش کرنے کا موقع ہاتھ آیا لیکن یہ احساس کم حوصلہ فرسا نہیں کہ مقالے کے اکثر مخاطبوں اور خوانندوں کو فارسی شاعری کے بنیادی حقائق، انداز و اسلوب اور روایات و پس منظر سے بہت کم تعارف حاصل ہے۔ اس وجہ سے مقالہ لکھنے والے کا کام خاصا مشکل اور پریشان کن ہو گیا ہے کیوں کہ اس کے لیے وہ سب کچھ بے تکلّف کہہ دینا ممکن نہیں، جو کسی شاعری کے مبادی و مبانی سے آگاہی رکھنے والے کے روبرو کیا جا سکتا ہے۔

بدیہی مشکلات:

بعض امور بالکل بدیہی ہیں۔ مثلاً:

۱۔ مقالہ نگار کے لیے دائرۂ بحث و تحریر شاعر کے صرف ان اشعار تک محدود رکھنا ناگزیر ہو گیا ہے، جن کے مطالب اصل شاعری کے بنیادی امور سے شناسائی کا سہارا لیے بغیر ذہن نشین ہو جائیں اگرچہ شاعر کے فطری کمالات کی جلوہ آرائیاں صرف ان اشعار میں منحصر نہ ہوں۔

۲۔ مسائل بھی وہی زیرِ غور آئیں گے، جن کا تعلق خاص مقامی ماحول سے نہ ہو اور ان کے باب میں ہر ملک اور ہر خطّے کے اہل علم کے سامنے کچھ نہ کچھ تصورات پہلے سے موجود ہوں۔

ظاہر ہے کہ مقالہ نگار کے لیے ان مشکلوں اور پریشانیوں سے عہدہ برآ ہوئے بغیر چارہ نہیں اور جس شاعر کو خاص معنوی جوہروں کی بنأ پر بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو گئی ہے، اس کے افکار

کی دولت و ثروت کو بیرونی دنیا سے روشناس کرنے کے لیے یہ مرحلہ صبر و ہمت ہی سے طے کرنا پڑے گا۔ راستے کی دشواری و ناہمواری کتنی ہی زیادہ ہو مگر اس کی بنا پر کام کی اہمیت سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔

فارسی شاعری اور اہل مغرب:

فارسی زبان شیرینی، دل آویزی اور حسن بیان میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس زبان کی شاعری نے علم و حکمت کے مختلف دائروں میں نہایت اہم کارنامے انجام دیے ہیں۔ انسانیت کے ذہنی و معنوی ارتقاء میں اس شاعری کا حصہ کسی دوسری ترقی یافتہ زبان سے کم نہیں بل کہ زیادہ ہی ہوگا۔ اس کے متعدد گراں بہا گنجینے بہت پہلے مختلف مغربی زبانوں میں منتقل ہو چکے ہیں اور ان پر بین الاقوامی تحسین و قبول کی مُہریں ثبت ہو چکی ہیں۔ رزمیات میں فردوسیؔ و نظامیؔ، حکمیات و تصوف میں سنائیؔ، عطارؔ اور رومیؔ، اخلاقیات میں سعدیؔ، تغزل میں حافظؔ، حقائق میں خیامؔ کی رباعیات اور ابن یمینؔ کے قطعات محتاج ذکر و بیان نہیں۔ ان کے تراجم نے مختلف مغربی ممالک کی شاعری پر گہرا اثر ڈالا، جس کی ایک روشن دستاویز مشہور جرمن شاعر گوئٹے کا ''دیوان'' ہے۔ یورپ اور امریکہ میں گروہ مستشرقین کا سب سے بڑا سرمایۂ تلاش و تحقیق فارسی اور عربی ہی کے دفاتر ادب و حکمت سے متعلق ہے۔ پھر یہی شاعری ہے، جسے دورِ حاضر میں اقبال نے اپنے عالم گیر پیغام حیات کے لیے موزوں تریں سمجھ کر سرود سرائی کے لیے منتخب کیا اور یہ پیغام کسی ایک خطے یا گروہ کے لیے نہیں بل کہ شرق و غرب کے تمام خطوں نیز سفید و سیاہ، احمر و اصغر وغیرہ تمام طبقوں کے لیے، حقیقی اخوت و مساوات، مادّی و معنوی حریّت و آزادی، پایدار و استوار صلح و امن کا پیغام ہے۔ اسی پر انسانیت کی سربلندی، برتری اور درخشاں مستقبل کا انحصار ہے۔

نیا دَور:

امید ہے، فارسی شاعری کے انداز و اسلوب سے تعارف کی کمی میری گزارشات پر دلی توجہ میں رکاوٹ نہیں بنے گی۔ اب انسانیت اس مرحلے پر پہنچ گئی ہے، جس میں زمان و مکان کے فاصلے قریباً ناپید ہو چکے ہیں، جغرافیائی قومیت وطنیت کی تنگ نظری کا طلسم ٹوٹتا جا رہا ہے۔ نسل، خون اور رنگ کے مصنوعی تعصبات کی زنجیروں سے انسانی فطرت آزاد ہو رہی ہے۔ ہر خطے کے باشندوں کی آنکھوں

سے باہم اجنبیت کے وہ سیاہ پردے اُٹھ رہے ہیں، جو دید و وادید میں سنگین دیواروں کی طرح حائل تھے۔ مختلف قوموں کی ذہنی و فکری ثروت اجارہ داری کے بندھنوں سے مخلصی حاصل کر رہی ہے۔ جماعتی اور گروہی ''کلچروں'' کی جگہ ''انسانی کلچر'' کی تعمیر کے محرکات بروئے کار آ رہے ہیں اگر کہا جائے کہ میرزا غالب کی صد سالہ برسی عالمی پیمانے پر منانے کے لیے جو انتظامات جابجا ہو گئے ہیں، انھیں بھی اسی سلسلے کی ایک ابتدائی کڑی سمجھنا چاہیے تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ میرزا غالب خود گنتی کے ان عالمی افراد میں سے تھے، جن کے فکر و نظر میں آفاقیت، عمومیت اور انسانیت کے جوہر زیادہ سے زیادہ کارفرما ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ یہ بین الاقوامی تقریب، جو ایسی متعدد تقریبات کا سنگِ بنیاد ہوگی، عالم انسانیت کے لیے ایک نئے خوش گوار دور کی صبح اوّل بن جائے۔ ہمارے دلوں میں ان بنیادی انسانی مقاصد و عزائم کا گہرا احساس اور انتہائی پُرخلوص تڑپ پیدا کر دے جو ۱۹۱۹ء میں جمعیت اقوام، پھر ۱۹۴۵ء میں انجمن اقوام متحدہ کی تاسیس کا باعث بنے۔ انسانیت لامتناہی صدیوں سے زور و قوت، جبر و تصرف اور قہر و غضب کا شکار چلی آ رہی ہے۔ خدا جانے اس پر سے آگ اور خون کے کتنے سیل گزرے اور تباہی و بربادی کے کتنے طوفان آئے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم سب ایک دوسرے کے قریب بیٹھیں، ایک دوسرے کو سمجھنے سے بہرہ ور ہوں اور ایک دوسرے کے ذہن و قلب سے شناسائی حاصل کریں؟

جہان گیر اخوت اور فراوان محبت:

کسی بھی گھرانے کے مختلف افراد فکر و نظر اور فہم و بصیرت کے اعتبار سے ایک درجے کے نہیں ہوتے۔ ان کے درمیان کم یا زیادہ تفاوت ناگزیر ہے مگر یہ تفاوت ان کے بنیادی ربط و تعلق پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ انسانیت بھی ایک گھرانا ہے، جس کے افراد قومیں اور گروہ ہیں پھر ان کے درمیان فکری یا نظری یا فنّی یا کوئی اور فرق کیوں بنیادی تعلق میں خلل کا باعث ہو؟ دنیا کا امن، انسانیت کی ترقی اور مشترکہ مقاصد کے لیے موثر کارفرمائی کا تقاضا یہی ہے کہ تمام قومیں اور گروہ ایک گھرانے کے افراد کی طرح باہم ہمدردی، ہم آہنگی، خیر خواہی، خیر اندیشی اور ایک دوسرے کی بہبود پر کاربند ہوں۔

یہی مقصود فطرت ہے، یہی رمزِ مُسلمانی
اخوت کی جہاں گیری، محبت کی فراوانی

میرزا غالبؔ کی صد سالہ برسی کے لیے جس تحریک نے خود بخود ایک ہمہ گیر شکل اختیار کر لی، اس کا ایک بدیہی پہلو تو یہ ہے کہ غیر معمولی ذہانت کے ایک مفکر اور ایک بلند پایہ ''عبقری'' (genius) نے دائرۂ شعر میں فکر و نظر اور جذبات و تاثرات کے جو حیرت انگیز کمالات دکھائے ان کا صحیح اندازہ ہر خطّے اور ہر قوم کے افراد کر لیں۔ پھر اس کی بارگاہِ عظمت میں خراجِ عقیدت پیش کریں۔ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ عالم انسانیت کے عظیم القدر اصحابِ فکر کی مشترکہ قدر و منزلت سے وحدت انسانیت کی بنیاد کے لیے تقویت کا سامان بہم پہنچایا جائے۔ تمام انسانی گروہ ماحول، زبان اور اسلوبِ بیان کے اختلافات سے قطع نظر کرتے ہُوئے ایک دُوسرے سے روشناس ہوں، ایک دوسرے سے تعارف حاصل کریں اور ان کے درمیان مختلف قوموں کے افراد ہونے کی حیثیت میں نہیں، انسان ہونے کی حیثیت میں ربط و تعلق کے رشتے مضبوط و مستحکم ہو جائیں۔

خسروؔ اور غالبؔ:

پاک و ہند کی فارسی شاعری کے مختلف اصناف میں بہت سے افراد شہرت و امتیاز کے اعلیٰ مدارج پر پہنچے۔ تاہم جامعیت کے اعتبار سے صرف دو ہی شخصیتیں ہیں، جنھیں یہاں کی فارسی شاعری میں روشنی کے دو بلند مینار سمجھنا چاہیے۔ ابتدائی دور میں امیر خسروؔ (وفات ۱۳۲۵ء) اور آخری دور میں میرزا غالبؔ (وفات ۱۸۶۹ء) اصل و نسل کے اعتبار سے دونوں کا تعلق وسط ایشیا کے ساتھ تھا۔ امیر خسروؔ ''ترک لاچین'' اور میرزا غالبؔ ''ترک ایبک'' تھے۔ گویا پاک و ہند میں فارسی شاعری کا ''زرّیں دور'' ''ترک لاچین'' سے شروع ہوا اور ''ترک ایبک'' پر ختم ہو گیا۔

امیر خسروؔ زندگی کے ہر دور میں معاشی اعتبار سے فارغ البال رہے اور میرزا غالبؔ کی حیات مستعار کے کسی بھی حصّے میں مستقل اطمینان و دل جمعی کا ساز و برگ فراہم نہ ہو سکا۔ تاہم دونوں نے قدرت کے عطا کردہ جوہر یکساں محویت و انہماک کے ساتھ معجزہ ہائے فن کی نمود کے لیے وقف رکھے اور دونوں کی تخلیقات پاک و ہند کی فارسی نظم و نثر (میرزا غالبؔ کے تعلق میں اُردو نظم و نثر بھی) کا نہایت قیمتی سرمایہ ہیں اور انھیں دنیا کی بہترین ادبی تخلیقات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

جامعیت کا مطلب یہ ہے کہ نظم و نثر کے مختلف شعبے اور شاخیں ہیں۔ امیر خسروؔ اور میرزا غالبؔ کی تخلیقات ہر شعبے میں موجود ہیں، خواہ کسی میں ان کی مقدار کم ہو یا زیادہ، تاہم ان کے کامل العیار

ہونے میں کسی کے لیے بھی کلام کی گنجایش نہیں۔ فارسی نثر میرے موجودہ مقالے کے موضوع سے خارج ہے۔ لہٰذا میں اپنی گزارشات محض میرزا کی فارسی شاعری تک محدود رکھوں گا۔ اُردو کا کوئی شعر بطورِ مثال لاؤں گا تو محض اس صورت میں کہ فارسی کے کسی شعر کی توضیح یا توثیق کے لیے اس کا لانا ناگزیر ہو جائے۔

اصنافِ سخن:

فارسی میں شعر گوئی کے متعدد اصناف ہیں۔ مثلاً قطعہ، رباعی، قصیدہ، غزل، ترکیب بند، ترجیع بند، مرثیہ، نوحہ، مثنوی وغیرہ، میرزاؔ کے کلیات فارسی میں ہر صنف کا کلام موجود ہے۔ کل فارسی اشعار دس اور گیارہ ہزار کے درمیان سمجھے جاتے ہیں۔ اُردو کلام نیز اُردو اور فارسی نثر کی کتابیں الگ ہیں۔

میرزاؔ کے فارسی قصائد تعداد میں اکہتر ہیں اور ان کے اشعار کا اندازہ ساڑھے تین ہزار سے اوپر ہے۔ اسی صنف میں میرزاؔ نے سب سے زیادہ شعر کہے۔ قصیدوں میں بادشاہ یا امیر یا مربیِّ شعر و ادب کی مدح بھی ہوتی تھی لیکن حقیقتاً یہ صنف ہر شاعر کے زورِ طبع کی معجز نمائیوں کا خاص میدان سمجھی جاتی تھی اور بڑے بڑے شاعروں نے قصیدوں ہی میں واقعہ نگاری، منظر کشی، حکمت، فلسفے اور تصوف کے دقیق مضامین نیز اپنے کمالاتِ فن اس حسن وخوبی سے بیان کیے کہ یہ صنف فارسی شاعری کا نہایت اہم حصہ بن گئی۔ میرزا غالبؔ کے قصائد میں بھی یہ تمام محاسن بہ کثرت موجود ہیں جن میں سے چند مثالیں آگے چل کر پیش کروں گا۔

میرزاؔ کے فارسی کلام میں دوسرا درجہ غزلیات کو حاصل ہے۔ جنھیں عموماً عشقیہ شاعری سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن جن شاعروں کو قدرت کی طرف سے خاص صلاحیتیں عطا ہوئی تھیں، انھوں نے متفرق عشقیہ مضامین کے علاوہ غزل کو حکمت، فلسفے، اخلاق، تصوف، حقایقِ حیات اور دعوت اصلاح کا دل پذیر مرقع بنا دیا اور فکر کے سمندر سے ایسے بیش بہا موتیوں کے انبار لگا دیے جن کی چمک دمک اور آب و تاب پر زمانے کے تغیرات کوئی ناخوش گوار اثر نہیں ڈال سکتے۔ عالمِ انسانیت کا ذوق، اس کے فکر و نظر کا انداز اور مطلوب و نامطلوب کا معیار ہمیشہ تغیر پذیر رہا اور رہے گا لیکن وہ آب و تاب جیسی سو دو سو یا چار سو سال پیش تر تھی، ویسی ہی آج ہے اور یقین ہے کہ آیندہ بھی ویسی ہی رہے گی۔

اس صنف میں میرزاؔ کے فارسی اشعار کی تعداد ساڑھے تین ہزار کے قریب ہے۔ میرزا کی فارسی

شاعری میں تیسرا درجہ مثنویوں کا ہے، جن کے مجموعی اشعار دو ہزار کے قریب ہیں۔ یہ صنف فارسی میں واقعہ نگاری، منظر کشی، بیان جزئیات اور دعوت مقاصد و عزائم کے لیے نہایت موزوں ہے چوں کہ اس میں قصائد و غزلیات و قطعات کے خلاف ردیف و قافیہ کی مسلسل پابندی کا سوال اٹھ جاتا ہے اور ہر شعر بجائے خود مستقل ہوتا ہے، اس وجہ سے شاعر کے لیے مطالب کے بیان میں خاصی سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔

میرزؔا نے اس صنف میں بھی اربابِ نظر سے کامل العیار ہونے کی سند حاصل کی۔ چوتھا درجہ قطعات کا ہے۔ باقی اصناف کے متعلق یہاں تفصیلی بحث غیر ضروری ہے۔

میرزؔا کی شاعری کا ارتقاء:

تمہیدی مطالب بہت پھیل گئے لیکن جو کچھ میں عرض کرنا چاہتا تھا، وہ اس تفصیل کے بغیر شاید پوری طرح ذہن نشین نہیں ہو سکتا تھا۔ اب اشعار پر بحث شروع کرنے سے پیش تر اختصاراً خود میرزا غالبؔ کی شاعری کے ارتقاء کی مختصر سی کیفیت پیش کرتے ہوئے بتانا چاہتا ہوں کہ ان کے باب میں ممتاز معاصروں یا بعد کے بلند پایہ اصحاب نقد و نظر کی رائے کیا تھی؟

میرزؔا نے کلیات فارسی کے خاتمے میں لکھا ہے کہ میری طبیعت ابتداء ہی سے پسندیدہ و برگزیدہ خیالات کی جویا تھی لیکن آزادہ روی کے باعث ان لوگوں کی پیروی کرتا رہا، جو حقیقی راستے سے واقف نہ تھے۔ جب راہِ راست کے پیش روؤں کو اندازہ ہو گیا کہ مجھ میں ان کے قدم بہ قدم چلنے کی صلاحیت ہے، بہ ایں ہمہ بھٹکتا پھرتا ہوں تو انھیں میرے حال پر رحم آیا اور مجھ پر ''مربیانہ'' نگاہ ڈالی۔

شیخ علی حزیںؔ نے مسکرا کر مجھے بے راہ روی سے آگاہ کیا۔ طالب آملیؔ کی نگاہِ تادیب اور عرفیؔ کے برق خشم نے میرے راہ پیما قدموں میں ناروا جنبش کا مادہ جلا ڈالا۔ ظہوریؔ نے اپنے کلام کی گہرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر پر زادِ راہ باندھا۔ نظیریؔ نے مجھے اپنی روش خاص پر چلنا سکھایا۔ اب اس گروہ فرشتہ شکوہ کے فیض تربیت کی بہ دولت میرا رقاصِ قلم چال میں چکور، راگ میں موسیقار، جلوے میں طاؤس اور پرواز میں عنقا ہے۔

فارسی شاعری میں انقلاب:

مولانا شبلیؔ مرحوم فرماتے ہیں:

> عجب بات ہے۔ ایران کے انقلاب (یعنی شاعری میں) سے اگرچہ ہندوستانیوں کو خبر نہ تھی

لیکن خود بخود یہاں بھی انقلاب ہوا۔ یعنی شاعری کا مذاق جو ناصر علی وغیرہ کی بہ دولت سیکڑوں برس سے بگڑا چلا آتا تھا، درست ہو چلا۔ میرزا غالب نے شاعری کا انداز بالکل بدل دیا۔ ابتدا میں وہ بھی بیدل کی پیروی کی وجہ سے غلط راستے پر پڑ گئے تھے لیکن عرفی، طالب آملی، نظیری اور کلیم کی پیروی نے ان کو سنبھالا چناں چہ دیوان فارسی کے خاتمے میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

میرزا غالب نے قصیدے میں متوسطین اور قدما کی روش اختیار کی اگرچہ قصائد میں متاخرین کی بدعتیں اور خامیاں بھی پائی جاتی ہیں لیکن اخیر اخیر کج پیچ نکل گئے اور بالکل اساتذہ کا رنگ آ گیا...... میرزا غالب کی طبیعت میں نہایت شدّت سے اجتہاد اور جدّت کا مادہ تھا، اس لیے اگرچہ قدما کی پیروی کی وجہ سے نہایت احتیاط کرتے ہیں، تاہم اپنا خاص انداز بھی نہیں چھوڑتے (شعر العجم حصّہ پنجم ص ۲۰-۲۱)۔

معاصرین کے بیانات:

خواجہ حالی نے "یادگار" میں لکھا ہے:

میرزا نے ایک غزل کے مقطع میں اپنے تئیں کم از کم شیخ علی حزیں کا مثل قرار دیا ہے۔

تو بدیں شیوۂ گفتار کہ داری غالب
گر ترقی نہ کنی، شیخ علی را مانی

مومن خاں مرحوم نے جس وقت یہ مقطع سنا، اپنے دوستوں سے کہنے لگے کہ اس میں بالکل مبالغہ نہیں۔ ہم میرزا کو کسی طرح علی حزیں سے کم نہیں سمجھتے...... نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ مرحوم (میرزا کو) ظہوری و عرفی کا ہم پایہ کہا کرتے تھے اور صائب و کلیم وغیرہ سے ان کو بہ مراتب برتر و بالا سمجھتے تھے۔ نواب ضیاء الدین خاں کا میرزا کی نسبت قول تھا کہ ہندوستان میں فارسی شعر کی ابتدا ایک ترک لاچین (امیر خسرو) سے ہوئی اور ایک ترک ایبک (یعنی میرزا غالب) پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ سیّد غلام علی وحشت میرزا کی نسبت کہتے تھے کہ اگر یہ شخص عربیت کی طرف متوجہ ہوتا تو عربی شعرا میں متنبّی یا ابو تمام ہوتا اور انگریزی زبان کی تکمیل کرتا تو انگلستان کے مشہور شاعروں کا مقابلہ کرتا۔

(یادگار غالب ص ۲۸۱-۲۸۲)

ان اقتباسات سے دو حقیقتیں روز روشن کی طرح آشکارا ہیں:

۱۔ میرزا غالب کو قدرت نے اجتہاد و جدّت کی غیر معمولی صلاحیت سے نوازا تھا۔ جہاں ایران کی

فارسی شاعری میں قاآنی نے انقلاب پیدا کیا، وہاں میرزا غالب نے پاک و ہند کی فارسی شاعری کا بگڑا ہوا مذاق درست کیا اور اس کا انداز بالکل بدل ڈالا۔ گویا قاآنی کی طرح میرزا کو بھی فارسی شاعری میں مجدد و مجتہد کی حیثیت حاصل تھی۔

۲۔ میرزا کے جو ہم عصر، فارسی شاعری میں بلند پایے پر فائز تھے، ان کی رائے یہ تھی کہ میرزا کو قدرت نے شعر گوئی کی غیر معمولی صلاحیت عطا کی ہے، وہ فارسی شاعری کے بعض مشہور اساتذہ سے بھی برتر تھے اور اگر عربی پر متوجہ ہوتے تو متنبّی اور ابوتمام کے برابر ہوتے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب مختلف اصنافِ سخن کے متعلق میرزا کے فارسی کلیات نظم میں سے ان تمہیدی اشاروں کے متعلق مثالیں پیش کروں اور یہی میرے مقالے کا اصل موضوع ہے۔ انتخاب کلام میں بھی اس امر کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ وہی شعر لیے جائیں جنھیں کسی مغربی زبان میں منتقل کیا جائے تو ان کا مفہوم خاص تشریحات کے بغیر ذہن نشین کر لینے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

مثنویات، قصائد اور قطعات میں میرزا کے کمالات شعری کا اظہار اکثر و بیشتر مسلسل ہوا ہے۔ غزلیات میں حقائق کے یہ موتی جابجا بکھرے ہُوئے ہیں اگرچہ ان سب میں بھی اک گونہ معنوی ربط و تعلق موجود ہے، جس کا اندازہ کرنے کے لیے ذرا گہری نظر سے کام لینا پڑتا ہے۔ باقی رہیں، رباعیات تو ان کی بنیاد و اساس ہی یہ ہے کہ کوئی ضروری امر اور کوئی ضروری فکر صرف چار مصرعوں میں حسن و خوبی کے ساتھ واضح ہو جائے۔

نظامِ روزگار:

اب میں سب سے پہلے قصائد میں سے مختلف اقتباسات پیش کروں گا۔ ایک قصیدے کی ابتداء نظامِ روزگار پر گفتگو سے ہوئی ہے۔ فرماتے ہیں:

ہست از تمیز گر بہ ہما استخواں دہد
آئینِ دہر نیست کہ کس را زیاں دہد

زمانہ جو کچھ کرتا ہے عقل و تمیز کی بنا پر کرتا ہے۔ اس کا دستور یہ نہیں کہ کسی کو نقصان پہنچائے۔

مرد است مرد، ہرچہ کند، بے خطر کند
راد است راد، ہرچہ دہد، رایگاں دہد

وہ بے باک و جواں مرد ہے۔ جو قدم اٹھاتا ہے، بے خوف و خطر اٹھاتا ہے۔ ساتھ ہی سخی اور کریم بھی ہے جو کچھ بھی کسی کو دیتا ہے، مفت دیتا ہے۔

گلزار را اگر نہ ثمر، گل بہم نہد
درویش را اگر نہ سحر، شام ناں دہد

باغوں میں پھل نہ ہوں گے تو پھول ضرور ہوں گے اور درویش کو صبح کے وقت نہیں تو شام کے وقت روٹی ضرور مل جاتی ہے۔

گنجِ سخن نہد بہ نہاں خانۂ ضمیر
و انگہ کلیدِ گنج بدستِ زباں دہد

سخن وری کے خزانے ضمیر کے نہاں خانے میں رکھ دیتا ہے اور ان خزانوں کی کنجی زبان کے حوالے کر دیتا ہے یعنی ان خزانوں کے جواہر پارے زبان کے ذریعے سے لٹائے جاتے ہیں۔

تا روزگار تیرہ نہ گردد ز رشکِ چرخ
رخشانیِ ستارہ بہ ریگِ رواں دہد

آسمان دن کو سورج کی روشنی سے منوّر رہتا ہے۔ رات کو اس پر بے شمار ستاروں کی قندیلیں روشن ہو جاتی ہیں۔ اندیشہ تھا کہ زمین آسمان پر رشک کھا کر جل نہ اُٹھے، لہٰذا ریگِ رواں کے ذرّوں کو ستاروں کی سی رخشانی دے دی گئی۔

تا آدمی ملال نہ گیرد زیک ہوا
سرما و نوبہار و تموز و خزاں دہد

اگر موسم کا ایک ہی رنگ اور ہوا کا ایک ہی ڈھنگ رہتا تو انسان اکتا جاتے کیوں کہ ماحول کی یکسانی طبیعت میں افسردگی و پژمردگی پیدا کر دیتی ہے۔ اس کی یکسانی کو ختم کرنے کے لیے موسم بنا دیے گئے۔ سردی آتی ہے تو ہر شے ٹھٹھر جاتی ہے۔ بہار پھولوں کے قافلے ساتھ لے کر نمودار ہوتی ہے۔ گرمی کی حدت سے پھل پک جاتے ہیں۔ غرض موسموں کا تغیّر انسانوں کے لیے رفع ملال اور انشراح خاطر کا سامان ہے۔

ہم در بہار گل شگفاند چمن چمن
تا راحت مشام و نشاط رواں دہد

بہار کے موسم میں کثرت سے پھول کھلتے ہیں جن کی خوشبو قوت شامہ کے لیے راحت و سرور کی بشارت ہوتی ہے۔

ہم در تموز میوہ فشاند طبق طبق
تا آرزوے کام و مرادِ دہاں دہد

گرمی کی فصل میں پھل بہ کثرت پک جاتے ہیں جو کام و دہن کی مرادیں اور آرزوئیں پوری کرتے ہیں۔

آں راکہ بخت دسترس بذل مال نیست
طبعِ سخن رس و خرد خردہ داں دہد

جو شخص مال و زر لٹانے کی دسترس سے محروم ہوتا ہے، اسے بات کی تہ تک پہنچ جانے والی طبیعت اور باریکیوں کا سراغ لگا لینے والی عقل دے دی جاتی ہے۔

آں راکہ طالعِ کفِ گنجینہ پاش نیست
نعم البدل ز خانۂ پرویں فشاں دہد

جس فرد کے پاس خزانے بخشنے اور لٹانے والا ہاتھ نہیں ہوتا، اسے قدرت کی طرف سے ایسا قلم مل جاتا ہے، جو ستارے برسائے۔

زر و مال بہت بڑی چیز سہی لیکن ذہنی، فکری اور علمی کمالات کی ثروت کا پایہ بہت بلند ہے۔ خزانوں کے مالکوں کا ذکر صرف صفحات تاریخ پر رہ گیا لیکن اہل کمال کی یاد سے انسانی محفلوں کو دائمی رونق و تازگی حاصل ہے۔

چوں جنبش سپہر بہ فرمانِ داور است
بیداد نبود آنچہ بما آسماں دہد

جب زمانے کی حرکت و جنبش خدا کے ہاتھ میں ہے اور خدا سراپا عدل و انصاف ہے تو جو کچھ کسی کو مل رہا ہے اسے ظلم نہیں کہا جا سکتا بل کہ عین عدل و انصاف ہے:

رنگ از گل است، سایہ زنخل و نوا زِ مرغ
ہر جا بہار، ہرچہ بود در خور، آں دہد

پھولوں کی رنگ آرائیاں ہماری آنکھوں کے لیے طراوت کا سرچشمہ ہیں۔ درختوں کے سایے میں ہم راحت پاتے ہیں۔ پرندوں کی ترانہ ریزیاں ہمارے قلب و روح کے لیے بہشت سرور ہیں۔ بہار آتی ہے تو جس شے کے لیے جو خصوصیات مناسب حال ہوتی ہیں، اسے مل جاتی ہیں:

در نشرِ نفحہ قرعہ بنامِ ہوا زند
در نشوِ سبزہ حکم بہ آبِ رواں دہد

خوشبو کو بکھرنا چاہیے تاکہ فضا معمور ہو جائے۔ قدرت یہ کام ہوا کے حوالے کر دیتی ہے۔ سبزے کی نشوونما کے لیے شادابی و سیرابی درکار ہے، قدرت کی طرف سے یہ کام آبِ روان کے سپرد ہو جاتا ہے۔

شاعر کا اصل وظیفہ یہ ہے کہ اپنے مشاہدات کو الفاظ کا دل آویز اور پُر تاثیر لباس پہنا دے تاکہ جو اثرات اس کے قلب پر مرتب ہوئے، وہ ہر قلب کے اندر اسی انداز میں اُتر جائیں۔ شاعر نے نظام روزگار کے اصول و ضوابط کی کارفرمائی دیکھی اور اس کا زیادہ سے زیادہ دل نشین نقشہ پیش کر دیا، جو ہر پہلو سے معقول اور یقین افروز ہے۔ اس میں ہر شے اپنا اپنا مقررہ وظیفہ خاص ترتیب سے ادا کر رہی ہے لیکن سوچیے کہ ایک بالغ نظر حکیم اور حقیقت شناس فلسفی بھی اس کے سوا کیا کہے گا، جو شاعر نے کہہ دیا؟ وہ بھی تو اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ جب سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے، اس کا نظام ایک نہج اور ایک ڈھنگ پر جاری ہے اور اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔ انسانوں نے اپنے مرغوبات کے مطابق بے شمار چیزیں پیدا کر لیں۔ یہ بھی اس امر کا ثبوت ہے کہ اصل نظام میں تغیّر و تبدّل امکان سے باہر تھا۔ جو نئی چیزیں انسان نے اختراع کیں وہ بھی دراصل نظامِ روزگار ہی کی پیروی پر مبنی تھیں۔ اس کے سوا انھیں کیا کہا سکتا ہے؟

دیدہ ور اور دیدہ وری:

حقائق حیات و کائنات کا اندازہ ہر شخص نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے دیدہ وری اور بصیرت خاصہ درکار ہے، جو ہر دل و دماغ کو نصیب نہیں ہوتی۔ انسان نے اب تک ارتقاء کی جتنی منزلیں طے کیں، وہ دیدہ وری ہی کی رہنمائی میں طے ہوئیں اور اب بھی روئے زمین کے گوشے گوشے میں دیدہ وروں ہی کی

جماعتیں زندگی کے مختلف دائروں کے اندر رات دن مصروفِ کار فرمائی ہیں۔ میرزا غالبؔ کی شاعری کا ایک اہم موضوع دیدہ وری اور بصیرت خاصہ بھی ہے۔ خواہ اس کا تعلق مادیات سے ہو، جسے اہلِ مغرب نے کمال پر پہنچایا۔ خواہ ماورائے مادیات سے ہو، جس میں اہل مشرق معجز نمائی کی اوج گاہوں پر پہنچے۔ اس کی مثالیں میرزاؔ کے اشعار میں جا بجا ملتی ہیں۔ ایک قصیدے کی تشبیب میں فرماتے ہیں:

رہروان چوں گہر آبلۂ پا بینند
پاے را پایہ فراتر ز ثریا بینند

حقائق شناسی کے مرحلے طے کرنے والے دیدہ ور جب دیکھتے ہیں کہ تیز چلتے چلتے ان کے پاؤں چھالوں سے بھر گئے تو یہ چھالے انھیں آسمان کے ستاروں سے بھی زیادہ درخشاں نظر آتے ہیں۔

تسخیرِ کائنات اور ارتقاے حیات کے لیے جد و جہد اور تگ و دو معمولی کام نہیں۔ اس کے لیے خدا جانے کیا کیا محنتیں اور مشقتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ پاؤں کا آبلہ زار بن جانا اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ انھوں نے حقیقت حقہ تک رسائی کے لیے ہر زحمت و مشقت صبر و ہمت سے برداشت کی پھر ان آبلوں کو ستاروں پر کیوں برتری حاصل نہ ہو؟

ہرچہ در دیدہ عیاں است نگاہش دادند
ہرچہ در سینہ نہاں است ز سیما بینند

دیدہ وروں کی نظر ظاہر و باطن دونوں پر ہوتی ہے جو کچھ ظاہر ہے یعنی ”آفاق“ وہ تو سامنے ہے ہی، جو کچھ اندر چھپا ہوا ہے یعنی ”انفس“ اس کا اندازہ بھی وہ دُور بینی اور حقیقت شناسی کی بنا پر کر لیتے ہیں۔ سائنس دان علمی بصیرت اور دیدہ وری ہی کی بنا پر تحقیق و تجربہ میں مصروف رہے ورنہ فطری قوت کے اس بے پناہ ذخیرے پر کیوں کر پہنچتے جسے جوہری قوت کہا جاتا ہے:

دور بینانِ ازل، کوریِ چشم بد بیں
ہم دریں جانگرند، آنچہ دراں جابینند

جو لوگ ازلی دُور بینی کا جوہر لے کر پیدا ہوئے وہ جو کچھ ”یہاں“ یعنی عالم مجاز میں دیکھتے ہیں اس کا معائنہ ”وہاں“ یعنی عالم حقیقت میں بھی کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مجاز و حقیقت میں گہرا تعلق ہے۔ کائنات کی کوئی بھی شے جوہرِ حیات سے محروم نہیں خواہ عام نگاہیں اس کی نوعیت کا اندازہ کر سکیں یا نہ کر سکیں۔

راز زیں دیدہ وراں جوی کہ از دیدہ وری
نقطہ گر در نظر آرند، سویدا بینند

راز کی باتیں انھیں دیدہ وروں سے پوچھنی چاہئیں، جن کے سامنے نقطہ آتا ہے تو اسے نقطہ نہیں بل کہ کسی شے کا قلب بے تاب سمجھتے ہیں، جس میں زندگی کا اضطراب موجزن ہوتا ہے۔

راہ زیں دیدہ وراں پرس کہ در گرم روی
جادہ چوں نبض تپاں در تنِ صحرا بینند

راستے کا پتا انھیں دیدہ وروں سے لینا چاہیے جو خود منازلِ ارتقا طے کرنے میں مصروف تگ ودو ہیں اور صحراؤں کے اندر راستے انھیں اس طرح نظر آتے ہیں جس طرح زندہ انسانوں کی نبض متحرک ہوتی ہے۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ دیدہ وروں ہی نے بے شمار نئے دائروں میں راستے ہم وار کیے جہاں پہلے کسی قدم کا نشان تک نہ تھا؟

علم ونظر کی تخلیقات کے جو مرقعے ہمارے سامنے ہیں، ان کی حقیقی حیثیت اس کے سوا کیا ہے کہ کوئی صاحبِ نظر اٹھا اور اس نے بہ ظاہر بے جان و بے حقیقت سی چیزوں پر تجربے کرتے کرتے عجائبات کی نئی دُنیا پیدا کرلی:

شررے را کہ بہ ناگاہ بدر خواہد جست
زخمہ کردار بہ تارِ رگِ خارا بینند

ساز کے تاروں پر مضراب لگے تو نغمے نکلتے ہیں۔ پتھر میں بہ ظاہر کسی آواز وآہنگ کی صلاحیت معلوم نہیں ہوتی لیکن دیدہ ور رگ سنگ پر علم ونظر کا زخمہ لگاتا ہے اور اس میں سے چنگاریاں نکلتی ہیں۔ یہی چنگاریاں پتھر کا جوہر اور نغمۂ حیات ہیں۔ یہ نغمے صرف دیدہ ور دیکھ سکتا ہے۔

قطرۂ را کہ ہر آئینہ گہر خواہد بست
صورتِ آبلہ بر چہرہ دریا بینند

جس قطرے میں موتی بن جانے کی صلاحیت موجود ہو، وہ دیدہ وروں کو سمندر کی سطح پر اس طرح نظر آجاتا ہے۔ جس طرح کسی کے چہرہ پر آبلہ دیکھا جاسکتا ہے۔

شام در کوکبۂ صبح نمایاں نگرند
روز در منظرِ خفاش ہویدا بینند

دیدہ ور صبح کی سواری کے جلوس میں شام کو نمایاں دیکھتے ہیں۔ چمگادڑ کو دن کی روشنی میں کچھ نظر نہیں آتا اس کی نگاہیں صرف رات کی تاریکی میں کام دیتی ہیں لیکن دیدہ ور چمگادڑ کی نگاہوں سے دن کا اندازہ کر لیتے ہیں۔

ہماری دُنیا عالمِ اضداد ہے یہاں دن کے ساتھ رات، گرمی کے ساتھ سردی موجود ہے۔ عالمِ اضداد میں ایک پہلو سے طبیعت معاً مخالف پہلو کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ یہ بھی دیدہ وری ہی کا ایک کرشمہ ہے۔

خون خورند و جگر از غصہ بہ دنداں گیرند
خویش را چوں بہ سرِ مائدہ تنہا بینند

دیدہ وروں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ جو کچھ مسلسل سعی و کوشش اور تگ و دو سے ان کی دسترس میں آتا ہے، اس سے تنہا محظوظ و متمتع ہونا انھیں قطعاً گوارا نہیں۔ وہ حقائق مادی ہوں یا روحانی، انھیں وہ ہر فرد تک پہنچانے اور اپنی مساعی کے نتائج عام کرنے کے لیے مضطرب رہتے ہیں یعنی جب دیدہ ور اپنے آپ کو دسترخوان پر تنہا دیکھتے ہیں تو غصّے سے اپنا جگر دانتوں میں دباتے ہیں اور خون پیتے ہیں۔

قطرۂ آب بہ لب بوسۂ نشتر شمرند
پارۂ ناں بہ گلو ریزۂ مینا بینند

پانی کا قطرہ اس حالت میں ان کے لبوں کو چھوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ نشتر لبوں پر رکھ دیا گیا۔ روٹی کا نوالہ حلق میں جاتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ نوالہ نہیں شیشے کا ریزہ ہے۔ یہ ان کی حب بنی نوع کا ایک روشن ثبوت ہے۔

ہر چہ در سو نتواں یافت بہ ہر سو یابند
ہر چہ درجا نتواں دید بہ ہر جا بینند

پھر دیدہ وروں کی شان یہ ہے کہ جو چیز کہیں نظر نہیں آتی، وہ انھیں تمام اطراف میں ملتی ہے، جو شے کہیں پائی نہیں جاتی، وہ انھیں ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔

دیدہ وری کے تعلق میں میرزا نے بعض نہایت اہم شعر کہے ہیں۔ مثلاً ایک غزل میں فرماتے ہیں۔

دیدہ ور آنکہ تا نہد دل بہ شمار دلبری
در دلِ سنگ بنگرد رقصِ بتانِ آزری

دیدہ ور وہ ہے جو فطرت کے ممکنات کا اندازہ لباس وجود میں ظہور پذیر ہونے سے پیش تر ہی کر لے۔ بت اور مجسمے اور مورتیاں پتھر تراش کر بنائی جاتی ہیں۔ دیدہ ور پتھروں کے دل میں حسین و جمیل مورتیوں کو رقص کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔

اگر کہیں سنگِ مرمر کی کوئی سِل پڑی ہو تو عام لوگ اسے محض سل سمجھ کر بے پروایانہ گزر جائیں گے یا اس سے ایسے کام لیں گے، جنھیں بُت سازی سے کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً اسے اٹھا کر کسی دیوار میں لگا لیں گے۔ دہلیز کے سامنے رکھ دیں گے تاکہ پاؤں رکھ کر بہ آسانی اندر داخل ہو جائیں یا باہر نکلیں، مگر دیدہ ور فن کار کی نگاہیں اس سل میں بت یا مورتی کو دیکھ لیں گی اور وہ سل کو تراش کر ایسی مورتی تیار کر لے گا، جسے دیکھتے ہی ہر شخص پر حیرت طاری ہو جائے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سل میں مورتی پہلے سے موجود تھی۔ فن کار نے اس کے وہ حصے چھیل چھال کر صاف کر دیے جو اس مورتی کو چھپائے ہُوے تھے اگر دیدہ وری فن کار کی رہنمائی نہ کرتی تو سل کی تراش خراش میں وقت و قوت صرف کرنا دانش مندی کے منافی سمجھا جاتا۔

میکائیل آنجلو کا قول ہے کہ مجسمہ ساز بت کو مرمر تراش کر نہیں بناتا بل کہ درحقیقت بت ابتداء ہی سے پتھر میں موجود ہوتا ہے صرف جلوہ نمائی کا منتظر و متقاضی رہتا ہے۔ استاد کامل پتھر کی عارضی چادر اٹھا دیتا ہے اور بُت سب کے سامنے آ جاتا ہے۔

ہلالِ عید کی تشبیہیں:

میں نے صرف دو مثالوں پر قناعت کی۔ میرزا کے تمام قصائد میں برابر علم و حکمت اور حقائق تصوف کی بحثیں ہیں۔ بادشاہوں کے قصیدے نوروز اور عیدین یا خاص تقریبات پر کہے جاتے تھے۔

نوروز سے مراد ایرانی نوروز ہے، جو آغاز فصل بہار میں ہوتا تھا۔ مختلف قصیدوں میں موسم بہار، موسم زمستاں یا صبح کے مناظر بھی ایسے انداز میں پیش کیے گئے ہیں کہ موقع اور ماحول کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے جو مصوّر کے موقلم سے زیادہ جامع اور دل آویز ہے۔ مصوّر تمام کیفیات خطوں اور رنگوں کے ذریعے سے پیش کرتا ہے۔ شاعر ہر نقشے کے لیے الفاظ سے کام لیتا ہے جن میں خطوں اور رنگوں سے بدرجہا زیادہ قوت اظہار و ابلاغ ہوتی ہے۔

عیدوں میں سے عیدِ شوال کو مسلمانوں کے ہاں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے کیوں کہ یہ عید ماہ رمضان کے اختتام پر آتی ہے، جسے نزول قرآن کا جشن سمجھنا چاہیے اور اس کتاب الٰہی کے نزول کا آغاز ماہِ رمضان ہی میں ہوا تھا۔ میرزاؔ نے ایک قصیدے میں عیدِ شوال کے ہلال کی تشبیہات نظم کی ہیں۔ ان کی کیفیت بھی ملاحظہ طلب ہے:

گر ماہِ نو بہ ابروے جاناں برابر است
کو جنبشے؟ کہ گفتہ شود ہاں برابر است

اگر ہلالِ عید کو محبوب کی ابرو کے برابر قرار دیتے ہو تو سوال یہ ہے کہ محبوب کی ابرو سے تو طرح طرح کے اشارے سرزد ہوتے ہیں، ہلال میں ابرو کے ہم شکل ہونے کے باوصف جنبش کہاں ہے کہ مان لیا جائے، وہ واقعی ابروے محبوب کے برابر ہے؟

یا رب جبینِ کیست کہ از بس بہ سجدہ سود؟
باقی بہ ابروے مہِ کنعاں برابر است

یہ کس کی پیشانی ہے جو سجدوں میں گِھس گِھس کر گھٹتے گھٹتے ماہ کنعان یعنی حضرت یوسفؑ کی ابرو کے برابر رہ گئی ہے؟

چوں مہ شود بگوئی کہ ماند ہمے بہ گوی!
در پیکرِ ہلال بہ چوگاں برابر است

جب ماہِ نو پورا چاند بن جاتا ہے تو گیند کا ہم شکل ہوتا ہے جس سے چوگان (پولو) کھیلتے ہیں تاہم ہلال کی صورت میں وہ چوگان سے مشابہ ہوتا ہے یعنی اس ڈنڈے (Stick) سے جو پولو کھیلنے میں کام آتا ہے اور جس کی وجہ سے کھیل کا نام چوگان مشہور ہوا۔

در شب چراتہی است، بہ روز ار پدید نیست
چوں ماہِ نو بہ طاقِ شبستاں برابر است

ماہِ نو دن کو تو نظر نہیں آتا اگر اسے کسی امیر کی شب باشی کے ایوان کا طاق (محرابی ڈانٹ) کہا جائے تو رات کے وقت یہ خالی کیوں ہے؟

نی نی ازیں کہ ہیچ نہ دارد ز نقل ومی!!
گوئی بہ طاقِ کلبۂ احزاں برابر است

نہیں یہ شبستان کا طاق نہیں کیوں کہ اس میں نہ شراب ہے اور نہ نقل ہے۔ ہاں اسے کسی غریب و مسکین کی جھونپڑی کا طاق کہہ لیجیے جس کے پاس سرور و نشاط کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔

زیں سیمیا کہ زورق سیمیں دود برآب
ہر کوکبے بدیدۂ حیراں برابر است

سیمیا کے زور سے ایک رُپہلی کشتی پانی پر دوڑتی نظر آتی ہے جسے دیکھ کر ہر ستارہ حیرت زدہ آنکھ معلوم ہوتا ہے۔

سیمیا ایک علم تھا جس سے موہوم اور بے وجود چیزیں بھی موجود نظر آنے لگتی تھیں، شاعر نے نیلگوں آسمان کو سمندر اور ہلال کو رُپہلی کشتی قرار دیا ہے جو سیمیا کے زور سے دوڑتی چلی جا رہی ہے۔

بالائے طفلِ یک شبہ در خم ز راستی
با قامتِ خمیدۂ پیراں برابر است

اگرچہ ہلال صرف ایک رات کا بچہ ہے لیکن دیکھیے، اس کا قد جھک کر خمیدہ پشت بوڑھوں کی مانند ہو گیا ہے۔

وقتی کہ از گرانی بار ثمر خمد
باشاخ نخلۂ ثمر افشاں برابر است

ہلالِ عید پھل والے درخت کی اس شاخ سے مشابہ ہے، جو پھل کے بھاری بوجھ سے جھک جایا کرتی ہے۔

چوں آسماں ہر آئینہ ماند بہ پیلِ مست
ایں باکجک بہ ہیئت و عنواں برابر است

آسمان ہر لحاظ سے ایک مست ہاتھی معلوم ہوتا ہے اور ہلال کی حیثیت کجک یعنی آنکس (Goad) کی ہے جس سے مہاوت ہاتھی کو قابو میں رکھ کر چلاتا ہے۔

محرابِ مسجد است، بیاتا ادا کنیم!!!
آں طاعت قضا کہ بہ تاواں برابر است

نہیں، ہلال دراصل محراب مسجد ہے، آؤ، جو عبادت ہم وقت پر نہ ادا کر سکے اور وہ ہمارے ذمّے چلی آتی ہے، اسے ادا کر کے فارغ ہو جائیں۔

باپشتِ کوز و نعلِ سمند و رکابِ رخش
در پیش گاہِ مردِ ادا داں برابر است

جو شخص حقیقت شناس ہے اس کے نزدیک ہلال عید کبڑے کی پشت یا گھوڑے کے نعل اور رکاب سے مشابہ ہے۔

ایں نیم دائرہ کہ فرو ریخت کلک صنع
بانصف طوق و دور گریباں برابر است

صنعت گرِ قدرت کے قلم نے جو یہ نیم دائرہ کھینچ دیا ہے یہ اس زیور سے ملتا جلتا ہے جو عورتیں گلے میں پہنتی ہیں یا اُسے کُرتے کے گریبان کا گھیر کہنا چاہیے۔

بردستِ شاہ تیغ و کماں راست جایگاہ
باتیغ و باکمان بچہ برہاں برابر است

ہلال کو تلوار اور کمان سے کیوں کر تشبیہ دیں؟ یہ دونوں چیزیں تو بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتی ہیں اور ہلال ہاتھ میں نہیں۔

دانم نہ تیغ مصقلۂ تیغ بادشاست
نشگفت گر بہ تیغ بدیں ساں برابر است

میں سمجھتا ہوں کہ ہلال تلوار نہیں، بل کہ بادشاہ کی تلوار کو صیقل کر کے چمکانے کا آلہ ہے اگر اس وجہ سے اسے تلوار کہہ لیں تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔

زمانۂ ماضی میں تلواروں کو صیقل کرنے کے لیے ایک آلہ استعمال کرتے تھے جسے ''مصقلہ'' کہتے تھے یعنی آلہ صیقل۔

ذاتی کمالات کے ترانے:

قصیدوں میں ایک خاص چیز یہ ہوتی تھی کہ شاعر اپنے کمال فن اور عظمت کے مختلف پہلو نہایت پُرتاثیر انداز میں پیش کرتا تھا۔ میرزا کے قصائد میں بھی ایسی مثالیں جا بجا ملتی ہیں: مثلاً

بچشمِ کم منگر گرچہ خاکِ راہِ تو ام
کہ آبروے دیارم دریں خلافت گاہ

اے بادشاہ اگرچہ میری حیثیت تیرے راستے کی خاک کی سی ہے مگر مجھے حقیر و بے حیثیت نہ سمجھ۔ میں مرکز میں بیٹھا پوری سلطنت کے لیے عزّت وآبرو کا سرمایہ ہوں۔

کمال بیں کہ بدیں غصہ ہاے جاں فرسا
ہنر نگر کہ بدیں فتنہ ہاے طاقت کاہ

اگرچہ میں جان کو گھلا دینے والے غموں میں ڈوبا ہوا ہوں مگر میرے کمال پر نظر ڈال۔ گوناگوں فتنے میری طاقت وقوت کھا گئے لیکن میری ہنروری کی حقیقی حیثیت کا اندازہ فرما۔

مربیِ سخنم من بہ مایہ داریِ فکر
ز نطق من بودش عیش ہاے خاطر خواہ

میں فکر کی گراں بہائی سے سخنوری کی پرورش میں مصروف ہوں۔ میرے کلام میں طرح طرح کے خاطر خواہ نمونے موجود ہیں۔

عبارتم بہ طراوت چو لالہ در بستاں!!
معانیم بہ لطافت چو بادہ در دی ماہ

میری تحریر میں ایسی طراوت وشادابی ہے، جیسی گل لالہ کے چہرے پر صحن باغ میں رقصاں نظر

آتی ہے، میرے معانی میں ایسی لذت ولطافت ہے، جیسی سخت سردی کے موسم میں شراب پا لینے اور پی جانے سے حاصل ہوتی ہے۔

بہ اخذِ فیض ز مبدء فزونم از اسلاف
کہ بودہ ام قدرے دیر تر در آں درگاہ

میں نے فیض کے ازلی سرچشمے سے پیش روؤں کے مقابلے میں زیادہ فائدہ اٹھایا ہے کیوں کہ میں اس سرچشمے کے کنارے زیادہ عرصہ تک مقیم رہا ہوں۔

نزولِ من بہ جہاں بعد یک ہزار و دویست
ظہورِ خسؔرو و سعدؔی بہ شش صد و پنجاہ

دنیا میں میرا نزول ایک ہزار دو سو سال (ہجری) کے بعد ہوا۔ سعدؔی اور خسؔرو کا ظہور چھ سو پچاس میں ہوا تھا۔

میرؔزا کا سال پیدائش سن ہجری کے اعتبار سے ۱۲۱۲ ہے (مطابق ۱۷۹۷ء)۔ سعدؔی کی تاریخ پیدائش تخمیناً ۶۰۶ ھ (مطابق ۱۲۰۹ء) اور امیر خسرو کی ۶۵۱ ھ (مطابق ۱۲۵۳ء)۔ میرزا کے کہنے کا مدعا یہ ہے کہ میں سعدؔی و خسؔرو کے مقابلے میں مزید چھ سو سال تک فیض ازلی سے مستفید ہوتا رہا۔

تیغ و قلم:

ایک اور قصیدے میں کہتے ہیں:

بلند پایہ سرا گرچہ من سخن سنجم
و لیک پیشۂ آبا بہ عالمِ اسباب
سپہبدی بد و ز افراسیاب تا پدرم
ہماں طریقۂ اسلاف داشتند اعقاب

اے بلند مرتبے والے امیر اگرچہ میری زندگی کا مشغلہ شعر گوئی ہے لیکن میرے آباؤ اجداد کا پیشہ سپہ گری و سالاری تھا۔ افراسیاب سے میرے والد ماجد تک تمام اخلاف یکے بعد دیگرے اسی پیشے پر کار بندر ہے۔

دلاوران نگری تاپشنگ پشت بہ پشت
بہ پیش گاہِ تو چوں خویش را شوم نسّاب

اگر میں آپ کے سامنے اپنا نسب نامہ بیان کرنے لگوں تو افراسیاب کے باپ پشنگ سے میرے والد ماجد تک دلاوروں اور جوان مردوں کی صفیں آراستہ ہو جائیں۔

من آں کسم کہ بہ توقیعِ مبدَ فیاض
شہِ قلمروِ نظمم دریں جہانِ خراب

میں وہ ہوں، جس کے لیے فیض ازلی کے مرکز سے فرمان جاری ہوا اور کشور شعر کی بادشاہی عطا ہو گئی۔

ہمی کنم بہ قلم کار تیغ و ایں کارے است
شگرف و نغز و پسندیدۂ اولوا الالباب

میں قلم سے تلوار کا کام انجام دے رہا ہوں۔ یہ ایسا کام ہے جو اہل عقل و دانش کے نزدیک عمدہ، زیبا اور پسندیدہ ہے۔

طالع ہنر کی سیہ روزی:

بعض مقامات پر تو یہ ترانہ ریزیاں ایسی شکل اختیار کر گئی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے، ایک دریا بے خودانہ مستی کے عالم میں لہریں لیتا ہوا چلا جا رہا ہے اور لہروں سے بے اختیار دل نشیں نغمے اور دل دوز نوحے اٹھ رہے ہیں جن کے کیف و سرور اور سوز و گداز کا صحیح اندازہ اصل فارسی ہی میں ہو سکتا ہے۔ مثلاً:

ہزار زمزمہ دارم، ہمیں نہ یک سخن است
کہ چوں تمام شود، آں سخن ز سر گویم

میرے سرمایہ شعر و سخن میں ایک ہی بات نہیں کہ جب وہ پوری ہو جائے تو اسے از سرِ نو دہرانے لگوں؟ اس ساز میں ہزاروں نغمے ہیں۔

زبانہ وار زبانم شرر فشاں گردد
اگر براہ حدیث تفِ جگر گویم

میرا جگر جس حرارت سے پھنکا جارہا ہے اگر اس کی کیفیت بیان کروں تو زبان سے شعلوں اور چنگاریوں کا طوفان بپا ہو جائے۔

شود رکابِ تگاور بہ آب ناپیدا
اگر روانی سیلاب چشم تر گویم!!

میری آنکھوں سے جو سیلاب بہا چلا جارہا ہے اگر اس کی روانی کا ذکر کروں تو اسپ سوار کی رکابیں پانی میں ڈوب جائیں۔

بہ کُلبہ ام گہرِ شب چراغ خس پوش است
سخن ز تیرگیِ طالعِ ہنر گویم

میں کمال ہنر کی تیرہ روزی کا حال بیان کرتا ہوں، میری جھونپڑی میں وہ بیش بہا گوہر موجود ہے جس کی درخشانی رات کے اندھیرے میں چراغ کا کام دیتی ہے کیوں کہ اس سے ہر طرف روشنی پھیل جاتی ہے لیکن گھاس پُھوس نے اس بیش بہا گوہر کو چھپا رکھا ہے۔

من آں نیم کہ بہ ہنگامۂ سخن سازی
گہے ز خاور و گاہے ز باختر گویم

میں ایسا شخص نہیں کہ مشرق و مغرب کی داستانیں چھیڑ کر سخن طرازی سے ہنگامہ بپا کردوں۔

سخن نہال نو و کہنہ باغباں غالبؔ
نہال را بہ نوی مژدۂ ثمر گویم!!

شاعری نیا پودا ہے، غالبؔ سن رسیدہ اور تجربہ کار باغبان ہے۔ میں اس پودے کو تازہ کاری ہی کے دور میں ثمر وری کی خوشخبری سنا رہا ہوں۔

طریق وادی غم را کسے نہ بودہ رفیق
خود از صعوبتِ ایں راہِ پُر خطر گویم

وادیِ غم کے سفر میں کوئی میرا رفیق اور ساتھی نہ تھا، جو راستے کے خطروں کی کیفیت بیان کرسکتا۔ اب خود ہی یہ مصیبت خیز داستان سنا رہا ہوں۔

در آں دیار کہ گوہر خریدن آئیں نیست
دکاں کشودہ ام و قیمتِ گہر گویم

جس سرزمین میں بیش بہا گوہروں کی خریداری کا رواج و دستور نہیں، میں نے وہیں دکان قائم کر رکھی ہے اور گوہروں کی قیمت بتا رہا ہوں۔

فارسی میں ایسی بے تکلف، پُر تاثیر، عین حقیقت پر مبنی اور رواں دواں شاعری کی مثالیں بہت ہی کم ملیں گی۔

چار آرزوئیں:

ایک قصیدے میں اپنی آرزوؤں کا نقشہ اختصاراً یوں کھینچا ہے:

بخدائے کہ دادہ از پے رزق
کبک را بال و باز را چنگال

اس خدائے پاک کی قسم، جس نے رزق حاصل کرنے کے لیے چکور کو پر و بال اور باز کو تیز پنجے عطا کیے۔

کہ نہ دارم دریں سرائے دو در
آرزوے فزونیِ زر و مال

اس دو راستوں والی سرائے یعنی دنیا میں مجھے مال و زر بڑھانے اور جمع کرنے کی آرزو نہیں۔ دنیا کو "سرائے دو در" اس لیے کہا کہ ایک راستہ زندگی کے آغاز کا ہے، دوسرا راستہ اختتام کا۔ یعنی پیدائش و موت۔

حاصل من زِ ہرچہ در گزرد
چار چیز است کش مباد زوال

میری خواہشوں اور آرزوؤں کا حاصل چار چیزیں ہیں۔ خدا کرے وہ زوال سے محفوظ رہیں۔

کُنجِ امن و سفینۂ ز غزل
مئے ناب و پیالۂ ز سفال

اول امن کا گوشہ جہاں پورا اطمینان میسّر ہو، دوم سفینۂ غزل، یعنی شعر گوئی کا مشغلہ۔ سوم خالص شراب، چہارم اسے پینے کے لیے مٹی کا پیالہ۔ گویا ان چار چیزوں میں بھی تکلف مطلوب نہیں۔

ہم بہ گلبانگِ خامہ گرم سماع
نہ بہ آوائے جنبشِ خلخال

قلم کاغذ پر رواں ہے اور اسی کی آواز میرے لیے موسیقی کا سامان مہیا کرے۔ پازیب کی جھنکار یعنی حسینوں کے رقص و سرود کا خواہاں نہیں۔

در معانی نظر نہ چنداں طور
کہ سیاہی کند غم خط و خال

حقایق و معانی پر میری نظر جمی رہے اور کسی محبوب کے خط و خال کا غم نمایاں ہو کر میرے لیے باعثِ غم نہ ہو۔

نظمِ غالب نگر کہ پنداری
کز کمیں گاہ جستہ خیلِ غزال

غالب کی نظم پر نظر ڈال، تجھے ایسا معلوم ہوگا کہ ہرن کہیں چھپے بیٹھے تھے، وہ یکایک قطار در قطار نکل کر چوکڑیاں بھرنے لگے۔

در گزر گہ دمیدہ سنبل و گل
در نظر گہ گسستہ سلکِ لآل

یا یوں سمجھ لیجیے کہ راستہ سنبل و گل کی بہار آرائی سے اٹ گیا ہے یا موتیوں کی لڑیاں کھل گئی ہیں اور جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے، آبدار و شہوار موتی ہر طرف بکھر گئے ہیں۔

آگ اور دُھواں:

اس سلسلے میں ایک اور ٹکڑا توجہ طلب ہے۔ فرماتے ہیں:

نہ دیدہ ای و نہ بینی، مرا ببیں کہ منم
کسیکہ از غمش آذر بہ استخواں گیرد

میں وہ شخص ہوں جس کی ہڈیوں میں غم کی فراوانی سے آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ تو نے ایسا منظر کب دیکھا ہوگا اور کہاں دیکھے گا؟

بجوئی حالِ من از قالِ من کہ کارشناس
سراغ آتشِ سوزندہ از دخاں گیرد

تو میرا حال جاننے کا خواہاں ہے تو میرے کلام پر نظر ڈال۔ حقیقت شناس لوگ دُھواں دیکھ کر آتشِ سوزاں کا سراغ پالیتے ہیں۔

مرا کہ نامِ مرا بے ادب نہ گیرد کس
فلک نگر کہ بہ بازیچہ ناگہاں گیرد

میں وہ ہوں کہ میرا نام بھی کوئی شخص بے ادبی سے نہیں لیتا مگر دیکھ، زمانے نے کس طرح میرے ساتھ یکایک بازی گری شروع کر دی ہے۔

سپہر اعمیٰ و من گوشہ گیر و رہ بہ نشیب
فغاں ز نطق کہ خصم بدیں نشاں گیرد

آسماں اندھا ہے۔ اسے بھلے بُرے کی کوئی تمیز نہیں۔ میں الگ تھلگ ایک گوشے میں بیٹھا ہوں۔ راستہ ڈھالو ہے۔ فن شعر میں کمال بہم پہنچا لینے پر فریاد ہے کہ میرا دشمن شاعری ہی سے میرا نشان پالیتا ہے۔ یعنی گوشہ گیری کے باوجود دشمن کے ہتھکنڈوں کا نشانہ بنا ہُوا ہوں۔

حریرِ فکر مرا ہر نورد صد رنگ است
خوشم کہ دیدہ ور از من بہ امتحاں گیرد

میرے فکر کے ریشم کی ہر تہ اور ہر لپیٹ میں سیکڑوں رنگ ہیں۔ جب کوئی صاحبِ نظر اس قیمتی متاع کو جانچ پرکھ اور امتحان کی غرض سے لیتا ہے تو میں خوش ہوتا ہوں کہ کم از کم اس کی نگاہیں تو مال کی بیش بہائی کا صحیح اندازہ کرلیں گی۔

بہ مشتری چہ رسم؟ تُرکِ چرخ در راہ است
کہ جان و جامہ و جاہر بہ رایگاں گیرد

سوال یہ ہے کہ خریدار تک مال پہنچانے کی صورت کیا ہو؟ آسمان نے قزاق بن کر راستہ روک رکھا ہے۔ یہ قزاق جان، لباس اور مکان تینوں چیزیں مفت ہتھیا لیتا ہے۔

قصائد کی صنف میں مجھے اتنی ہی مثالوں پر اکتفا کرنا چاہیے کیوں کہ دُوسرے اصناف کے نمونے بھی پیش کرنے ہیں۔

قطعات:

اُردو اور فارسی میں قطعات بھی شعر گوئی کی ایک اہم صنف ہیں۔ یعنی مختلف عنوانات و مطالب پر ایسی نظمیں لکھنا جو کم از کم دو بیتوں اور زیادہ سے زیادہ بیس تیس شعروں پر مشتمل ہوں۔

میرزا غالبؔ کے قطعات ایک سو چالیس سے اُوپر ہیں۔ ان کے اشعار کا اندازہ آٹھ نو سو سے کم نہ ہوگا۔ ان میں قطعات تاریخ بھی شامل ہیں۔ یعنی کسی کی پیدائش، شادی، وفات، بیماری سے صحت یابی یا کسی عمارت، پُل وغیرہ کی تاریخ۔ میرے علم کی حد تک اس صنف (تاریخ گوئی) کا رواج مغربی زبانوں کی شاعری میں نہیں۔ اُردو اور فارسی کے شاعروں نے تاریخ گوئی میں جو گل کاریاں اور نکتہ نوازیاں کیں، وہ جدّت و تخلیق کے عجائب و نوادر میں شمار ہوتی ہیں لیکن میں اس مقالے میں تاریخی قطعات پر بحث نہیں کروں گا۔

عام قطعات بھی میرزا غالبؔ کی قادر الکلامی، حسن فکر اور حقایق گوئی کا گنجینہ ہیں۔ میں صرف دو مثالوں پر قناعت کروں گا۔

پہلا قطعہ:

ایک قطعے میں میرزا نے اپنے اور دُوسرے شاعروں کے درمیان بنیادی فرق واضح کرتے ہوئے کہا ہے کہ میری شعر گوئی بسمل کی تڑپ سے مشابہ ہے۔ کوئی جان دار زخموں سے بُری طرح گھائل ہو جاتا ہے تو بے اختیار تڑپتا ہے۔ اسی طرح میری شاعری بھی دل کی بے قراری اور اضطراب حال کا طبعی و فطری نتیجہ ہے۔ یہ قدرت کے عطا کیے ہوئے جوہر خاص کی نمود ہے، لہٰذا اس کی تاثیر بھی سب سے الگ ہے۔ باقی رہے دُوسرے شاعر تو وہ الفاظ کے لشکر لے کر اس طرح یورش کرتے ہیں، جس طرح قزاق تاخت و تاراج کے لیے سرگرم عمل ہوتے ہیں۔ میرا سرمایہ درد و داغ ہے۔ ہم فنون کا سرمایہ برگ و ساز ہے۔

دل اگر خام است باید کز فشردن نم دہد
ویں بہ ریزش نسبت دور و درازے بودہ است

دل خام ہو اور اس میں پختگی پیدا نہ ہوئی ہو تو ظاہر ہے کہ اسے نچوڑا جائے تو نمی ٹپکے گی اور ہر نیم پختہ شے میں نمی باقی ہوتی ہے۔ میرے دل و دماغ سے جو کچھ ٹپکتا ہے وہ قدرتی ریزش کا کرشمہ ہے۔ نچوڑ کر نمی نکالنے کو قدرتی ریزش سے اک گونہ نسبت تو ہے مگر بہت دُور کی نسبت ہے۔

نازم آں دل را کہ چوں اجزاے شمع از تاب خویش
سوزد و ریزد فروکایں اہتزازے بودہ است

مجھے اس دل پر ناز ہے جو موم کی بتّی کی طرح اپنی اندرونی حرارت اور تب و تاب کے زور سے جلتا اور پگھل پگھل کر بہتا رہتا ہے۔ یہ فطرت و طبیعت کا ایک دل کش کرشمہ ہے جس میں تصنّع کی گنجایش ہی نہیں۔

ایں کہ بفشارند و نم گیرند مشقے بیش نیست
ویں کہ خود خوں گردد و ریزد گدازے بودہ است

اپنا دل بھینچ بھینچ کر اور نچوڑ نچوڑ کر نم حاصل کرنے کی حیثیت کیا ہے؟ زیادہ سے زیادہ اسے گداز کی مشق قرار دے سکتے ہیں لیکن جو دل خود خون ہو ہو کر ٹپکتا ہے، حقیقی گداز کا مرتبہ اسی کو حاصل ہے۔

دُوسرا قطعہ:

میرزا ۱۸۲۷ء میں دہلی سے کلکتہ گئے تھے۔ اس سفر کا مقصد یہ تھا کہ اپنی خاندانی پنشن بحال کرائیں، جو اصلاً دس ہزار روپے سالانہ تھی مگر میرزا کی کم سنی کے زمانے میں بعض اصحاب نے مختلف تدبیروں سے کام لے کر اس پنشن کو گھٹاتے گھٹاتے تین ہزار روپے سالانہ پر پہنچا دیا تھا۔ اس سفر میں میرزا نے مشرقی ہند کے بڑے بڑے شہر بھی دیکھے مثلاً لکھنؤ، بنارس، عظیم آباد وغیرہ۔

اس سفر کی یادگار ایک قطعہ ہے۔ عالم خیال میں میرزا کی ملاقات ''بزم آگاہی'' کے ''ساقی'' سے ہُوئی اور اس سے سوالات شروع کر دیے۔ فرماتے ہیں:

''اوّل از دعویِ وجود بگو!!!
گفت: کفر است در طریقتِ من''

میں نے ''ساقی'' سے کہا کہ سب سے پہلے یہ بتائیے، وجود کے دعویٰ کی حیثیت کیا ہے، جواب ملا کہ میرے مسلک کے مطابق یہ ''کفر'' ہے۔

واضح رہے کہ میرزا ''وحدت الوجود'' پر پختگی سے قائم تھے۔ ان کے نزدیک وجود حقیقی صرف ہستی مطلق یعنی خدا کا تھا اور وہ اشیاء کے لیے مستقل وجود کو کفر بل کہ شرک سمجھتے تھے۔ یہ اسی عقیدے کا اظہار ہے۔

گفتم: ''آخر نمودِ اشیا چیست''؟
گفت: ''ہی ہی نمے تواں گفتن''

میں نے ساقی سے پوچھا اگر وجود کا دعویٰ کفر ہے تو فرمائیے کہ اشیاء کی نمود کو کیا کہا جائے؟ جواب ملا کہ آہ! اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

گفتمش: ''بامخالفاں چہ کنم؟''
گفت: ''طرح بنائے صلح فگن''

میں نے کہا کہ جو لوگ میرے مخالف ہیں، ان سے کیا برتاؤ روا رکھا جائے؟ ''ساقی'' نے جواب دیا صلح کی بنیاد استوار کرلو۔

گفتم: ''ایں حبِ جاہ و منصب چیست؟''
گفت: ''دامِ فریب اہریمن؟''

میں نے پوچھا کہ لوگوں میں ہر طرف جاہ و منصب کی حرص کا طوفان بپا ہے۔ ان چیزوں سے محبت رکھنے کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ جواب ملا کہ یہ تو فریب کا ایک جال ہے جو شیطان نے بچھا رکھا ہے تا کہ حقیقت ناشناسوں کو اس میں پھانس کر تباہ کر ڈالے۔

گفتمش: ''چیست منشاء سفرم؟''
گفت: ''جور و جفائے اہلِ وطن''

میں نے کہا کہ یہ بھی بتا دیجیے، مجھے یہ سفر کس وجہ سے اختیار کرنا پڑا؟ ''ساقی'' نے جواب دیا کہ ہم وطنوں کا ظلم و جور اس کا باعث ہوا۔

گفتم: ''اکنوں بگو کہ دہلی چیست؟''
گفت: ''جان است و ایں جہانش تن''

میں نے پوچھا اب یہ بتائیے کہ شہر دہلی کی حیثیت کیا ہے؟ جواب ملا کہ دہلی جان ہے اور پوری دنیا اس جان کے لیے بدن ہے۔

گفتمش: ''چیست ایں بنارس؟ گفت''
''شاہدے مست محوِ گل چیدن''

میں نے پوچھا کہ اچھا بتائیے، بنارس کی کیفیت کیا ہے؟ فرمایا کہ ایک محبوب ہے، جو پھول چننے میں مست ہے۔

گفتمش: ''چوں بود عظیم آباد؟''
گفت: ''رنگین تر از فضائے چمن''

میں نے سوال کیا کہ عظیم آباد (پٹنہ) کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ جواب ملا کہ یہ شہر باغ کی فضا سے بھی زیادہ رنگین ہے۔

گفتمش: ''سلسبیل خوش باشد''
گفت: ''خوشتر نہ باشد از سوہن''

میں نے ''ساقی'' سے کہا کہ بہشت کی ندی سلسبیل بہت اچھی ہے۔ فرمایا: سوہن ندی سے زیادہ اچھی نہیں۔

سوہنؔ یا سونؔ مشرقی ہند کی مشہور ندی ہے جو ست پڑا پہاڑ کے مشرقی سرے سے نکل کر شمالی جانب بہتی ہوئی پٹنہ کے قریب دریائے گنگا میں مل جاتی ہے۔

سوہن ندی کو میرزا نے ایک رباعی میں بھی سراہا ہے۔ فرماتے ہیں:

خوشتر بود آبِ سوہن از قند و نبات
باوے چہ سخن زنیل و جیحون و فرات
ایں پارۂ عالمے کہ ہندش نامند
گوئی ظلمات و سوہنش آبِ حیات

سوہن ندی کا پانی قند و نبات سے بھی خوشتر ہے۔ اس کے مقابلے میں نیل، جیحون اور فرات کی بات کیا کرتے ہو؟ روے زمین کا یہ ٹکڑا جسے ہندوستان کہتے ہیں، سچ مچ ظلمات ہے اور سوہن اس ظلمات میں آبِ حیات ہے۔

ادبی افسانوں میں ایک افسانہ یہ بھی ہے کہ ''آب حیات'' ایک چشمہ ہے، جس کا پانی کوئی شخص پی لے تو اسے موت نہیں آئے گی، ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس چشمے تک پہنچنے کے لیے ظلمات یعنی اندھیروں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ میرزاؔ نے اسی افسانے کی بناء پر ہندوستان کو ''ظلمات'' اور ''سوہن'' کو آب حیات قرار دے دیا۔

ایک غزل میں بھی سوہن کی تعریف کی ہے۔

چو اسکندر ز نادانی ہلاکِ آب حیوانی
خوشا سوہن کہ ہر کس غوطہ زد در وے تنش جاں شد

سکندر کی طرح آب حیوان پر جان دینا نادانی ہے۔ سوہن کتنی اچھی ندی ہے کہ جس نے اس میں غوطہ مارا، اس کا جسم جان کی صورت اختیار کر گیا۔

آب حیات والے ادبی افسانے کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ سکندر اعظم خضر کے ساتھ آبِ حیات کی تلاش میں نکلا۔ خضر نے آبِ حیات پی لیا اور سکندر محروم رہ گیا۔

میرزاؔ نے سوہن ندی کے علاوہ کوسی ندی کی بھی بہت تعریف کی ہے جو رام پور کے قریب ہے۔ اس ندی کے متعلق لکھتے ہیں۔ سبحان اللہ ایسا میٹھا پانی کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت ہے۔ صاف، سبک، گوارا اور سریع النفوذ یعنی جلد ہضم ہو جانے والا۔

حال کلکتہ باز جستم، گفت:
''باید اقلیم ہشتمش گفتن''

پھر میں نے ''ساقی'' سے کلکتہ کا حال پوچھا۔ جواب ملا کہ اسے تو آٹھویں اقلیم کہنا چاہیے۔ پرانے مشرقی جغرافیہ دانوں کے نزدیک دنیا سات اقلیموں میں منقسم تھی۔ کلکتہ کو آبادی کی وسعت و کثرت کے باعث آٹھویں اقلیم قرار دے دیا۔

گفتم: ''آدم بہم رسد در وے''
گفت: ''از ہر دیار و از ہر فن''

میں نے کہا کہ کلکتہ میں آدمی بہت ہیں۔ ساقی نے تصدیق کے ساتھ تشریح کر دی کہ واقعی ہر ولایت سے اور ہر فن کے آدمی جمع ہو گئے ہیں۔

یہاں تک تمہیدی سوالات تھے۔ اب اصل مطالب پر آتے ہیں جن کے بیان کے لیے یہ تمہیدات اٹھائی گئی تھیں۔

گفتم: ''ایں جا چہ شغل سود دہد؟''
گفت: ''از ہر کہ ہست، ترسیدن''

میں نے پوچھا یہاں یعنی کلکتہ میں کون سا طریقہ مفید ہو سکتا ہے؟ جواب ملا جو بھی نظر آئے، اس سے ڈرتے رہنا چاہیے۔

یہ ۱۸۲۷ء میں کلکتہ کی حالت تھی، جو انگریزی مملکتِ ہند کا مرکز تھا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آج سے ڈیڑھ سو سال پیش تر انگریزوں کے متعلق اہلِ ہند کے تاثرات کیا تھے؟

گفتم: ''ایں جا چہ کار باید کرد؟''
گفت: ''قطعِ نظر ز شعر و سخن''

میں نے پوچھا کلکتہ میں کیا کام کرنا چاہیے؟ ''ساقی'' نے جواب دیا اور جو چاہو کرو مگر شعر و سخن سے قطع نظر کر لو کیوں کہ کلکتہ انگریزوں کا مرکز تھا اور انگریزوں کو اہلِ ملک کے شعر و سخن سے کوئی بھی علاقہ نہ تھا اگرچہ حکومت کی ضرورتوں کے پیشِ نظر بہت سے انگریزوں نے فارسی اور اُردو سیکھ لی تھی۔

گفتم: ''ایں ماہ پیکراں چہ کس اند؟''
گفت: ''خوبانِ کشورِ لندن''

میں نے سوال کیا کہ یہ چاند جیسے بدنوں والے لوگ کون ہیں؟ جواب ملا کہ یہ کشور لندن کے حسین ہیں۔

گفتم: ''ایناں مگر دلے دارند؟''
گفت: ''دارند لیکن از آہن''

میں نے پوچھا کہ آیا ان حسینوں کے پہلوؤں میں دل بھی ہے؟ جواب ملا کہ ہے تو مگر لوہے کا ہے، یعنی جذبۂ مہر و محبت سے بالکل خالی اور کالا بے حس۔

گفتم: ''از بہرِ داد آمدہ ام''
گفت: ''بگریز و سر بہ سنگ مزن''

میں نے ''ساقی'' سے کہا کہ میں تو انصاف کی خاطر یہاں آیا ہوں۔ ''ساقی'' نے جواب دیا کہ یہاں سے بھاگ۔ کیوں اپنا سر پتھر پر دے مارتا ہے''؟

گفتم: ''اکنوں مرا چہ زیبد''؟ گفت
''آستیں بر دو عالم افشاندن''

میں نے پوچھا بتائیے اب میرے لیے مناسب طریق کار کون سا ہے؟ فرمایا: دونوں جہانوں پر آستیں جھاڑ کر الگ ہو جا۔

رباعیات:

رباعیات کا نمونہ بھی ملاحظہ فرما لیجیے۔ میرزا بے حد غیوّر اور فطرۃً دردمند تھے اگرچہ ان کی آمدنی کا دائرہ محدود تھا۔ بچّے ہوئے مگر کم سنی ہی میں سب فوت ہو گئے اور بیگم کے سوا ان پر اور کوئی بوجھ نہ تھا تاہم آخری وقت تک بیس بائیس آدمیوں کی کفالت اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''نہ وہ دست گاہ کہ ایک میزبان بن جاؤں اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے تو نہ سہی مگر جس شہر میں رہوں، اس شہر میں تو کوئی بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔''

رباعیات میں بھی یہ مضمون جا بجا آیا ہے۔ مثلاً:

دستم بہ کلید مخزنے مے بایست
ور بود تہی بہ دامنے مے بایست
یا ہیچ گہم بہ کس نیفتادے کار!
یا خود بہ زمانہ چوں منے مے بایست

کاش میرے ہاتھ میں کسی خزانے کی کنجی ہوتی اگر ہاتھ خالی تھا تو کاش اس میں کسی کا دامن ہوتا، جو میری ضرورتیں پوری کرنے کا کفیل بن جاتا۔

یا تو مجھے کسی شخص سے کسی بھی وقت کام نہ پڑتا یا زمانے میں مجھ جیسا کوئی صاحبِ کمال ہوتا، جو میری قدر شناسی کا حق ادا کر سکتا۔

دولت مندوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

گر گرد ز گنجِ گہرے برخیزد
مپسند کہ دود از جگرے برخیزد
منّت نتواں نہاد بر گدیہ گراں!!
بنشیں کہ بخدمت دگرے برخیزد

اگر زر و گوہر کا خزانہ اس طرح خالی ہو جائے کہ اس میں خاک اڑنے لگے تو کچھ پروا نہ کر، تاہم اس پر راضی نہ ہو کہ کسی ضرورت مند کے جگر سے دھواں اٹھے۔ ضرورت مندوں پر احسان نہیں رکھا جا سکتا۔ دولت ہے ہی اس لیے کہ اس سے محتاجوں کی حاجتیں پوری ہوں۔ اے دولت مند اگر تجھ سے یہ خدمت ادا نہیں ہو سکتی تو الگ ہو کر بیٹھ جا تا کہ کوئی دوسرا اٹھے اور تیری جگہ اس فرض کی بجا آوری کا ذمہ دار بن جائے۔

ایک اور رباعی میں دولت مندوں ہی سے خطاب ہے:

باید کہ دلت بہ غصّہ برہم نہ شود
از رفتنِ زر دستخوش غم نہ شود
ایں سیم و زر است، خواجہ! ایں سیم و زر است
غم نیست کہ ہر چند خوری کم نہ شود

اے دولت مند! مال و ثروت خدمتِ خلق میں صرف ہو جانے کے باعث تیرے دل کو پریشان نہ ہونا چاہیے اور اس غم سے مغلوب ہو جانا ہرگز مناسب نہیں۔ یہ سیم و زر ہے جناب والا! یہ سیم و زر ہے غم نہیں کہ جتنا بھی کھایا جائے، اس میں کمی بالکل نہ آئے۔

یعنی سیم و زر حقیقت ہی کیا ہے کہ اس کے صرف ہونے کا غم کھایا جائے اور جان کو روگ لگا لیا جائے۔ مال تو ہوتا ہی اس لیے ہے کہ اسے نیکی اور ہمدردی و بہی خواہی کے کاموں میں صرف کیا جائے۔

مذاہب عالم میں ایک اہم مسئلہ جزا و سزا کا بھی ہے یعنی نیک اعمال کا اچھا صلہ ملنا اور بُرے

اعمال کی سزا پانا۔ میرزا غالبؔ نے ایک رباعی میں سزاے اخروی کے متعلق تصور عام کے خلاف نہایت معقول و دل پذیر نقطۂ نگاہ پیش کیا ہے اور صحیح نقطۂ نگاہ یہی ہے، فرماتے ہیں:

اے دادہ بہ باد عمر در لہو و فسوس
زنہار مشو ز رحمتِ حق مایوس
ہشدار کز آتشِ جہنم حق را !!
تہذیب غرض بود نہ تعذیبِ نفوس

جو شخص عمر فضولیات میں برباد کر چکا ہے، اسے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تجھے خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔ یاد رکھ، دوزخ کی آگ سے خداے رحیم و کریم کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ انسانی نفوس کو عذاب دیا جائے۔ اصل مقصد نفوس کی اصلاح و درستی اور تہذیب ہے۔

سونے کو آگ میں صرف اس لیے تپایا جاتا ہے کہ کھوٹ نکل جائے اور زر خالص باقی رہ جائے۔ یہی وظیفہ انسانوں کے تعلق میں آتش جہنم ادا کرے گی۔

غزلیات:

مقالہ خاصا طویل ہو گیا اور ابھی میرزا کے بہترین گہر ہاے افکار کا خاصا بڑا ذخیرہ باقی ہے جس کا کوئی نمونہ ابھی تک پیش نہیں کیا گیا۔ یعنی غزلیات اور بعض دوسرے اصنافِ سخن۔

غزلیات کے متعلق عام تصور یہی ہے کہ وہ متفرق افکار کا مجموعہ ہوتی ہیں اور ان افکار یا خود غزلوں میں کسی مربوط سلسلے کی تلاش کام یاب نہیں ہو سکتی۔ بل کہ بعض شاعروں کے نزدیک تو ایک غزل میں متضاد افکار کا اظہار بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا لیکن جو لوگ قدرت سے خاص دل و دماغ لے کر آئے تھے اور جن کی شاعری بے مقصد و مدعا نہ تھی، ان کے ہاں شاید ہی کوئی ایسا شعر مل سکے جس کا تعلق کسی نہ کسی صورت میں نصب العین سے نہ ہو۔ میرزا غالبؔ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کوئی چیز بے مقصد نہیں کہتے پھر اُردو اور فارسی میں خاصی غزلیں مسلسل ہیں، جنھیں چھوٹی چھوٹی مستقل نظمیں کہنا مناسب ہوگا۔ ان میں آفاقیت کا رنگ خاصا غالب ہے یعنی جہاں میرزا نے ایسی چیزیں کہیں جن کا تعلق ماحول سے تھا، وہاں ایسی بھی بے شمار چیزیں ان کے نتائج فکر میں موجود ہیں، جو ماحول اور قومی و وطنی نسبتوں سے بالاتر ہو کر عالمِ انسانیت کے لیے کہیں اور انسانیت کو نصب العین بنایا۔ ان

اشعار میں ان کے خاص حلقے یا وطن یا قوم کا خفیف سا رنگ بھی نہیں پایا جاتا، بل کہ انھیں ہر انسان کے قلب و روح سے اٹھنے والے ترانے سمجھنا چاہیے۔

خواجہ حالؔی مرحوم نے ایک غزل کے مطلع میں کہا ہے:

اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی
بزم میں اہلِ سخن بھی ہیں، تماشائی بھی

یہ دراصل بڑے اور عالمی شاعروں کے اسلوب و انداز کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ وہ جہاں اپنا حقیقی پیغام یا فکر و نظر کے جواہر پارے دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں، وہاں اس امر کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ مخاطبین محض پیغام کی باتیں سنتے سنتے اکتا نہ جائیں۔ لہٰذا ایسے افکار بھی پیش کر دیتے ہیں، جن سے مخاطبین کی دل چسپی کے سلسلے میں کوئی خلل نہ آئے اور وہ توجہ سے سب کچھ سنتے یا پڑھتے جائیں۔ ایسے اشعار بادی النظر میں شاید کسی حد تک بے تعلق معلوم ہوں لیکن حقیقتاً انھیں بھی اصل نصب العین کے متعلقات ہی قرار دیا جانا چاہیے۔ کم از کم وہ کسی نہ کسی فکری یا علمی منفعت سے خالی نہیں ہوتے۔

اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ”شراب“ کی تیزی اور حدّت کو گوارا بنانے کے لیے اس میں کوئی مرغوب شے ملا دی جاتی ہے۔ مثلاً گلاب یا سوڈا یا کوئی اور شے۔ مقصد یہی ہوتا ہے کہ پینے والے بے تکلف پیالہ لبوں سے لگالیں اور شوق سے پی جائیں۔ مطلوب حقایق دلوں میں اتارنے کی یہ بھی ایک موثر تدبیر ہے۔

میرزا کہتے ہیں:

چہ شد کہ ریخت زباں رنگِ صد ہزار سخن
بخوں سرشتہ نوائے ز دل بر آر یکے

مانا کہ زبان نے سیکڑوں رنگارنگ باتیں کہہ ڈالیں مگر ان سے کیا ہوتا ہے؟ کوئی ایسی نوا اور کوئی ایسا نغمہ سازِ دل سے نکال جو خون میں گندھا ہوا ہو اور قلب کی تہ سے اُٹھتے ہی اخلاص کی برکت سے ہر دل میں گھر کر جائے۔

چہ خیزد از سخنے کز درونِ جاں نبود؟
بریدہ باد زبانے کہ خونچکاں نبود!!!

اس شعر سے کیا نتیجہ نکل سکتا ہے جو جان کی گہرائیوں سے نہ نکلے؟ خدا کرے وہ زبان کٹ جائے جس سے خون نہ ٹپکے۔

میرزا کی غزلیات میں آپ کو بے شمار ایسے نغمے ملیں گے جو خونِ دل میں ڈوب کر نکلے۔ یہی حقیقی شاعری ہے۔ ایسی ہی شاعری انسانوں کے دل و دماغ کو جلا دے کر ارتقاے فکر و نظر کی نئی بلندیوں پر پہنچاتی ہے۔ ان بندھنوں کو توڑتی ہے جو انسانوں نے انسانیت کے حقیقی احساس سے محروم ہو کر اپنے لیے پیدا کر لیے اور انھیں نسل، قوم، رنگ یا جغرافیائی قومیت کے نام دے دیے۔

انسان اور انسانیت:

میں نے جتنا غور کیا، اسی نتیجے پر پہنچا کہ میرزا کی شاعری کا بنیادی نقطہ اور اصل نصب العین انسان ہے۔ اسی انسان کو حقیقی معنی میں انسان بنانے کے لیے ان کے فکر و نظر کی قوتیں اور صلاحیتیں مدت العمر وقف رہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

ز آفرینشِ عالم غرض جز آدم نیست
بہ گرد نقطۂ ما دورِ ہفت پر کار است

اس کائنات کی پیدائش کا مقصد و نصب العین انسان ہے۔ یہی ایک نقطہ ہے، جس کے گرد زمانے کی پرکار گھوم رہی ہے۔

‘ہفت پر کار’’ سے بہ ظاہر اشارہ سات آسمانوں کی طرف ہے۔ یہ زمانے یا روزگار کی تعبیر کے لیے ایک اصطلاح ماضی قدیم سے چلی آ رہی ہے اور شاعر اپنا مطلب بیان کرنے کے لیے انھی تعبیرات و اصطلاحات سے کام لیتا ہے، جن سے مخاطب آشنا ہوں۔

یہ وسیع کائنات، جس کی حد و نہایت کا کھوج اب تک لگایا نہیں جا سکا، انسان کے لیے ترقی و سربلندی کی ایک امتحان گاہ ہے۔ جب سے روے زمین پر انسان کا ظہور ہوا، اس کے لیے قدم قدم پر مشکلیں اور رکاوٹیں تھیں۔ گویا یہ ’’چیلنج‘‘ تھے، جو کائنات کی طرف سے انسان کے سامنے پیش ہوتے رہے۔ دیکھیے، کس طرح ہر ’’چیلنج‘‘ کا کامیاب جواب دیتے دیتے انسان نے اب تک ترقی کی بے شمار منزلیں طے کر لیں۔ یہ ’’چیلنج‘‘ صرف مادی ہی نہیں، معنوی بھی تھے۔ ابھی رکاوٹوں اور امتحانوں کا سلسلہ باقی ہے۔ انسان جتنی مستعدی، سرگرمی اور ہمت و جرأت سے کام لیتا رہے گا، اتنا ہی

سر بلند ہوتا جائے گا اور اتنی ہی تیزی سے مزید ارتقائی مرحلے طے کرے گا۔

ایک اور مقام پر کہتے ہیں:

زما گرم است ایں ہنگامہ، بنگر شورِ ہستی را
قیامت مے دمد از پردۂ خاکے کہ انساں شد

فضائے کائنات میں گوناگوں شورشیں اور ہنگامے بپا ہیں۔ ان کا اصل سرچشمہ انسان کے سوا کیا ہے؟ اگر انسان نہ ہوتا تو ہر طرف ویسا ہی سناٹا چھایا نظر آتا جیسا گھنے جنگلوں اور بے آب وگیاہ صحراؤں میں پایا جاتا ہے۔ اس شور وشغب کی حیثیت بھی ایک لحاظ سے قیامت کی سی ہے۔ جس قیامت کا ذکر مذہبی کتابوں میں آیا ہے، وہ بھی تو اسی پردۂ خاکی سے پیدا ہوگی، جسے عرفِ عام میں انسان کہتے ہیں۔

اُردو کے ایک شعر میں کہتے ہیں:

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

ہر کام بہ ظاہر کتنا ہی آسان نظر آئے لیکن حقیقتاً سخت مشکل اور دشوار ہوتا ہے۔ اس کی مثال آپ آدمی میں دیکھ سکتے ہیں۔ ہر آدمی عین انسان ہے مگر انسان کو جن خوبیوں اور فضیلتوں کا مجموعہ ہونا چاہیے، ان کے لحاظ سے دیکھا جائے تو آدمی کے لیے انسان بننا بہت مشکل ہے۔ اربوں ''آدمیوں'' میں ''انسان'' یقیناً بہت کم نکلیں گے۔

باصد ہزار دیدہ بہ گردد جہاں سپہر
جویاے آدمی است، ولے آدمی کجاست!

آسمان ستاروں کی ان گنت آنکھوں کے ساتھ دنیا کا چکر لگا رہا ہے وہ آدمی کی تلاش میں ہے مگر آدمی کہاں ہے!

میرزا کے کلام میں انسانی فضیلتوں اور خوبیوں کے مرقعے جابجا موجود ہیں، جن کے لیے دعوت کا سلسلہ انھوں نے نظم ونثر میں برابر جاری رکھا۔ ان میں سے چند مرقعے یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

ہم جنسوں کا غم:

میرزا کے نزدیک انسان کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ اسے ہم جنسوں کا غم ہو۔ اس کی کوششیں اپنی

ذات یا اقربا و متعلقین ہی تک محدود نہ رہیں بل کہ تمام انسانوں کے لیے اسے یکساں غم ہو، خواہ ان کا تعلق کسی قوم، کسی گروہ اور کسی خطے سے ہو۔ وہ اس غم کو بڑا ہی قیمتی وصف سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں:

بے غم نہاد مرد گرامی نمے شود
زنہار قدرِ خاطرِ اندوہگیں شناس

غم کے بغیر انسان کی فطرت میں بزرگی اور عظمت پیدا نہیں ہوسکتی، ضروری ہے کہ اس دل کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کیا جائے جو ہم جنسوں کے لیے رنج و اندوہ سے مالا مال ہو۔

میرزا کا عقیدہ ہے کہ ہم جنسوں کا غم ہی انسان کو معنوی آلایشوں سے پاک اور صاف کرتا ہے۔

غم چو بہم در افگند، رو کہ مراد مے دہد
دانہ ذخیرہ مے کند، کاہ بہ باد مے دہد

فصل کٹتی تو غلہ اور بھوسا ملے جلے ہوتے ہیں جب تک غلے کو بھوسے سے الگ نہ کرلیا جائے، وہ کھانے کے لائق نہیں ہوتا۔

غم دراصل مراد حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ یہ انسان کو چھان پھٹک کر برائیاں اور خامیاں نکال دیتا ہے اور اچھائیاں محفوظ کرلیتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح چھان پھٹک کے عمل سے بھوسے کو دانوں سے الگ کیا جاتا ہے۔

غور کیجیے کہ اگر ہر فرد کے دل میں ہم جنسوں کے غم کا صحیح احساس بیدار ہوجائے تو اس دنیا کے سیکڑوں پیچیدہ اور لاینحل مسائل کتنی آسانی سے طے ہوجائیں!

میرزا کو ‘‘غم’’ سے اتنا پیار ہے کہ وہ ان لوگوں سے الگ اور بے تعلق رہنے کی دعوت عام دیتے ہیں، جن کے سینوں میں ہم جنسوں کے لیے کوئی تڑپ اور کوئی حرارت موجود نہ ہو۔

حذر از زمہریرِ سینۂ آسودگاں غالبؔ
چہ منتہا کہ بر دل نیست جانِ ناشکیبا را

اے غالبؔ آسودہ دل لوگوں سے دور رہ، جن کے سینے زمہریر کی طرح حد درجہ ٹھنڈے ہیں۔ میری جان دوسروں کے غم سے سرمشق اضطراب ہے۔ اسے ایک لمحے کے لیے بھی چین نہیں۔ یہ

حسّاس قلب کا کرشمہ ہے اور میری جانِ بے قرار پر اس قلب کے احسان گنے نہیں جا سکتے۔

میرزا فرماتے ہیں کہ ہر انسان کے دل میں مختلف اسباب و احوال کی بناء پر گرِہیں اور الجھنیں پڑ جاتی ہیں۔ ان الجھنوں سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ صرف ہم جنسوں کا غم ہے:

کلید بستگیِ تست غم، بجوش اے دل
اگر چنیں نہ گدازی، گرہ کشاے تو کیست؟

اے دل! تیری بستگی اور افسردگی و بے کیفی کی کنجی غم ہے۔ اس لیے غم کا جوش دکھا اگر تو اس طرح غم سے نہیں پگھلے گا تو بتا تیری گرِہیں کون کھولے گا اور تیری بستگی کیوں کر دُور ہو گی؟

”غم“ کو میرزا کبھی کبھی ”عشق“ سے بھی تعبیر کرتے ہیں:

خشک و تر سوزیِ ایں شعلہ تماشا دارد
عشق یک رنگ کنِ بندہ و آزاد آمد

عشق یعنی ہم جنسوں کا غم ایسی آگ ہے جو خشک و تر دونوں کو جلا دیتی ہے۔ اس طرح غلام اور آزاد دونوں کا رنگ ایک ہو جاتا ہے۔ آگ خشک چیزوں کو فوراً بھسم کر ڈالتی ہے مگر جن میں نمی ہو، وہ جلد شعلہ نہیں پکڑتیں۔ آتشِ عشق کے نزدیک خشک و تر میں کوئی تمیز نہیں۔ اس کا شعلہ جس چیز پر گرتا ہے، اسے راکھ بنا دیتا ہے۔

”خشک“ سے مراد ایسے لوگ ہیں، جن کے پاس کچھ نہ ہو اور وہ اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے دوسروں کی مہربانی کے محتاج ہوں۔ ”آزاد“ سے مراد اصحابِ استطاعت ہیں، جو کسی کے محتاج نہیں۔

جس دل میں ہم جنسوں کے لیے درد و غم پیدا ہو جائے، ظاہر ہے کہ اس کے نزدیک بندہ و آزاد اور محتاج و غنی کا کوئی امتیاز باقی نہ رہے گا۔ امیر کے دل میں بھی یہ غم پیدا ہو جائے گا تو امتیازات مِٹ جائیں گے، جو حقیقتاً ہم جنسوں کے درد و غم سے خالی ہونے کا ثبوت ہیں۔

میرزا نے اُردو کے ایک شعر میں بھی عشق کو ہم جنسوں کے غم کا مترادف قرار دیا ہے:

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے، گر برق خرمن میں نہیں

یقیناً زندگی کی رونق اسی عشق سے ہے، جو دوسروں کے غم میں ذاتی اغراض کو ملیا میٹ کر ڈالے اگر ذاتی اغراض کے انبار پر بجلی نہ گرے تو سمجھ لینا چاہیے کہ انجمن میں شمع روشن نہیں حالاں کہ انجمن کی رونق شمع ہی سے ہے۔

سرابے کہ زخشد بہ ویرانہ خوشتر
زچشمے کہ پیرایۂ نم نہ دارد!!

صحرا میں جو سراب جھلکتا ہے وہ اس آنکھ سے ہزار درجہ بہتر ہے جو ہم جنسوں کے غم میں آنسوؤں سے تر نظر نہ آئے۔

مشکل پسندی:

خدمتِ خلق کا کوئی کام انجام پا ہی نہیں سکتا، جب تک انسان اپنے آپ کو سختیوں، دشواریوں اور مشکلوں کا عادی نہ بنا لے۔ فرماتے ہیں:

فراغت برنتابد ہمتِ مشکل پسندِ ما
زدشواری بجاں می افتدم کارے کہ آساں شد

میری ہمت بہت مشکل پسند ہے۔ اسے دشواریوں سے پیار ہے اگر کوئی کام آسان نکل آئے تو میری جان عذاب میں آ جاتی ہے۔

مجو آسودگی گر مردِ راہی کاندریں وادی
چو خار از پا برآمد، پا ز داماں برنمے آید

اگر تو مردِ راہ ہے اور سفر کی ہمت سے بہرہ مند ہے تو خدا کے لیے آرام و آسایش کا خواہاں نہ ہو۔ عشق کی وادی کا معاملہ ایسا ہے کہ اگر تو چلتے چلتے پاؤں سے کانٹا نکالنے کے لیے بیٹھ جائے گا تو یقین رکھ کہ پھر تیرا پاؤں راستے میں اُٹھ نہ سکے گا بل کہ تیرے دامن ہی میں اُلجھا رہے گا۔

تجربہ اس کی درستی کا شاہد ہے۔ جن لوگوں نے دنیا کی بہتری، بہبود اور فائدے کے لیے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے، انھوں نے ذاتی راحت کا خیال کبھی نہ کیا۔ آرام ہی نہیں جانیں بھی اس میں بے دریغ دے دینے کے لیے تیار رہے بل کہ دے دیں۔ اپنی حالت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

با اضطراب دل ز ہر اندیشہ فارغم
آسایشیست جنبشِ ایں گاہوارہ را

دل میں اضطراب موجزن ہونے نے مجھے ہر تشویش سے فارغ کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک گہوارے میں لیٹا ہُوا ہوں۔ اضطراب اسے ہلا رہا ہے اور میں آرام و آسایش میں سرمست ہوں۔

حاشا کہ ز غم نالم اگر غم، غم عشق است
پیوندِ نشاط است بدیں زمزمہ دم را

اگر غم، غمِ عشق ہو تو کیا میں اس پر آہ و فریاد کر سکتا ہوں؟ توبہ توبہ!! اس زمزمے کے ساتھ تو میرے سانس کے لیے نشاط و شادمانی کا پیوند لگا ہوا ہے یعنی یہی تو میری خوشی کا سرمایہ ہے۔

میرزا جانتے تھے کہ اس راستے پر قدم رکھنا، ہر فرد کا کام نہیں۔ قدرت خاص آدمیوں کو ایسے کاموں پر لگاتی ہے:

قضا در کارہا اندازۂ ہر کس نگہ دارد!!!
بہ قطعِ وادی غم مے گمارد تیز گاماں را

کاموں کے سلسلے میں کارفرمائے قضا و قدر ہر فرد کی ہمت، طاقت اور قوتِ برداشت کا اندازہ سامنے رکھتا ہے۔ وادی ''غم'' میں سفر بڑی مردانگی اور بڑے دل گُردے کا کام ہے۔ اس سفر پر انھی لوگوں کو مامور کرتا ہے جو تیز گام ہوں۔ تکلیفوں، خطروں اور سختیوں کے ہجوم سے بے پروا ہو کر منزل مقصود کی طرف بڑھتے جائیں اور کہیں نہ رُکیں۔

دعوتِ مردانگی:

خطرات و مصائب سے بے پروائی کی دعوت میرزا کے کلام کا ایک اہم مضمون ہے، جس کی چند مثالیں ذیل میں پیش ہیں:

رو تن بہ بلا دہ کہ دِگر بیمِ بلا نیست
مرغ قفسی کشمکشِ دام نہ دارد

اے مخاطب اپنے آپ کو بے باکانہ خطرات کے حوالے کر دے۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہ کام

انجام دے چکنے کے بعد حوادث و خطرات کا خوف ختم ہو جائے گا جو پرندہ پنجرے میں پہنچ جاتا ہے یعنی خطرات کی آخری منزل میں داخل ہو جاتا ہے وہ جال میں پھنس جانے کے بعد چھوٹنے کے لیے کشمکش اور کھینچ تان سے فارغ ہو جاتا ہے۔

جاں در غمت فشاندن، مرگ از قفا نہ دارد
تن در بلا فگندن، بیمِ بلا نہ دارد

غم میں جان قربان کر دینے پر آمادہ ہو جانے کے بعد موت کا کوئی خوف باقی نہیں رہتا اگر اپنے آپ کو بلا کے سمندر میں ڈال دینے پر انسان تیار ہو جائے تو وہ بلا کے خوف سے نجات پا جاتا ہے یعنی خوف اس کے دل سے نکل جاتا ہے۔

چہ ذوق رہروی آں را کہ خار خارے نیست
مرو بہ کعبہ اگر راہ ایمنی دارد

اس مسافر کے لیے سفر میں لُطف ہی کیا، جسے گوناگوں خطرے اور پریشانیاں درپیش نہ ہوں؟ کعبہ مقدس ترین مقام ہے جس کا سفر عقیدت سے کیا جاتا ہے لیکن کعبے جانے میں بھی مزا اسی وقت ہے کہ راستہ پُر امن نہ ہو۔

ایک شعر کا تو مضمون ہی یہ ہے کہ کعبے کی زیارت کو جو لوگ جاتے ہیں، اُن کے لیے قدرت نے اس غرض سے مختلف شدتوں اور سختیوں کا انتظام کر رکھا ہے تا کہ ان کی حبِ ایمانی کا امتحان لیا جائے:

عیارِ کعبہ رواں تا بہ تشنگی گیرند
نہ دادہ اند دریں دشت، راہ دریا را

جس سرزمین میں کعبہ مکرمہ واقع ہے، وہاں قدرت نے کسی دریا کا انتظام نہیں کیا۔ مقصد یہ ہے کہ کعبے کی زیارت کے لیے جانے والوں کا امتحان لیا جائے کہ وہ کس حد تک پیاس برداشت کر سکتے ہیں، خدا پرستی کی راہ میں سختیاں جھیل لینے کا پیمانہ کیا ہے؟ یہی ان کی قوتِ ایمانی کا معیار ہے۔

قول و عمل میں تطابق اور غیرت:

یہ بھی ضروری ہے کہ انسان کے قول و عمل میں عین مطابقت ہو۔ جو الفاظ زبان سے نکلیں، ان پر

اس کا عمل گواہ ہو۔ قول و عمل میں کامل توازن انسانیت کی ایک بہت بڑی خوبی ہے، جس سے ماحول میں اس کے متعلق یقین و اعتماد پیدا ہوتا ہے۔

میرزا فرماتے ہیں:

باخرد گفتم نشانِ اہلِ معنی باز گوے
گفت گفتارے کہ باکردار پیوندش بود

میں نے عقل کل سے پوچھا کہ ذرا مجھے ان لوگوں کا واضح اور روشن نشان تو بتا دے جنھیں اہلِ حقیقت کہتے ہیں؟ عقل نے جواب دیا: ممتاز ترین وصف یہ ہے کہ ان کی گفتار کا سر رشتہ کردار سے وابستہ ہے۔ یعنی جو کچھ کہتے ہیں، اس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ تنہا زبان ہی متحرک نہیں ہوتی، بل کہ ساتھ ہی تمام اعضا بھی برابر حرکت میں آ جاتے ہیں۔ ان کی زبان سے کوئی ایسی بات سنی نہیں جا سکتی جس پر ان کا عمل گواہ نہ ہو۔

انسان کی ایک نہایت اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں غیرت و خودداری کا مادہ بدرجۂ کمال موجود ہو کیوں کہ عزت نفس کا انحصار غیرت و خودداری ہی پر ہے جو انسان عزت نفس کے احساس سے خالی ہو جائے، وہ حقیقی انسانیت کی سطح سے گر جاتا ہے اور اس کا دل سربلندی کی آرزوؤں کا محور نہیں رہ سکتا۔

میرزا فرماتے ہیں:

تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم
گر بہ موج افتد گمان چینِ پیشانی مرا

میں پیاس بجھانے کے لیے دریا پر پہنچ جاؤں اور دریا کی سطح پر لہریں دیکھ کر دل میں خیال گزرے کہ یہ لہریں نہیں بل کہ دریا کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئی ہیں کہ یہ شخص کیوں میرا پانی پینے کے لیے آ گیا ہے، تو میری غیرت اس صورت حال کو ایک لمحے کے لیے بھی قبول نہ کرے گی۔ دریا کے کنارے پیاسا جان دے دوں گا لیکن اس کے پانی کا ایک قطرہ بھی لب تک نہ پہنچنے دوں گا۔

اے کہ اندریں وادی، مژدۂ ہما دادی
برسرم ز آزادی، سایہ را گرانیہاست

ہما ایک افسانوی پرندہ ہے، جسے ادبیات فارسی و اُردو میں بہت مبارک و ہمایوں مانا جاتا ہے۔ کہتے ہیں جس کے سر پر ہما کا سایہ پڑ جائے وہ بادشاہت حاصل کر لیتا ہے۔

میرزا کہتے ہیں:

اے وہ شخص جس نے مجھے ہما کے سایہ افگن ہونے کی خوش خبری سنائی، میں تجھے بتا دوں، میری آزادہ روی کا یہ عالم ہے کہ ہما کا سایہ تو رہا ایک طرف اگر کسی درخت یا اس کی شاخ کا بھی سایہ سر پر پڑ جائے تو بوجھ محسوس ہوتا ہے۔

نزاکتِ احساسات:

سلیم الفطرت انسان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے احساسات حد درجہ نازک ہوں۔ جب تک احساسات نزاکت سے بہ درجہ کمال بہرہ مند نہ ہوں گے، وہ ہم جنسوں کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو محسوس نہ کر سکے گا اور یہ احساس بھی اس شدت کا ہونا چاہیے کہ فوراً تکلیفیں دُور کرنے کے لیے سرگرمی سے کام شروع ہو جائے۔

دارم دلے ز آبلہ نازک نہاد تر
آہستہ پانہم کہ سرِ خار نازک است

میرے دل کی فطرت وطبیعت چھالے سے بھی زیادہ نازک ہے اگر کانٹا میرے راستے میں آ جائے تو سنبھل سنبھل کر قدم دھرتا ہوں کیوں کہ کانٹے کی نوک بہت نازک نظر آتی ہے۔ اُردو میں کہتے ہیں:

کانٹوں کی زبان سُوکھ گئی پیاس سے یارب
اک آبلہ پا وادیِ پر خار میں آوے

الٰہی! وادی کانٹوں سے بھری پڑی ہے اور ان کی زبانیں پیاس کے مارے خشک ہو رہی ہیں۔ ایسا انتظام فرما دے کہ کوئی شخص چھالوں سے بھرے ہوئے پاؤں لے کر آ جائے اور ان کانٹوں پر پھر نکلے تا کہ چھالوں کے پانی سے ان کی زبانیں یعنی نوکیں تر ہو جائیں۔

بے غرضی اور بے نفسی:

بلند ہمت انسان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اخلاص اور بے غرضی و بے نفسی بہ درجہ کمال

موجود ہو۔ وہ جو کچھ کرے اس میں ذاتی منفعت کا شائبہ تک نہ ہو:

تا نیفتد ہر کہ تن پرور بود!!!
خوش بود گر دانہ نبود دام را

پرندے پکڑنے کے لیے شکاری جال بچھاتے ہیں تو اس پر ہلکی ہلکی مٹی ڈال دیتے ہیں تا کہ جال نظر نہ آئے۔ اوپر دانے بکھیر دیتے ہیں تا کہ پرندے دانوں کے لالچ میں اتریں اور جال میں پھنس جائیں۔

میرزا کہتے ہیں، بہتر یہ ہوتا کہ جال پر دانے نہ بکھیرے جاتے تا کہ جو پرندہ بھی اترتا ذوق اسیری کی بناء پر اترتا۔ دانے چگنے کے لیے نہ اترتا جو صریح تن پروری کی دلیل ہے۔ تن پروری یعنی ذاتی اغراض کی بناء پر جال میں پھنسنا شرم ناک ہے۔

در دام بہرِ دانہ نیفتم، مگر قفس!!
چنداں کنی بلند کہ تا آشیاں رسد

صیّاد سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں دانے کی خاطر جال میں نہیں پھنس سکتا، اس لیے کہ تن پرور نہیں ہوں۔ ہاں اگر قفس کو بلند کر کے میرے گھونسلے تک پہنچا دو گے تو فوراً قفس میں چلا جاؤں گا۔

میرزا کو تو یہ بھی گوارا نہیں کہ نیکی کے کام کسی غرض کی بناء پر کیے جائیں یعنی غرض یہ ہو کہ آیندہ زندگی میں جنّت ملے گی جہاں راحت و آسایش کے بہترین سامان مہیّا ہوں گے۔ فرماتے ہیں:

طاعت میں تا رہے نہ مئے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

پھر کہتے ہیں:

مخمورِ مکافات بہ خلد و سقر آویخت
مشتاقِ عطا شعلہ ز گل باز نہ دانست

جو لوگ جزائے اعمال میں سرمست ہیں وہ تو بہشت اور دوزخ کے بکھیڑے میں پڑے ہُوئے ہیں لیکن جس کی نظر صرف اللہ کی رضا پر ہے، اس کے لیے شعلے اور پھول یعنی بہشت اور دوزخ میں امتیاز کی کون سی وجہ ہے؟ جو شے بھی اس کی رضا کی بناء پر مل جائے گی، وہی جان و دل سے قبول ہو گی۔

ایک شعر میں بے غرضی سے خدمتِ خلق انجام دینے کی تصویر نہایت پُر تاثیر انداز میں کھینچ دی ہے:

شعلہ چکد، غم کرا؟ گل شگفد، مزد کو؟
شمعِ شبستانیم، بادِ سحرگاہیم

میں شبستان کی شمع ہوں، جو رات بھر روشن رہتی ہے اور اس سے پے در پے شعلے جھڑتے جاتے ہیں لیکن نہ اسے کسی غم خواری کی آرزو ہے اور نہ توقع۔ میں صبح کے وقت چلنے والی نسیم ہوں، جس سے کلیاں کھل کھل کر لہلہا اٹھتی ہیں لیکن اس خدمت کے لیے کسی سے کوئی اجر، کوئی مزدوری اور کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا۔

انسان ہم جنسوں کی خدمت اسی صورت میں انجام دے سکتا ہے کہ اس میں رات کو جلنے والی شمع اور صبح کو چلنے والی نسیم کی طرح بے غرضی و بے نفسی پیدا ہو جائے اور ایسی ہی خدمت گزاری قابل قدر و ستایش ہے۔

دعوت عمل:

میرزا کے کلام میں دعوت عمل اور اس کے لیے جوش و بے خودی کی مثالیں بھی بہت ملتی ہیں:

ماہ و خورشید دریں دائرہ بیکار نیند
تو کہ باشی کہ بخود زحمت کارے نہ دہی

چاند اور سورج جسامت میں کتنے ہی بڑے ہوں مگر انھیں معنوی عظمت میں انسان سے کیا نسبت ہے؟ لیکن دیکھیے وہ دائرۂ کائنات میں بے کار نہیں، بل کہ مسلسل اور شب و روز وہ کام انجام دے رہے ہیں جو قدرت نے ان کے ذمّے لگا دیا ہے پھر تو کہ خدا کی مخلوقات میں سب سے اشرف و اعلیٰ ہونے کا مدعی ہے، کیوں اپنے لیے کام کی زحمت گوارا نہیں سمجھتا؟ کیوں بے حس و حرکت بیٹھا ہے؟

کوئی ایسا کارنامہ انجام دے، جس سے دنیا کو فائدہ پہنچے اگرچہ اس کام کی پاداش میں تیرے لیے سولی پر چڑھ جانے کی نوبت آجائے۔

آخر کار نہ پیداست کہ در تن افسرد!!
کف خونے کہ بداں زینت دارے نہ دہی

جو خون تیری رگوں میں موجزن ہے اور اس موجزنی ہی کو زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے، کیا معلوم نہیں کہ انجام کار وہ تیرے بدن میں ٹھٹھر کر رہ جائے گا؟ کیوں کہ موت سے کسی انسان کو مفر نہیں اور موت خون کے افسردہ و منجمد ہو جانے ہی کا نام ہے پھر اس خون کو سولی کے لیے باعث زینت بنا دینے پر کیوں آمادہ نہیں ہوتا؟ مطلب یہ کہ موت بہ ہر حال آئے گی، اس سے کسی کو مفر نہیں پھر موت سے ڈرنے کا کیا فائدہ؟ زندگی کسی ایسے کام میں صرف کر جس سے انسانیت کو نفع و آرام حاصل ہو اگر چہ اس کام میں تیرے لیے سولی یا پھانسی کی موت تجویز ہو۔

جُستجو میں بے خودی:

در گرم روی سایہ و سرچشمہ نہ جوئیم
با ما سخن از طوبیٰ و کوثر نتواں گفت

ہم حقیقت کی تلاش میں اس درجہ سرگرم اور بے خود ہیں کہ نہ سایے میں آرام لینے کا خیال ہے اور نہ چشمے کے پانی سے لب تر کرنے کی فرصت ہے پھر ہمیں طوبیٰ اور کوثر کی باتیں کیا سناتے ہو؟

فرو نیامدم، ازبسکہ بیخودم بہ طلب
ہزار بار گذارم برآشیاں افتاد

طلب کی بے خودی میں میرا یہ حال ہے کہ اڑتے اڑتے ہزار مرتبہ گھونسلے پر سے گزر ہوا لیکن میں اترا نہیں کیوں کہ مقصود کی تلاش میں انسان بے خودی کی منزل پر پہنچ جائے تو اسے آرام و آسایش کا خیال ہی کہاں آسکتا ہے؟

مرد کار کے اوصاف میرزا نے جا بجا بیان کیے ہیں:

خیرہ کند مرد را مہرِ درم داشتن
حیف زہم چو خودے چشمِ کرم داشتن

مرد کو دام و درم کی محبت خیرہ کر دیتی ہے۔ اس کی آنکھوں کا نور زائل ہو جاتا ہے۔ کتنے افسوس اور قلق کی بات ہے کہ مرد اپنے جیسے سے بخشش کی امید رکھے؟

باہمہ شکستگی دم ز درستی زدن
باہمہ دل خستگی تابِ ستم داشتن

آفتوں کا نزول جسم کو کتنا ہی توڑ ڈالے لیکن مرد کے لیے یہی زیبا ہے کہ ہر لحظہ کہتا رہے، میں بالکل اچھا اور تندرست ہوں اور مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ ظلم و جور سے دل بے شک زخمی ہو جائے مگر مزید ظلم سہنے کی ہمت میں فرق نہ آئے۔

حق گویم و ناداں بہ زبانم دہد آزار
یارب چہ شدآں فتویِ بر دار کشیدن

میں حق کہتا ہوں اور کسی سے نہیں ڈرتا لیکن نادان زبان سے مجھے بُرا بھلا کہہ کر دکھ پہنچانا چاہتے ہیں۔ الٰہی وہ سولی پر چڑھانے کا فتویٰ کہاں گیا؟

یعنی مردانِ کار معمولی سزاؤں سے مطمئن نہیں ہوتے۔ بڑی سے بڑی سزا کے لیے ہر لحظہ آرزو مند رہتے ہیں۔

چوں عکسِ پل بہ سیل بہ ذوقِ بلا برقص
جا را نگاہ دار وہم از خود جدا برقص

دریاؤں پر پل تعمیر ہوتے ہیں، ان کا عکس دریا کے آئینے میں صاف نظر آتا ہے۔ میرزا کہتے ہیں کہ عکسِ پل سیل میں جس طرح رقص کرتا ہے، اسی طرح تو بلاؤں اور مصیبتوں کے ذوق وشوق میں رقص کر۔ اصل مقام پر قائم رہ لیکن اس سے جُدا رہ کر رقص کا لطف بھی اٹھا لے۔

ذوقے است جستجو، چہ زنی دم ز قطعِ راہ
رفتارگم کن و بہ صدائے درا برقص!!

اگر جستجو اور تلاش کی لذت سے بہرہ مند ہے تو منزلیں طے کر لینے کا دعویٰ چھوڑ دے۔ راستہ طے ہو یا نہ ہو، تیرے لیے یہی بس ہے کہ گھنٹی کی آواز پر رقص کرتا رہے، جو قافلوں کے لیے کوچ کا پیغام ہوتی ہے۔

مطلب یہ کہ جستجو کے کام یاب ہونے یا نہ ہونے سے کوئی سروکار نہ رکھنا چاہیے۔ اصل غرض یہ ہے کہ ذوقِ جستجو کی گرم جوشی اور تازگی میں فرق نہ آئے۔

زمانۂ ماضی میں لوگ قافلے بنا کر سفر کرتے تھے۔ منزل سے روانگی کے وقت گھنٹی بجتی تھی جس کی آواز سن کر سب تیار ہو جاتے تھے۔

در عشق انبساط بہ پایاں نمے رسد
چوں گرد باد خاک شو و در ہوا برقص

عشق میں انبساط، سرور اور شادمانی کبھی تکمیل کی آخری سرحد پر نہیں پہنچتی۔ بہتر یہی ہے کہ خاک ہو جایئے اور بگولے کی طرح ہوا میں رقصاں رہیے۔

میرزا کے نزدیک تو وصال میں بھی عشق و شوق کا فطری جوش کم نہیں ہوتا:

گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال
موج، محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

یعنی موج سمندر میں پہنچ کر بدستور ہاتھ پاؤں مارتی رہتی ہے حالاں کہ موج کے لیے وہ وصال کی منزل ہے۔

بلبل بہ چمن بنگر و پروانہ بہ محفل
شوق است کہ در وصل ہم آرام نہ دارد

بلبل کو پھولوں سے پیار ہے تاہم وہ باغ میں پھولوں کے ہجوم کے اندر بھی آہ و فغاں میں مصروف رہتی ہے۔ پروانہ شمع پر عاشق ہوتا ہے مجلس میں شمع روشن ہوتے ہی پروانے آ پہنچتے ہیں یعنی محبوب سے ملاپ کی منزل میں بھی ان کی بے تابی کم نہیں ہوتی۔

مرد آنکہ در ہجومِ تمنا شود ہلاک
از رشکِ تشنۂ کہ بہ دریا شود ہلاک

مرد وہ ہے جو تمناؤں اور آرزوؤں کے ہجوم میں اس جوان ہمت پر رشک کھاتا ہوا مر جائے، جس نے دریا کے اندر پیاس کی حالت میں جان دے دی۔

نامرد را بہ لخلخہ آسایشِ مشام
مرد از تفِ سموم بہ صحرا شود ہلاک

نامرد کا شیوہ کیا ہے؟ آرام سے لیٹے رہنا اور خوشبوئیں سونگھ کر دماغ معطّر رکھنا۔ مرد کا کام یہ ہے کہ صحرا میں نکل جائے اور بادِ سموم کی حرارت میں جان دے دے۔

صحراؤں، جنگلوں، پہاڑوں، برفستانوں اور سمندروں کی چھان بین میں مردوں نے جانیں قربان کیں اور دنیا کو علم و تحقیق کے ذخیرے فراہم کر دیے۔ یہ نامردوں اور بے ہمتوں کا کام نہ تھا۔

جاہ و منصب اور علم:

میرزا کے کلام میں خارجی اور داخلی فطرت کے متعلق حقایق بھی بہ کثرت بیان ہوئے ہیں۔ میں یہاں صرف چند مثالیں دوں گا:

جاہ ز علم بے خبر، علم ز جاہ بے نیاز
ہم محکِ تو زر نہ دید، ہم زر من محک نخواست

جاہ و منصب علم سے بے خبر ہیں اور علم کو جاہ و منصب کی پروا کبھی نہیں ہوئی۔ جاہ و منصب کی حیثیت ایک ایسی کسوٹی کی ہے، جس نے کبھی خالص سونے کی شکل نہیں دیکھی۔ ہمارا سونا یعنی علم بالکل کھرا ہے، اسے کسوٹی پر پرکھنے کی حاجت ہی پیش نہیں آ سکتی۔

جبر و اختیار:

جبر و اختیار کا مسئلہ فلسفیوں، کلامیوں اور فقیہوں کے درمیان موضوع بحث چلا آتا ہے۔ میرزا کہتے ہیں:

دو برقِ فتنہ نہفتند در کفِ خاکے
بلائے جبر یکے، رنجِ اختیار یکے

امتحان و آزمایش کی دو بجلیوں کو خاک کی مٹھی یعنی انسان میں چھپا دیا گیا ہے۔ ایک جبر کی بجلی، جس کی حیثیت اٹل بلا کی ہے۔ دوسری اختیار کی بجلی جسے حقیقتاً ''رنج اختیار'' کہنا چاہیے، اس لیے کہ اوّل اختیار کامل نہیں، دوم اختیار کے ساتھ جو اسباب و وسائل میسر آنے چاہئیں تھے، میرزا کے نزدیک میسر نہیں آئے۔

پھر فرماتے ہیں:

در آنچہ من نتوانم ز احتیاط چہ سُود؟
بدانچہ دوست نخواہد، ز اختیار چہ حظ؟

جو کچھ میں کر ہی نہیں سکتا، یعنی جو عمل کی دسترس سے باہر ہے، اس میں پرہیز و احتیاط کی کیا ضرورت ہے؟ اسی طرح جو دوست یعنی کارفرمائے قضا و قدر کو منظور نہیں۔ اس میں اختیار مل جانے سے کیا حاصل؟

کائنات کا مطالعہ:

عالم آئینہ راز است چہ پیدا چہ نہاں
تابِ اندیشہ نہ داری، بہ نگاہے دریاب

کائنات کی چیزیں ظاہر و آشکارا ہوں یا پوشیدہ و پنہاں، فطرتِ خارجی ہو یا فطرتِ داخلی، یہ سب راز کا آئینہ ہیں اگر تجھ میں غور و فکر سے کام لے کر حقیقت تک پہنچنے کی ہمت نہیں تو نہ سہی ذرا ایک نگاہ ڈال کر ہی اصل مقصد پر پہنچ جا۔

یہی مضمون اُردو میں یوں باندھا ہے:

نہیں گر سر و برگ ادراک معنی
تماشائے نیرنگ صورت سلامت

اگر حقیقت تک پہنچنے کا سروسامان تیرے پاس نہیں تو کم از کم نیرنگ صورت ہی دیکھ کر لذت یاب ہو جا۔

رنج و راحت:

دنیا میں رنج بھی ہے اور راحت بھی۔ کوئی رنج ایسا نہیں جس کا انجام راحت نہ ہو:

برنج از پئے راحت نگاہ داشتہ اند
بہ حکمت است کہ پائے شکستہ در بند است

پاؤں ٹوٹ جائے تو تختیاں لگا کر پٹیاں باندھ دیتے ہیں یا پلاسٹر لگا دیتے ہیں۔ یہ حکیمانہ فعل ہے۔ مقصود یہ ہوتا ہے کہ شکستہ ہڈیاں پوری طرح جڑ جائیں۔ دیکھیے پاؤں کی بندش میں جو رنج اٹھایا جاتا ہے، اس کا نتیجہ راحت ہے۔

چہ گر کہ ز زخمہ زخم برچنگ زند
پیداست کہ از بہر چہ آہنگ زند

در پردۂ ناخوشی، خوشی پنہاں است
گازر نہ زخشم جامہ بر سنگ زند

گانے والا ساز کے تاروں پر مضراب کی ضرب لگاتا ہے تو اس کا مقصود تاروں کو صدمہ پہنچانا نہیں ہوتا۔ وہ نغمے پیدا کرتا ہے اور نغمے پیدا کرنے کی تدبیر یہی ہے۔ ہر ناخوشی کے پردے میں خوشی چھپی ہوئی ہے۔ دھوبی کو دیکھیے وہ کپڑے دھوتا ہے تو بار بار انھیں پتھر پر مارتا ہے تاکہ میل کچیل نکل جائے۔ یہ غرض نہیں ہوتی کہ کپڑے پھٹ جائیں۔

کائنات میں عملِ ارتقا:

میرزا کے نزدیک کائنات میں ہر لحظہ عملِ ارتقا جاری ہے، لہٰذا وہ بدلتی جاتی ہے اگرچہ ہم تبدیلی کا اندازہ نہیں کر سکتے:

در ہر مژہ برہم زدن ایں خلق جدید است
نظارہ سگالد کہ ہماں است وہماں نیست

مطلب یہ کہ جو مخلوقات ہماری نگاہوں کے سامنے ہے، یہ ہر مرتبہ پلک جھپکنے سے ارتقا کا کوئی نہ کوئی مرحلہ طے کر کے نئی ہو جاتی ہے۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہی جیسی ہے، حقیقتاً ویسی نہیں ہوتی۔

قدرت کی حکمتیں:

کائنات کی تمام چیزوں کا وجود ایک ہی وقت میں نہیں ہوا۔ جان داروں یعنی حیوانوں اور انسانوں کا وجود سب کے بعد ہوا۔ جمادات و نباتات پیش تر ظہور پذیر ہو چکے تھے۔

میرزا قدرت کی حکمتوں اور مصلحتوں پر توجہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

چارہ در سنگ و گیاہ و رنج با جاندار بود
پیش ازاں کیں در رسدآں را مہیا کردہ ای

بیماریاں تو جان داروں میں پیدا ہوئیں۔ ان کے علاج معالجے اور دوا دارو کا معاملہ جمادات و نباتات سے وابستہ تھا۔ دیکھیے جان داروں کے ظہور سے پیش تر جمادات و نباتات مہیا کر دیے۔

انسان معرضِ وجود میں آیا۔ اس نے رفتہ رفتہ جڑی بوٹیوں یا معدنی چیزوں سے دوائیں تیار

کرنی شروع کیں اور یہ سلسلہ بھی ترقی کرتے کرتے کمال پر پہنچ گیا۔ کیا یہ معاملہ حکمت الٰہی کے عجائبات میں سے نہیں کہ انسانی تجربات نے معرفت کے نئے نئے مدارج ضرور طے کیے تاہم ہر چیز اس کائنات میں پہلے سے موجود تھی، جس کے خواص اور خصوصیتوں کا شروع میں کوئی اندازہ نہ تھا۔

حقیقت و مجاز:

میرزا ہمیشہ مجاز کے بجائے حقیقت پر زور دیتے رہے اور ظواہر کے بجائے معنویت ان کے پیشِ نظر رہی۔

موج از دریا، شعاع از مہر حیرانی چراست؟
محو اصل مدعا باش و بر اجزایش مپیچ

موج سمندر سے اور شعاع آفتاب سے ہے۔ ہر لحظہ اصل میں محو رہنا چاہیے۔ اس کے اجزا میں الجھنے سے کیا فائدہ ہے؟ اگر سمندر نہ ہو تو موج کہاں سے آئے؟ سورج نہ ہو تو کرنیں کیوں کر وجود پائیں؟

صورتے باید کہ باشد نغز و زیبا روزگار
گو بہ اکسونش مپوش و گو بہ دیبایش مپیچ

حسین و جمیل صورت درکار ہے، جس سے زمانے کی زیبایش میں اضافہ ہو اگرچہ اس نے مختلف رنگوں کی بیش قیمت مخمل کے لباس نہ پہن رکھے ہوں۔

نشاط جم طلب از آسماں نہ شوکتِ جم
قدح مباش ز یاقوت بادہ گر عنبی است

اصل مقصود شراب ہے، جو سرور و نشاط کا سامان ہے اور عام ادبی روایت کے مطابق شراب ایران کے افسانوی بادشاہ جمشید نے ایجاد کی تھی۔ سرور و نشاط مطلوب ہے جمشید کی شان و شوکت سے کیا سروکار ہے؟ شراب پینے کا پیالہ لعل و یاقوت کا بے شک نہ ہو مگر شراب خالص انگوری ہونی چاہیے۔

پھر ''جام جم'' کا مذاق اڑانے اور اس کی کم حیثیتی واضح کرنے کا نیا پہلو پیدا کر لیا، جو ہر اعتبار سے مدلل و معقول ہے۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

مٹی کا پیالہ جام جم سے اس لیے بہتر ہے کہ اگر ٹوٹ جائے گا تو فوراً بازار سے دوسرا خرید لائیں گے۔ جام جم کا اوّل تو ہاتھ آنا مشکل ہے، وہ ملے گا تو ایک فرد کے کام آئے گا سب اس سے کیوں کر فائدہ اٹھا سکیں گے؟ اگر وہ اتفاق سے کبھی ٹوٹ جائے گا یا گم ہو جائے گا تو دوسرا کہاں سے لائیں گے؟

ایک پُر تاثیر تاریخی مثال:

تاریخی حقایق کی مثالیں بھی میرزا کے کلام میں ملتی ہیں۔ مثلاً:

تو نالی از خلۂ خار و نگری کہ سپہر
سرِ حسینؓ علیؓ بر سناں بگرداند

تو تو کانٹے کی چبھن ہی سے بے قرار ہو کر رونے لگ گیا۔ کیا تجھے آسمان کی بے مہری و بے دردی معلوم نہیں کہ اس نے حضرت علیؓ کے فرزند ارجمند حضرت حسینؓ کا سر مبارک نیزے پر چڑھایا اور اسے جا بجا پھرایا؟

برو بہ شادی و اندوہ دل منہ کہ قضا
چو قرعہ بر نمطِ امتحاں بگرداند
یزید را بہ بساطِ خلیفہ بنشاند
کلیم را بہ لباسِ شباں بگرداند

زمانے کی خوشی اور غم میں دل نہ اٹکا۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ قضا جب امتحان و آزمایش کا قرعہ ڈالتی ہے تو یزید کو خلافت کی مسند پر بٹھا دیتی ہے اور کلیم اللہ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو گڈریوں اور چرواہوں کے لباس میں پھراتی ہے۔

کلام کے متعلق پیش گوئی:

میرزا نے اپنے کلام کے متعلق پیش گوئی بھی کی تھی:

کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

میری قسمت کا ستارا اس وقت قبول کی بلندیوں پر پہنچا ہوا تھا، جب میں عالمِ عدم میں تھا اور اس دنیا میں نہیں پہنچا تھا۔ میرے شعروں کی شہرت سے زمانے کی فضا اس وقت گونجے گی، جب میں پھر عدم میں پہنچ جاؤں گا۔

یہ پیش گوئی بہ ظاہر ذوق ادب کے تصور ارتقا اور رفتار روزگار کے اسلوب کے بارے میں عقلی اندازے پر مبنی تھی۔ میرزا کی شہرت ان کی زندگی میں بھی بہت ہوئی لیکن ان کی وفات سے کم و بیش پچاس سال بعد ان کے کلام کی مقبولیت کا خاص دور شروع ہوا۔ پاک و ہند کا کوئی شاعر نہیں جس پر (شاید اقبال کو مستثنیٰ کرتے ہوئے) اتنی کتابیں لکھی گئی ہوں، جتنی میرزا غالبؔ کی شخصیت یا اس کے کلام پر لکھی گئیں۔ اب دنیا بھر کے ملکوں میں اس کی صد سالہ برسی منائی جا رہی ہے۔ اس پیش گوئی کے پورا ہونے کا اور کون سا ثبوت درکار ہے؟

جن حالات میں میرزا کی زندگی بسر ہوئی، وہ بڑے ہی پریشان کن تھے۔ ایک مرتبہ خود میرزا نے بے تابی کے عالم میں خدا سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

حیف کہ من بخوں تپم، و ز تو سخن رود کہ تو
اشک بہ دیدہ بشمری، نالہ بہ سینہ بنگری

میں خون میں تڑپ رہا ہوں اور اے قادرِ مطلق تیری شان یہ بتائی جاتی ہے کہ تو آنسوؤں کو آنکھ کے اندر گن لیتا ہے اور نالے کو سینے کے اندر دیکھ لیتا ہے۔

بضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقی است:

مجھے احساس ہے کہ مقالہ بہت طویل ہوگیا لیکن اعتراف کرنا چاہیے کہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے اسے میرزا غالبؔ کی فارسی شاعری کے آفتاب کی محض ایک جھلک قرار دیا جاسکتا ہے اور مثنویوں کے متعلق میں کچھ نہیں لکھ سکا جو خاصی تفصیل کی محتاج ہیں خصوصاً آخری مثنوی جس کا نام ”ابرِ گہر بار“ ہے۔

میرزا نے سچ کہا تھا:

گر تنزل نبود، ابرِ بہاری غالبؔ
کہ دُر افشانی و ز افشاندہ شمارے نہ دہی

اے غالبؔ تو بہار کا بادل ہے بہ شرط یہ کہ اس تعبیر کو اپنی کسر شان نہ سمجھے۔ تو موتی برساتا ہے اور برسائے ہوئے موتیوں کا حساب و شمار نہیں بتاتا۔

(میرزا غالبؔ کی فارسی شاعری کے متعلق یہ مقالہ صد سالہ برسی کے سلسلے میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ بھیجا گیا بعد میں یہ مضمون ماہ نامہ فنون لاہور برائے مئی جون ۱۹۶۹ء میں چھپا)

حصّہ سوم- متفرقات

میرزا غالبؔ نقّاد کی حیثیت سے

تنقید کا مطلب ہے جانچنا اور پرکھنا۔ اصطلاح میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی علمی یا ادبی مرقع یا اس کے کسی جز کی اچھائی بُرائی اور حُسن و قبح کو خوب دقّتِ نظر سے جانچا اور پرکھا جائے۔ عبارت، اسلوبِ بیان اور ترتیب و تشریح مطالب کا اندازہ کرتے ہوئے کھرے کو کھوٹے سے الگ کر دیا جائے۔

میرزا غالب کی صلاحیتِ نقد و نظر پر گفت گو کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند باتیں بطور تمہید عرض کر دی جائیں۔ مثلاً میرزا کے زمانے میں فنِ تنقید ارتقا کے اس درجے پر نہیں پہنچا تھا جس پر یہ آج کل پہنچا ہوا ہے بل کہ کہنا چاہیے کہ آزادانہ اور حق شناسانہ جائزوں کا طریقہ ہی بڑی حد تک مفقود تھا یا تو تقریظیں لکھی جاتی تھیں جو مصنف، کتاب اور اس کے نفس مضمون کے بارے میں نہایت عجیب و غریب اور ایک حد تک مضحکہ خیز تحسین و ستایش سے لبریز ہوتی تھیں یا مخالفین تعریضات کی برچھیاں اور تلواریں لے کر صاحب تصنیف پر یورش بول دیتے تھے اور کتاب کی اچھائیوں سے یا تو بالکل قطع نظر کر لیتے تھے یا پھر ان اچھائیوں کو بھی برائیوں کا جامہ پہنا کر منظرِ عام پر پیش کرتے رہتے تھے۔ میرزا کی تصانیف میں تقریظیں بھی موجود ہیں اور ''قاطع برہان'' کی اشاعت سے تا دمِ مرگ انھیں زہرِ تعریضات کے جام بھی پے بہ پے پینے پڑے۔

نفسِ صحت اور حُسنِ کلام:

ادبیات میں تنقید کے لیے صرف وسعتِ معلومات کافی نہیں۔ معلومات کے علاوہ نقاد کے لیے صاحبِ ذوق ہونا بھی ضروری ہے اور ذوق کا درجہ جتنا بلند ہوگا اتنا ہی اس کا معیارِ تنقید بلند ہوگا۔ تنہا وسعتِ معلومات کی بنا پر ہم یہ تو جان سکتے ہیں کہ فلاں چیز صحیح ہے یا نہیں ہے لیکن ادبیات میں حسن کا درجہ نفس صحت سے بالاتر ہے یعنی یہ کہ صحیح چیز ٹھیک اپنے موقع اور محل پر استعمال ہوئی یا نہیں۔ نظم و نثر میں کئی ایسی چیزیں ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں جن کی صحت میں کسی کو کلام کی گنجایش نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ قواعد زبان اور لغت کی رُو سے ان پر انگلی نہیں رکھی جا سکتی لیکن ضروری نہیں کہ معیارِ ذوق کی

ترازو میں بھی وہ پوری اترتی ہوں۔

میرزا غالب کی فارسی اور اُردو نظم ونثر میں پیشِ نظر موضوع کے متعلق بہ کثرت سامان موجود ہے بعض کتابیں تو باے بسم اللہ سے تائے تحت تک تنقید ہی کے تحت آتی ہیں۔ مثلاً ''قاطع برہان''۔ ''لطائف غیبی''۔ ''سوالات عبدالکریم'' اور ''تیغ تیز'' لیکن ان تصانیف کا جائزہ لینے کی شکل یہی ہے کہ سب سے پہلے ان سے مفصل اقتباسات پیش کیے جائیں جن پر میرزا غالب نے یہ تنقیدی کتابیں لکھیں پھر میرزا کی کتابوں سے مختلف ٹکڑے سنا کر موازنہ کیا جائے اور بتایا جائے کہ حق بہ جانب کون ہے۔ اس کے بغیر میرزا کی شانِ تنقید واضح نہیں ہو سکتی لیکن اس قسم کی تفصیلات اس سرسری گفت گو کے دائرے سے خارج ہیں۔ لہٰذا میں جو کچھ عرض کروں گا اس کی حیثیت محض اشاروں کی ہوگی۔ امید ہے کہ اس طرح بھی نقادی کے اس جوہر کی چہرہ کشائی کا بندوبست ایک حد تک ضرور ہو جائے گا جو قدرت نے میرزا کی طبیعت میں ودیعت کیا تھا۔

میرزا کا کارنامہ:

میرزا جس ماحول میں پیدا ہوئے، جس ماحول میں انھوں نے پرورش پائی اور علم حاصل کیا، جس ماحول میں ان کی مشقِ سخن کا آغاز ہوا اس کے مروجات اور معمولات سے وہ یک قلم آزاد و بے نیاز نہیں رہ سکتے تھے تاہم انھوں نے جس طرح اپنے نادر اسلوبِ فکر سے دورِ قدیم اور دورِ جدید میں برزخ کا مقام پیدا کیا۔ اسی طرح تنقید میں بھی ان کو برزخ ہی کا مرتبہ حاصل ہے یعنی پچھلوں سے کامل قطع تعلق نہ کرتے ہوئے آنے والوں کے لیے نئے راستے پیدا کیے اور اپنی انقلاب آفریں فطرت سے کام لے کر جدید دَور کی بنیادیں استوار فرمائیں۔ یہ ان کی نقاد طبیعت اور ان کے ذوقِ سلیم کا کرشمہ تھا کہ اپنے عہد کے ادبی عیوب کا انھیں بہت جلد پورا احساس ہو گیا اور پھر ان عیوب سے نہ محض خود جلد از جلد کنارہ کش ہو گئے بل کہ دوسروں کو بھی کنارہ کشی کی مؤثر دعوت دی۔ نقادانِ فن کی خدمت میں غالباً یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے ادبیات کو جس نہج پر میرزا نے ڈالا تھا یہ آج تک اسی نہج پر جاری ہیں۔

تحریر کے بنیادی اصول:

''پنج آہنگ'' کا دیباچہ میرزا نے اس زمانے میں لکھا تھا جب وہ جوانی کے ابتدائی مراحل میں

تھے اس میں خطوط نویسی کے جو اصول و مبانی پیش کیے ہیں انھیں سامنے رکھ کر غور فرمائیں گے تو صاف آشکار ہو جائے گا کہ یہ انیسویں صدی کے عشرۂ ثالثہ کی صدا نہیں جب کہ ہر بات کو زیادہ سے زیادہ پیچ دار کہنا لازمہ علم و فضل سمجھا جاتا تھا۔ یہ بیسویں صدی عیسوی کی صدا ہے جب کہ تکلفات کو سراسر لغو و لایعنی سمجھا جاتا ہے۔

میرزا کے ارشادات کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ نامہ نگار کو چاہیے کہ نگارش کو مقصود سے زیادہ دُور نہ لے جائے اور تحریر میں تقریر کا رنگ پیدا کرے۔
۲۔ نفسِ مطلب کو ایسے انداز میں قلم بند کرے کہ اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔
۳۔ اگر نامہ نگار کے سامنے زیادہ مطالب ہوں تو تمام مطالب کو انتہائی احتیاط سے جدا جدا بیان کرے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ سب خلط ملط ہو جائیں اور پڑھنے والے کے لیے الجھن کا باعث بنیں۔
۴۔ نامانوس الفاظ اور دقیق استعارات سے عبارت کو پاک رکھا جائے۔ حتی الامکان تحریر کو طول نہ دیا جائے۔
۵۔ لطفِ تحریر کا تقاضا یہ ہے کہ ایک لفظ بار بار استعمال نہ کیا جائے۔
۶۔ زبان کی خوبی کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ لکھنے والے کو پوری کوشش کرنی چاہیے کہ سادگی اور لطافت اس کی عادتؒ بن جائے۔

کیا یہ روشن ہدایتیں صرف وسعتِ معلومات سے پیدا ہو سکتی ہیں؟ میرزا سے پہلے بھی بڑے بڑے عالم گذر چکے تھے اور ان کے زمانے میں بھی یگانۂ روزگار فاضلوں کی کمی نہ تھی لیکن ایسی باتیں صرف علم سے نہیں بل کہ علم کے علاوہ حسنِ ذوق، کمال جدّتِ نظر، دقّتِ اجتہاد اور مشق و مزاولت سے پیدا ہوتی ہیں۔ نامہ نگاری کے یہی روشن اصول تھے جو میرزا کے اُردو مکاتیب میں بوجہ احسن استعمال ہوئے اور اُن کے مکاتیب کو وہ درجہ کمال حاصل ہوا کہ ایک صدی گذر جانے پر بھی وہ اُردو زبان میں بے مثال ہیں۔

''معارف''، اعظم گڑھ نے خوب لکھا ہے:

> اُردو نثر کا انھوں نے ایسا دل کش اسلوب پیدا کیا جس نے اس کا طرز ہی بدل دیا اُردو شاعری میں تو جزوی طور پر ان کے شریک و سہیم بھی نکل سکے ہیں لیکن نثر میں وہ منفرد ہیں ان کی نثر کا جواب آج تک نہ ہو سکا۔

میرزا کی تقریظیں:

میرزا نے بھی اگرچہ اپنے دوستوں کی فرمایشوں پر پُرانے انداز میں چند تقریظیں لکھیں لیکن وہ اپنے طریقِ فکر و نظر کو کاملاً نہ بدل سکے اور اپنا خاص مجتہدانہ نقطہ نظر نہ چھوڑ سکے۔ ان کے عزیز

شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ نے اپنے دیوان کا دیباچہ لکھوایا۔ میرزا عام رواج کے مطابق تفتہ کی مدح میں پھیلاؤ سے کام نہ لے سکے۔ یہ امر غالباً تفتہ کے لیے شکایت کا موجب بنا۔ دیکھیے میرزا جواب میں کیا فرماتے ہیں:

> ”کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کر دیں۔ میرے قصیدے دیکھو، تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کم تر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں کے تذکرے کی تقریظ ملاحظہ کرو کہ ان کی مدح کتنی ہے۔ میرزا رحیم الدین بہادر حیا تخلص کے دیوان کا دیباچہ دیکھو۔ وہ جو تقریظ دیوانِ حافظ کی بہ موجب فرمایش ”جان جاکوب بہادر“ کے لکھی ہے، اس کو دیکھو کہ فقط ایک بیت میں ان کا نام اور ان کی مدح سرائی ہے اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی مطالب ہیں۔ واللہ باللہ! کسی شہزادے یا امیر زادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اس کی مدح اتنی نہ کرتا کہ جتنی تمھاری مدح کی ہے۔ ہم کو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے“۔

یہ نقادِ فکر اور حقایق رس نگاہ تھی جس نے میرزا کو پُرانی روش سے ہٹا کر نئی راہ پر ڈالا۔ یہی روش ہے جو ادبیات میں وجہ افتخار مانی جاتی ہے۔ یہی نقادِ فکر اور حقایق رس نگاہ تھی جس نے شاعری میں میرزا کے اسلوب بیان کو شانِ امتیاز بخشی۔ وہ بالکل سچ کہتا ہے:

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

ایک اہم واقعہ:

مولانا فضل حق خیر آبادی میرزا کے عزیز تر دوست تھے۔ جب ان میں اور شاہ اسمٰعیل میں مسئلہ امکان نظیر و امتناع نظیر پر بحث چھڑی تو مولانا فضل حق نے اپنے نقطہ نگاہ کی تائید میں میرزا سے ایک مثنوی لکھوائی جو اُن کے کلیات نظم فارسی میں موجود ہے لیکن میرزا کی نقاد طبیعت مولانا کے بتائے ہوئے نظریہ کو قبول نہ کر سکی اور انھوں نے مثنوی کے آخر میں صاف لکھ دیا۔

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود
رحمۃٌ للعالمینی ہم بود

یہ بات مولانا فضل حق کی رائے کے مطابق نہ تھی، اس پر وہ بہت بگڑے۔ میرزا نے ان کی دل داری کے لیے مثنوی میں چند شعر بڑھا کر اپنی اس بات کی تغلیط کر دی۔

آئین اکبری کی تقریظ:

سر سید احمد خان مرحوم نے بڑی محنت سے ابوالفضل کی آئین اکبری کی تصحیح فرمائی۔ اسے چھپواتے وقت میرزا کی نقاد طبیعت ریائی مدح و ستایش کے لیے طیار نہ ہوسکی۔ وہ انگریزوں کے عہد کے ایجادات سے بہت متاثر تھے اور اکبر کے زمانے کے آئین کو تقویم پارینہ سمجھتے تھے۔ لہٰذا بے تکلف ان چیزوں کو سراہنے لگے جو انگریزوں کے ذریعے سے اس ملک میں پہنچی تھیں۔ مثلاً پتھر کو پتھر پر رگڑ کر آگ سلگانے کی بجائے دیا سلائی سے کام لینا۔ بھاپ سے جہاز اور ریل گاڑی چلانا۔ تار برقی کے ذریعہ سے دُور دور کی خبریں لمحہ بھر میں منگا لینا۔ فرماتے ہیں:

آتشے کز سنگ بیروں آورند　　ایں ہُنر منداں زخس چوں آورند
تا چہ افسوں خواندہ اند ایناں بر آب　　دُود کشتی راہمی راند در آب
گہ دخان کشتی بہ جیحوں می بُرد　　گہ دخاں گردوں بہاموں می بُرد
نغمہ ہائے زخمہ از ساز آورند　　حرف چوں طائر بہ پرواز آورند
ایں نمی بینی کہ ایں دانا گروہ　　درد و دم آرند حرف از صد کروہ

آخر میں سر سید کے پاس خاطر سے کہتے ہیں:

غالبؔ آئینِ خموشی دل کش است　　گرچہ خوش گفتی نہ گفتن ہم خوش است
در جہاں سیّد پرستی دین تست　　از ثنا بگذر، دعا آئین تست
ایں سراپا فرہ فرہنگ را　　سید احمد خانِ عارف جنگ را
ہرچہ خواہد از خدا موجود باد　　پیش کارش طالع مسعود باد

عُرفی کا ایک شعر:

اب میرزا کی نقادی کی ایک دو مثالیں اُردو میں بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔ عرفی کے حمد والے قصیدے کا مشہور شعر ہے:

منکہ باشم عقل کل را ناوک اندازِ ادب
مرغ اوصاف تو از اوج بیان انداختہ

عام شارحین اس کی جو شرح فرماتے ہیں وہ خود میرزا کی زبان سے سنیئے۔ فرماتے ہیں:

اس کی جو شرح چھاپے میں لکھی ہے اس کو ملاحظہ کیجیے اور معانی میرے خاطر نشاں کیجیے تو میں سلام کروں۔ پہلے نظر یہاں لڑنی چاہیے کہ ''از اوج بیان انداختہ'' کا فاعل کون ہے اور مفعول کون ہے اگر ''عقل کل'' کو ''انداختہ'' کا مفعول اور ''منکہ'' کے کاف کو کدامیہ ٹھہراؤ گے تو بے شبہ ''انداختہ'' کے فاعل دو ٹھہریں گے۔ ایک ''ناوک انداز ادب'' اور ایک ''مرغ اوصاف تو'' ایک فعل اور دو فاعل، یہ کیا طریق اور کیسی تحقیق ہے؟

مروجہ شرح پر تنقید کے بعد خود یوں معنی بیان کرتے ہیں:

''من انداختہ'' کا مفعول ''را'' مقدر، ''منکہ'' کا ''کاف'' توصیفی، ''ناوک انداز ادب'' ادب آموز یعنی استاد۔ ''مرغ توصیف تو'' ''فاعل'' مجھ کو کہ عقل کا استاد ہوں۔ تیرے مرغ توصیف نے اوج بیان سے گرایا۔ ''عقل کل'' تک کہ وہ علویوں سے اعلیٰ ہے اس کا ناوک پہنچ سکتا تھا مگر مرغ اوصاف اس مقام پر ہے۔ جہاں اس ''ناوک انداز'' کو ناوک کے پہنچانے کی گنجایش نہیں۔ اوجِ بیان سے گرنا عاجز آ جانا ہے۔ قدرت وہ کہ عقل کل سے بھی زیادہ اور عجز یہ کہ اوجِ بیان سے گر گیا۔ کیا اچھا مبالغہ ہے مرغ اوصاف کی بلندی کا اور کیا مضمون ہے اظہار عجز باوجود دعوائے قدرت۔

ظہوری کا ایک شعر:

ظہوری کا ایک شعر ہے:

مروت کرد شبہابر تو سیر بام و در لازم
نمی باشد چراغ خانہ ہائے بے نوایاں را

اس کا عام مطلب یہی سمجھا جائے گا کہ تو مروت سے کام لے کر راتوں کے اندھیرے میں کوٹھے پر چڑھ کر دیکھے تو معلوم ہو جائے کہ بے نواؤں کے گھروں میں ایک دیا تک موجود نہیں اب میرزا سے اس شعر کی شرح سنیئے پھر اندازہ فرمائیے کہ میرزا کیوں ظہوری کو ''روح روان معنی'' کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

ظہوری کا ممدوح اور معشوق ایک ہے یعنی سلطان جلیل القدر ابراہیم عادل شاہ۔ بادشاہوں کے منظر بلند ہوتے ہیں اور کیا بعید ہے کہ رعایا اور ملازمین میں سے کچھ لوگ زیر قصر رہتے ہوں۔ اس واسطے بادشاہ دن کو اس منظر بلند پر نہیں چڑھتا کہ مبادا رعیت یا ملازموں کی جورو بیٹیاں نظر آئیں رات کو ان کے گھر تاریک ہوتے ہیں اگر کوئی بلند مقام پر چڑھا تو کچھ نظر نہیں آئے گا۔ یہ مدح ہوئی عفت کی۔ اب ابہام کی سوچیے۔ ممدوح نے راتوں کو کوٹھے پر چڑھنا اپنے اوپر لازم کیا۔ اس واسطے کہ (بے نواؤں کے) گھروں میں چراغ نہیں اگر کسی کپڑے میں پیوند لگانا یا چمڑے کی کوئی چیز گانٹھنی یا کسی مریض کا تفحص حال منظور ہو تو وہ گھر اس ممدوح کے پرتو جمال سے منور ہو جائے۔ چراغ کی حاجت باقی نہ رہے…… مروت کا فرہ وجدانی ہے۔ سوا اُس لفظ کے کوئی لفظ کام نہیں آتا اگر حفظ ناموس رعایا ہے تو مروت ہے اگر مفلسوں کی کاربرآری ہے تو مروت ہے۔

اصل نقادی یہی ہے کہ نگاہ ایک ایک لفظ میں پھرے اور معلوم کرے کہ وہ کس غرض سے شعر میں لایا گیا اور مضمون شعر کی ترکیب و توضیح میں اس کا مقام اور اس کی حیثیت کیا ہے۔ یہ میرزا کی شان نقادی کی محض ایک جھلک تھی۔ اس بارے میں تفصیلی گفت گو کے لیے نئی صحبت درکار ہے۔

(المعارف لاہور۔ فروری ۱۹۶۹ء)

میرزا غالبؔ اور میرتقیؔ

''یادگارِ غالب'' میں خواجہ حالیؔ مرحوم نے لکھا ہے:

> ''جس روش پر میرزاؔ نے ابتدا میں اُردو شعر کہنا شروع کیا تھا، قطع نظر اس کے کہ اس زمانے کا کلام خود ہمارے پاس موجود ہے، اس کی روش کا اندازہ اس حکایت سے بہ خوبی ہوسکتا ہے۔ خود میرزا کی زبانی سنا گیا ہے کہ میرتقی نے جو میرزاؔ کے ہم وطن تھے۔ ان کے لڑکپن کے اشعار سن کر یہ کہا تھا کہ اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے رستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا، ورنہ مہمل بکنے گا''۔

حاشیہ میں مرقوم ہے کہ میرزاؔ کے اشعار ان کے بچپن کے دوست نواب حسام الدین حیدر خاں (والد حسین میرزا ناظر) نے میرتقی کو دکھائے تھے۔

مجھے ابتدا ہی سے اس حکایت کے متعلق شبہات رہے ہیں اور جب کبھی اس پر غور کیا یہی احساس اور یہی تاثر لے کر اٹھا کہ یہ صحیح نہیں ہوسکتی۔

خواجہ حالیؔ نے روایت کی سند کے سلسلے میں الفاظ ایسے استعمال کیے ہیں جن سے متبادر ہوتا ہے کہ یہ واقعہ انھوں نے بلاواسطہ غالبؔ سے نہیں سنا بل کہ حلقۂ ارادت کے کسی دوسرے فرد نے اسے بیان کیا۔ یہی وجہ ہے کہ لکھا: ''خود میرزاؔ کی زبانی سُنا گیا ہے''۔ یہ نہیں لکھا کہ ''میں نے یا ہم نے خود میرزاؔ سے سنا''۔

لیکن خواجہ حالیؔ نے بالواسطہ سنا یا بلاواسطہ سنا اس حقیقت میں شبہہ نہیں ہوسکتا کہ جس حد تک خواجہ صاحب کی شنید کا تعلق ہے یہ بے بنیاد نہیں ہوسکتی۔ ان کی رائے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، ان کی معلومات میں کلام کی گنجایش نکل سکتی ہے لیکن یہ وہم بھی نہیں ہوسکتا کہ انھوں نے کوئی واقعہ اطمینان بخش تحقیق کے بغیر درج کیا ہوگا۔

پھر کیا یہ سمجھا جائے کہ خواجہ صاحب کو غلط فہمی ہوئی؟ یا جس ذریعہ سے انھوں نے سُنا وہ قابلِ اعتماد نہ تھا؟ خدا جانے میرزا نے کیا کہا اور اس شخص نے کیا سمجھا۔ یا سب سے آخر میں یہ مان لیا جائے کہ میرزا نے عالم سرور میں ’’گل افشانی گفتار‘‘ کی بہار دکھاتے ہوئے ایسی کوئی بات کہہ دی اور سننے والوں نے یا خود خواجہ صاحب نے اسے حقیقت سمجھ لیا حالاں کہ عالمِ جذب کی طرح عالم سرور کی ساری باتیں بھی واقعیت پر محمول نہیں ہونی چاہئیں۔

یہ بھی معلوم ہے کہ جس زمانے میں خواجہ صاحب میرزا کے پاس پہنچے اس زمانے میں میرزا کی شہرت و عظمت مسلّم ہو چکی تھی اور انھیں اپنی یگانگی کے اثبات کے لیے کوئی ایسی حکایت وضع کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

میں نے ایک مرتبہ مولانا ابوالکلام آزادؔ کی خدمت میں اپنے شبہات پیش کیے اور اس حکایت کو مستبعد ظاہر کیا تو انھوں نے فرمایا کہ عام حالات کے اعتبار سے تو یہ ضرور مستبعد معلوم ہوتی ہے لیکن خاص خاص حالات میں چنداں مستبعد بھی نہیں۔ میرزا نے خود لکھا ہے کہ میری تیرہ برس کی عمر تھی جب ملاّ عبدالصمد میرے مکان پر آ کر مقیم ہوا اور فارسی زبان کے اصول و قواعد میرے دماغ میں پیوست کر دیے۔ عبدالصمد دو برس ٹھہرا تھا اگر تیرہ برس کی عمر میں آیا ہوگا تو زیادہ سے زیادہ پندرہ برس کی عمر تک استفادہ کا موقع ملا ہوگا۔

اگر غالبؔ کی قدرتی استعداد و مناسبت کا یہ حال تھا کہ چودہ برس کی عمر میں فارسی زبان کے ان رموز و غوامض کا متحمل ہو سکتا تھا جن سے سراج الدین علی خان آرزوؔ، شمس الدین فقیرؔ اور ٹیک چند بہارؔ جیسے دماغ سوختگان مدارس عمر بھر کے درس و تدریس کے بعد بھی آشنا نہ ہو سکے تو یہ بات کیوں مستبعد تصور کی جائے کہ گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا ہو اور ندرت و غرابت کی وجہ سے لوگوں میں اس بات کا چرچا ہونے لگا ہو حتیٰ کہ کسی نے یہ تذکرہ میر صاحب تک پہنچا دیا ہو۔

پھر مولانا نے اپنے حالات سناتے ہوئے فرمایا کہ خود میں نے اسی عمر میں شاعری شروع کر دی تھی۔ میری نثر نویسی کا آغاز بھی اسی عمر میں ہوا۔ حکیم عبدالحمید فرخؔ نے ’’ارمغان فرخ‘‘ کے نام سے ایک گلدستۂ اشعار بمبئی سے نکالا تھا۔ کلکتہ میں بعض شعرا اس کی ماہ وار طرحوں پر مشاعرے کرنے لگے میں نے بھی ایک طرح پر گیارہ شعر کی غزل کہی اور وہ ’’ارمغان فرخ‘‘ میں شائع ہوئی۔

اس زمانے میں میرزا غالبؔ کے ایک شاگرد نادر شاہ خاں شوخیؔ رام پوری کلکتہ میں مقیم تھے

انھیں کسی طرح یقین نہیں ہوتا تھا کہ جو غزلیں میں سناتا ہوں میری کہی ہوئی ہیں۔ ایک دن مسجد سے نکل رہا تھا پاس ہی ایک کتب فروش کی دکان تھی۔ نادر شاہ خاں وہاں بیٹھے ہوئے تھے مجھے روک لیا اور امتحاناً ایک طرح دے کر کہا کہ ابھی غزل کہہ دو میں نے بیٹھے بیٹھے چھ شعر کہہ دیے۔ فرمانے لگے اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہیے۔ میں نے ایک شعر اور کہہ دیا۔ حیران ہو کر کہنے لگے: ''دس بارہ برس کے صاحبزادے ہو اور یہ کلام؟ خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی''۔

مولانا فرماتے تھے کہ میں نے یہ حالات صرف رفع غرابت کے لیے سنائے ہیں اگر میں اس عمر میں تک بندی کرنے لگا تھا تو غالبؔ جیسی شخصیت کے لیے جسے قدرت نے شاعری ہی کے لیے پیدا کیا تھا یہ بات کیوں مستبعد تصور کی جائے؟

لیکن مجھے تعجب اس بات پر نہیں تھا کہ غالبؔ نے گیارہ برس کی عمر میں شاعری شروع کی۔ تعجب اس بات پر تھا اور ہے کہ گیارہ برس کی عمر کے لڑکے کے شعر آگرہ سے میرؔ تقی کے پاس لکھنؤ کیوں کر پہنچے؟ ان کے متعلق میرؔ جیسے کہنہ مشق اور کہن سال استاد سے رائے لینے کی ضرورت کیسے محسوس ہوئی؟ کیوں محسوس ہوئی؟ آگرہ میں ایسا کون تھا جس نے غالبؔ کے طبعی جوہروں کا اندازہ بالکل ابتدائی دور میں کر لیا تھا پھر مزید اطمینان کی غرض سے اس معاملے پر میرؔ سے مُہر تصدیق ثبت کرانا ضروری سمجھا گیا؟

اگر میرؔ تقی اور میرزا ایک شہر میں مقیم ہوتے تو اس حالت میں میرؔ صاحب کی ''بد دماغی'' یا ''کم دماغی'' کے پیش نظر اس قسم کا واقعہ تعجب انگیز سمجھا جاتا۔ میرؔ بڑے بڑے شاعروں بل کہ امیروں اور رئیسوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا یہ کیوں کر ممکن تھا کہ نوے برس کی عمر میں گیارہ برس کے بچے کے شعر دیکھتا اور ان پر رائے زنی کرتا لیکن آگرہ سے شعروں کو لکھنؤ بھیج کر میرؔ سے رائے لینا تو کسی حالت میں بھی قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتا۔

نواب حسام الدین حیدر خاں نامیؔ شاہان اودھ کے قرابت دار تھے۔ وہ پہلے لکھنؤ میں رہتے تھے پھر دہلی میں مقیم ہو گئے۔ بلی ماروں کے کوچے میں ان کی عظیم الشان حویلی تھی وہ عمر میں غالبؔ سے بہت بڑے تھے ان کے دو بیٹے مظفر الدولہ اور حسین میرزا خاطرؔ غالبؔ کے ہم عمر اور عزیز دوست تھے۔ حسام الدین حیدر خاں نے ۱۸۴۶ء میں وفات پائی۔ غالبؔ کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ سے ان کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ اس وجہ سے وہ غالبؔ کو بھی اپنا عزیز سمجھتے تھے لیکن یہ کیوں کر مان لیا جائے کہ جب غالبؔ گیارہ بارہ برس کے تھے اور آگرہ میں رہتے تھے تو نواب حسام الدین حیدر

خاں نے آگرہ جا کر ان کے منتخب اشعار لیے اور لکھنؤ پہنچ کر انھیں میرؔ تقی کے ملاحظہ میں پیش کیا؟

یہ معلوم ہے کہ غالبؔ کی ولادت ۸-رجب ۱۲۱۲ھ کو ہوئی اور میرؔ تقی نے ۲۰-شعبان ۱۲۲۵ھ کو وفات پائی گویا میرؔ کی وفات کے وقت غالبؔ کی عمر صرف تیرہ برس ایک مہینا اور بارہ دن تھی اگر گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنے شروع کیے تو سمجھنا چاہیے کہ ان کی شاعری کا آغاز ۱۲۲۳ھ میں ہوا۔

اب زیرِ غور حکایت میں استبعاد کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے۔ یہ معلوم ہے کہ میرؔ عمر کے آخری حصے میں ضعفِ بصر اور بعض دُوسرے امراض مزمنہ میں مبتلا ہو گئے تھے۔ میل جول اور خلا ملا سے متنفر تو پہلے ہی تھے۔ امراض کی شدت گرفت نے انھیں بالکل گوشہ نشیں بنا دیا۔ وفات سے تین برس پیش تر ان کی صاحب زادی کا انتقال ہوا۔ اگلے سال ایک صاحب زادہ فوت ہو گیا۔ اس سے اگلے سال اہلیہ داغ مفارقت دے گئی۔ ان صدموں کے باعث ان کے حواس میں فتور آ گیا تھا جسے عقیدت مند ہوش و حواس کی ''وارفتگی'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

ربیع الثانی ۱۲۲۵ھ میں وجع مفاصل اور درد قولنج کے شدید دورے شروع ہو گئے۔ اطبّا نے مشورہ دیا کہ قبض بالکل نہیں رہنا چاہیے اس وجہ سے تلیین ضروری سمجھی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اعلاق بطن شروع ہو گیا اور ایک ایک دن میں ڈیڑھ ڈیڑھ سو اسہال آنے لگے۔ اسی حالت میں انتقال ہوا۔

ظاہر ہے کہ ۱۲۲۳ھ یا زیادہ سے زیادہ ۱۲۲۴ھ میں میر صاحب مختل الحواس ہو چکے تھے۔ زندگی کے آخری پانچ چھ مہینے انھوں نے اس حالت میں گزارے کہ گویا عالم بقا کے لیے پابہ رکاب بیٹھے تھے۔

غرض جس بزرگ کی زندگی کے آخری دو تین برس وارفتگی حواس اور ہجوم امراض میں گزرے اس کے متعلق یہ روایت کیوں کر قابلِ یقین ہو سکتی ہے کہ آگرہ سے گیارہ بارہ برس کے بچے کے اشعار اس کے ملاحظہ کے لیے لکھنؤ بھیجے گئے۔ اس نے اشعار دیکھے اور یہ رائے ظاہر کی کہ اگر اس بچے کو کامل استاد مل جائے گا اور سیدھے راستے پر ڈال دے گا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکے گا۔

(ماہِ نو-کراچی-فروری ۱۹۴۹ء)

میرزا غالبؔ کی صد سالہ برسی

میرزا غالبؔ کا انتقال ۲؍ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ (۱۵؍فروری ۱۸۶۹ء) کو ہوا تھا۔ گویا سنین قمری کا حساب پیش نظر رکھا جائے تو مرحوم کی صد سالہ برسی میں ان سطور کی تحریر کے وقت زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ مہینہ باقی رہ گیا ہے۔ میرزا کو ہر دائرے میں جو ہردل عزیزی حاصل ہے، اس کے پیش نظر صد سالہ برسی پورے اہتمام سے منانی چاہیے تھی لیکن میرے علم کے مطابق اب تک اس کے لیے نہ کوئی تیاری کی گئی ہے اور نہ چند روز میں وسیع پیمانے پر شایانِ شان تیاری ممکن نظر آتی ہے۔ سنین عیسوی کے مطابق صد سالہ برسی میں کم وبیش تین سال باقی ہیں۔ اس مدت میں یقیناً زیادہ سے زیادہ تیاری کی جاسکتی ہے، بہ شرط یہ کہ یہ تقریب اہتمام سے منانی منظور ہو۔ نیز جو کچھ کیا جائے، ضبط ونظم اور اتحاد و یک آہنگی سے کیا جائے۔ یہ نہ ہو کہ بے نظمی کی حالت میں ہر مقام پر یہ کام شروع کر دیا جائے۔ اس طرح وقت، قوت اور روپیہ بھی بلاضرورت صرف ہوگا اور اصل کام بھی اس پیمانے پر انجام نہ پائے گا، جس پر اسے انجام دینا میرزا غالبؔ کے لیے نہیں، بل کہ اس سلسلے میں ہمارے مقاصد کے لیے بھی ضروری ہے۔

مرکزی مجلس اور عام جلسے:

نظم وترتیب کا تقاضا یہ ہے کہ ایک مرکزی مجلس بن جائے، جس کی شاخیں تمام اہم مقامات پر قائم ہو جائیں۔ کام کا ایک پہلو یہ ہے کہ فروری ۱۹۶۹ء میں ہر مقام پر جلسے کیے جائیں، جن کے لیے مرکزی مجلس مختلف مقامات کی شاخوں کے مشورے سے تاریخیں مقرر کر دے۔ کم از کم آس پاس کے شہروں میں جلسوں کی تاریخیں الگ الگ رکھی جائیں تو ایک فائدہ یہ ہوگا کہ ان شہروں کے ارباب ذوق موقع پاکر ہمسایہ شہروں کے جلسوں سے بھی مستفید ہوسکیں گے۔

جلسوں میں جو تقریریں ہوں یا جو مقالے اور نظمیں پڑھی جائیں، انھیں رسمی طور سے پورا کرنے پر قناعت نہ کر لی جائے، بل کہ اصل تقریب کو افادیت کے اعتبار سے زیادہ گرانقدر بنانے کا اہتمام

پیش نظر رکھا جائے۔ بہتر ہو کہ ہر مقامی مجلس مرکزی مجلس کے مشورے سے ان رودادوں کو شایع کر دے اور مرکز کی طرف سے تمام تقریروں، مقالوں اور نظموں کا انتخاب چھاپا جائے۔

یقین ہے کہ ریڈیو پاکستان بھی یہ تقریب خاصے اہتمام سے منائے گا۔ غالباً وہ اپنا پروگرام ایک ہفتے یا اس سے بھی زیادہ مدّت پر پھیلا دے۔

تمام تقریبات میں تنوع کا لحاظ ضروری ہے۔ صرف جامع علمی مقالوں اور فاضلانہ تقریروں ہی پر زور نہ دیا جائے، عوامی دل چسپی بھی پیش نظر رکھی جائے اور عوامی تقریبات حقیقتاً تنوع ہی کی بنا پر کامیاب و نتیجہ خیز ہوتی ہیں۔ خواجہ حالی مرحوم کا یہ ارشاد بے شائبہ ریب انسانی نفسیات کے صحیح جائزے پر مبنی ہے:

اہلِ معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی
بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں، تماشائی بھی

حقیقی کام:

تاہم یہ تو کام کا ایک عام پہلو ہے، جسے جاذب و ہمہ گیر اور مفید دل کشا بنانے کے لیے جو کچھ بھی کیا جائے، قابل تحسین اور درخور ستایش ہوگا لیکن اگر ہمارا جوشِ عمل اور ولولۂ کار صرف اسی پہلو تک محدود رہا تو ظاہر ہے کہ اصل تقریب کا حق ادا نہ ہو سکے گا۔ حقیقی کام یہ ہے کہ میرزا کی تصانیف کو عام کیا جائے۔ وہ چیزیں عوام سے قریب تر لائی جائیں، جن کی بناء پر میرزا کو شعر و ادب میں یگانہ حیثیت حاصل ہوئی۔ میں نے مرکزی مجلس کی تجویز اسی غرض سے پیش کی ہے کہ اس حقیقی کام کے بارے میں مناسب تجاویز سوچی جائیں اور نظم و ترتیب سے انھیں لباسِ عمل پہنایا جائے۔

بلاشبہہ میرزا کی بعض اُردو تصانیف کے سلسلے میں خاصا کام ہو چکا ہے لیکن بعض کے متعلق ابھی تک شاید ابتدائی قدم بھی مناسب طریق پر نہیں اٹھایا جا سکا۔ یعنی قریباً ایک سو سال کے بعد وہ چھپیں بھی تو ایسے انداز میں کہ بس تبرک کے طور پر محفوظ ہو گئیں۔ تاہم ان سے استفادہ اہل علم کے خاص حلقے ہی تک محدود رہا۔

فارسی کلام:

لیکن جس حد تک مجھے علم ہے، میرزا کی فارسی تصانیف، خصوصاً کلیات کے متعلق تو اب تک کچھ

بھی نہیں ہوا حالاں کہ میرزا نے کہا تھا:

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہاے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من است

ان تصانیف میں بے شمار تلمیحات ہیں، جن کی تشریح ضروری ہے اگرچہ وہ مجمل ہی ہو۔ بیش تر قطعات خاص کاموں کے سلسلے میں لکھے گئے تھے۔ ان کاموں کی تشریح کے بغیر ان کے اشعار سے خوانندگان کرام پوری طرح محظوظ نہیں ہو سکتے۔ قصائد میں بھی میرزا نے جا بجا اپنے متعلق خاص تفصیلات بتائی ہیں۔ ضروری ہے کہ یہ تفصیلات واضح انداز میں قلم بند کر دی جائیں۔ نیز ممدوحین کا تذکرہ اس حد تک بہ ہر حال ضروری ہے کہ ہر قصیدے کے مقصد و مطلب کا کوئی پہلو چھپا نہ رہے۔

تقسیم کی ضرورت:

مجھ سے پوچھا جائے تو عرض کروں گا کہ پورے فارسی کلام کو کلیات کی شکل میں چھاپنے کے بجائے یہ مناسب ہوگا کہ قطعات و مثنویات ایک جلد میں چھاپی جائیں۔ قصائد ایک جلد میں۔ غزلیات و رباعیات ایک جلد اگر تین کے بجائے چار جلدیں کر لی جائیں تو اور بھی اچھا ہے۔ مثلاً قطعات، ترکیب بند، ترجیع بند وغیرہ ایک جگہ، مثنویاں ایک جگہ، قصائد ایک جگہ اور غزلیات و رباعیات ایک جگہ۔

پھر کلیات، ''سبد چیں''، ''باغ دو در'' وغیرہ کو الگ الگ رکھنا ضروری نہیں۔ سب کی مختلف چیزیں اکٹھی کر دی جائیں۔ البتہ جس کتاب سے کوئی چیز لی گئی ہے، اس کی تصریح مناسب ہوگی تاکہ کتابوں کی یاد برابر محفوظ رہے۔ میرزا کے سوانح میں بہ ہر حال تمام کتابوں کا ذکر آئے گا اگر کوئی صاحب یہ معلوم کرنا چاہیں کہ فلاں کتاب کی چیزیں کون کون سی ہیں تو انھیں کوئی دقت پیش نہ آئے گی۔

تاریخوں کا اندراج:

پھر بعض قطعوں، مثنویوں، ترکیب بندوں، قصیدوں یا غزلوں کی تاریخیں یا تو معلوم ہیں یا ایسے قرائن موجود ہیں، جن کی بنا پر تاریخوں کا قطعی یا تخمینی تعین ممکن ہے، ان کا اندراج ضروری ہے۔ خود مختلف کتابوں کی تاریخ طباعت پیشِ نظر رکھ کر بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کون سا کلام کس دور کا ہے۔ مثلاً ''سبد چیں'' کا بیش تر کلام (بہ استثناء حبسیہ) کلیات بہ غرض طباعت منشی نول کشور کے حوالے

کرنے سے اس کتاب کے چھپنے تک کا ہے۔ ''باغ دودر'' اس سے بھی بعد کا ہے اگر تھوڑی سی محنت اور کاوش سے یہ کام ایک حد تک انجام پا جائے تو خوانندگان کرام کو یا ان میں سے اہل نظر کو میرزا کے افکار و تصورات اور اسلوب و انداز کے ارتقائی مراحل کا اندازہ کرنے میں سہولت رہے گی۔

اُردو اور فارسی کے مشترک اشعار:

اُردو دیوان میں ایسے اشعار بھی ہیں، جن سے ملتے جلتے اشعار فارسی کلیات میں موجود ہیں۔ ان کی بھی نشان دہی کر دی جائے تو اصحابِ علم و فضل غور کر سکیں گے کہ اصل مضمون فارسی میں بہتر طریق پر ادا ہوا یا اُردو میں۔ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ میرزا نے فارسی یا اُردو میں کوئی ایسا مضمون بیان کیا، جو اصلاً کسی استاد کے کلام میں موجود تھا لیکن جس انداز میں اسے بیان ہونا چاہیے تھا، نہیں ہوا تھا، میرزا نے اس میں زیادہ جامعیت پیدا کر دی، اسے زیادہ طبعی اور فطری بنا دیا۔ پڑھتے ہی یقین ہو جاتا ہے کہ اسے پیش کرنے کی صحیح صورت وہی تھی، جو میرزا نے اختیار کی۔

کلیاتِ نثر:

کلیات نثر فارسی کے سلسلے میں بھی خاصا کام باقی ہے مثلاً مکاتیب یک جا ہو جائیں۔ جس طرح اُردو کے مکاتیب صرف اردوئے معلّیٰ اور عود ہندی تک محدود نہ تھے، اسی طرح فارسی کے مکاتیب اتنے ہی نہ تھے، جتنے پنج آہنگ میں چھپے۔ اس سلسلے میں میرے عزیز دوست عرشی رام پوری بہت کچھ کر چکے ہیں لیکن مکاتیب کے علاوہ کلیات نثر کی دوسری کتابیں بھی مفصل حواشی کے ساتھ شائع ہونی چاہئیں۔ اسی طرح میرزا کی باقی تصانیف کی اشاعت بھی بہ اہتمام خاص ضروری ہے اور اس سلسلے میں محض اشارہ کر دینا میرے نزدیک کافی ہے۔

اُردو مکاتیب:

میرے نزدیک اُردو مکاتیب کے مختلف مجموعے بھی الگ الگ مرتب کر دینا ضروری ہے۔ جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں، حسن تحریر اور لطف نگارش کے ساتھ جزئیات کے بیان و توضیح میں جو مقام بلند میرزا غالب کو حاصل ہے اس کی مثال شاید ہی مل سکے۔ لہٰذا میرا عقیدہ مدّت سے یہ ہے کہ اگر ہم مکاتیب کے مختلف حصے درسگاہوں ہیں پڑھانے کی غرض سے مختلف جماعتوں کے معیار کے مطابق مرتب کر دیں تو وہ اُردو سکھانے کے لیے زیادہ مفید ہوں گے۔

مرکزی مجلس کی ترکیب:

یہ پیشِ نظر کام کا ایک سرسری خاکہ ہے۔ اغلب ہے، دوسرے احباب اور اہل علم کے نزدیک اصل مقصد کے لیے مفید تر تجاویز ہوں۔ مدعا صرف یہ ہے کہ اس طرف فوری توجہ ضروری ہے۔ مرکزی مجلس میں صرف اہل علم ہی نہیں، تاجرانِ کتب اور ناشروں کے نمایندے بھی شامل رکھے جائیں۔ طباعت واشاعت کتب کے سلسلے میں ان کے مشورے بے حد کارآمد ہوں گے۔

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں نے جو کچھ اُوپر پیش کیا ہے، اس میں سے بعض کی مثالیں بھی دے دوں تاکہ میرا مدعا بہ خوبی واضح ہو جائے۔

پہلی مثال:

کلیات فارسی کا دسواں قطعہ پیش نظر رکھ لیجیے۔ جو ''ساقی بزم آگہی'' سے گفت گو پر مشتمل ہے۔ میرزا نے پہلے وجود، نمود اشیاء، حب جاہ و منصب، مقصد سفر کلکتہ، مخالفوں سے برتاؤ کے متعلق سوالات کیے۔ ہر سوال کا جواب ''ساقی بزم آگہی'' دیتا جاتا ہے۔ ان جوابوں کو خود میرزا کے افکار و تاثرات سمجھنا چاہیے پھر دہلی، بنارس، عظیم آباد، دریاے سوہن کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آخر میں کلکتہ کا ذکر ہے۔ پورے قطعے کا اصل محرک یہی تھا۔ فرماتے ہیں:

گفتم: ایں جاچہ شغل سود دہد؟ گفت: از ہر کہ ہست ترسیدن
گفتم: ایں جاچہ کار باید کرد؟ گفت: قطع نظرز شعر و سخن
گفتم: ایں ماہ پیکراں چہ کس اند؟ گفت: خوبانِ کشورِ لندن
گفتم: ایناں مگر دلے دارند؟ گفت: دارند لیک از آہن
گفتم: از بہر داد آمدہ ام گفت: بگریز و سر بسنگ مزن

یعنی میں نے ''ساقی بزم آگہی'' سے پوچھا کلکتہ میں کون سا شغل سُودمند ہو سکتا ہے؟ اس نے جواب دیا، جہاں جو بھی ہے اس سے ڈرتے رہنا چاہیے (کیوں ڈرتے رہنا چاہیے؟ اس لیے کہ لوگ حاکم ہیں) میں نے پوچھا: یہاں کون سا کام کرنا چاہیے؟ جواب ملا: شعر وسخن سے قطع نظر کر لینا ضروری ہے۔ (کیوں؟ اس لیے کہ انگریزوں کو شعر وسخن سے قطعاً کوئی واسطہ وعلاقہ نہ تھا) میں نے پوچھا: ماہ

پیکر کون ہیں؟

جواب ملا: یہ کشورلندن کے حسین ہیں۔ میں نے پوچھا: آیا ان کے پہلو میں دل بھی ہے؟ ساقی نے بتایا کہ ہے تو مگر گوشت کا نہیں لوہے کا ہے، جو اثر پذیری سے بالکل عاری ہے۔ میں نے کہا: میں تو انصاف کی طلب میں یہاں آیا ہوں۔ ساقی نے یہ سُن کر جواب دیا، کہاں کا درد، کہاں کا انصاف۔ یہاں سے بھاگ جا۔ پتھر سے سر پھوڑنے کا کیا نتیجہ!

ضروری تصریحات:

یہ قطعہ غالباً ۱۸۲۸ء یا ۱۸۲۹ء کا ہے۔ جب میرزا کلکتہ میں تھے اور ان کی پنشن کا مقدمہ توقع کے خلاف خاصا بگڑ گیا تھا۔ ضروری ہے کہ بتایا جائے، غالب کب اور کیوں کلکتہ گئے تھے؟ راستے میں کہاں کہاں قیام فرمایا؟ کلکتہ میں انھوں نے اپنے مقاصد کے لیے کیا کیا کوششیں کیں؟ انصاف کی امید کس کس بنا پر مضمحل ہوئی اور میرزا کی کوششوں کا انجام کس قدر حسرتناک ٹھہرا؟ اس کے بغیر کیوں کر ممکن ہے کہ قطعے کا حقیقی مطلب ذہن نشین ہو سکے؟

علمِ کاویاں کی جگہ صلیب:

یہ امر محتاجِ اعادہ نہیں کہ انگریزوں کے متعلق جو تاثرات میرزا کے دل میں اس وقت پیدا ہوئے، وہ انگریزی حکومت کی اس وقت تک کی روش اور طرزِ عمل کا طبعی نتیجہ تھے اور یہ تاثرات آخری دور تک میرزا کے حزین و دردمند قلب سے وابستہ رہے چناں چہ ایک قصیدے میں، جو شاید ۱۸۶۰ء کے بعد لکھا گیا، کس درد سے کہتے ہیں:

دل ز معنی لبالب است و لے
خامہ اندر بناں نمی خواہم

نتواں کرد با فلک پرخاش
خردِ خردہ داں نمی خواہم

جا بر احباب تنگ نتواں کرد
خویش را در جہاں نمی خواہم

خو بہ بیداد کردہ ام غالبؔ
عہدِ نوشیرواں نمی خواہم

با صلیبم فتاد کار بدہر!!
علَمِ کاویاں نمی خواہم

میرزا کو احساس تھا کہ نوشیروانی عہد نوروز اور کاویانی علَم کا دور گزر چکا جو روایات ان کے فکر و نظر کی تربیت میں پسِ منظر کا کام دیتی رہی تھیں، وہ بے معنی ہو گئیں اور معاملہ اس قوم سے آپڑا جس کا مذہبی نشان صلیب تھا۔ وہ قوم تہذیب و ثقافت کے ان تمام سامانوں سے بے خبر ہی نہیں، بے پروا بھی تھی، جنھیں میرزا اور ان کے ہم وطن گراں مایہ سمجھتے رہے تھے اور انھی کو فخر و عزت کا معیار مانے بیٹھے تھے، جب میرزا نے یہ مصرعہ کہا ہوگا:

با صلیبم فتاد کار بدہر!

تو کون کہہ سکتا ہے کہ ان کے ختہ و خونچکاں قلب کی حالت کیا ہوئی ہوگی؟

دوسری مثال:

اسی طرح قطعہ نمبر ۲۳ کو لیجیے۔ اس کا تعلق بھی میرزا کے ذاتی معاملے ہی سے ہے اور یہ اس وقت کہا گیا، جب کاغذات لندن بھیجے جا رہے تھے فرماتے ہیں:

بصدر می رود ایں باز پرس بسم اللہ
ہمیں مرادِ من است و جزایں مرادم نیست

تو کردی و تو کنی کارم، اعتقاد این است
بکار سازیِ بختِ خود اعتمادم نیست

رسیدمے و بہ پائے تو سودمے سرِ عجز
بضاعتِ سفرو دستگاہِ زادم نیست

مفید مطلب من ہر کتابتے کہ بود
تو جمع کن کہ بسازاں میانہ یادم نیست

بذوقِ قربِ زمانِ مراد بیتابم!
وگرنہ شورشِ تعجیل در نہادم نیست

بہ نیم روز بہ لندن رساندے زورق!!
ولے چہ چارہ کہ فرماں برآب و بادم نیست

بہ التفاتِ تو صد گونہ اعتمادم ہست!
ولے شتاب کہ برعمر اعتمادم نیست

یعنی میرا معاملہ حکومت صدر کے پاس جا رہا ہے۔ یہی میری مراد تھی۔ اس کے سوا کوئی مراد نہیں۔ میرا عقیدہ یہی ہے کہ صرف آپ نے میرا کام کیا۔ آیندہ بھی آپ ہی کریں گے، خود اپنے نصیبے کی کارسازی پر مجھے قطعاً بھروسا نہیں۔ میں چاہتا تھا کہ دہلی سے کلکتہ پہنچوں اور آپ کے پاؤں پر عاجزی سے سر رکھوں مگر کیا کروں، سفر کا سامان اور توشے کے انتظام کی مجھ میں استطاعت نہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ مثلیں دیکھیں، جو جو تحریرات میرے مقدموں کے لیے مفید ہوں، انھیں فراہم کر لیں۔ ان میں سے اکثر مجھے یاد بھی نہیں رہیں۔ مراد پوری ہونے کا زمانہ قریب آ گیا ہے، اس لیے دل بے تاب ہے، ورنہ میں فطرتاً عجلت پسند نہیں۔ کیا کروں ہوا اور پانی میرے اختیار میں نہیں، ورنہ دوپہر میں وہ جہاز لندن پہنچا دیتا، جس میں میرے کاغذات جا رہے ہیں۔ آپ کی توجہ فرمائی اور مہربانی پر تو بھروسے کے سیکڑوں وجوہ موجود ہیں لیکن جلدی کیجیے کیوں کہ مجھے اپنی زندگی پر بھروسا نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ قطعہ خاص تفصیل وتشریح کا محتاج ہے۔

مشترک اشعار:

قصائد کا ذکر میں یہاں نہیں کروں گا کیوں کہ ان میں سے بڑی تعداد غالبؔ کے احوال کا ایک جامع مرقع ہے۔ ایسے اشعار خاصے ہیں، جن کے ہم معنی یا جن سے ملتے جلتے اشعار اُردو میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً:

اندراں روز کہ پرسش رود از ہرچہ گذشت
کاش با ما سخن از حسرتِ ما نیز کنند
آتا ہے داغ حسرتِ دل کا شمار یاد

مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

نیز:

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
رمز بشناس کہ ہر نکتہ ادائے دارد
محرم آن است کہ رہ جز بہ اشارت نہ رود
چاک مت کر جیب بے ایامِ گل
کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے
از نغمۂ مطرب نتواں لختِ دل افشاند
اے نالہ پریشاں رو و ہنجار میاموز
فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابندِ نے نہیں ہے
گریہ کرد از فریب و زارم کشت!!
نگہ از تیغ آبدار تر است!!
کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے
ہر رشحہ بہ اندازۂ ہر حوصلہ ریزند
میخانۂ توفیق خم و جام نہ دارد
توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم

لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل
تاچند باغبانی صحرا کرے کوئی
رنگہا چوں شد فراہم مصرف دِیگر نہ داشت
خلد را نقش و نگار طاقِ نسیاں کردہ ایم
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

ایک ضروری نکتہ:

آخر میں اتنا اور عرض کر دوں کہ میرزا غالبؔ کی صد سالہ برسی منانے کے سلسلے میں ہم جو کچھ بھی کریں گے، وہ محض اُردو اور فارسی کے ایک بڑے شاعر کی یاد نہ ہوگی بل کہ اس محسنِ اعظم کی یاد ہوگی، جس نے اُردو شعر و ادب کو وسیع ممکنات ارتقاء کی راہ پر لگایا۔ اُردو اشعار کے لیے وہ قالب مہیّا کیا، جس میں ہر قسم کے مضامین بے تکلّف آراستہ کیے جا سکتے تھے۔ غالبؔ ہی کے تیار کیے ہوئے سانچے تھے، جن میں حالیؔ، اقبالؔ اور دُوسرے شاعروں نے فکر و نظر اور تاثیر و دل آویزی کے وہ کرشمے دکھائے کہ ان کی نظیریں دوسری زبانوں میں مشکل سے ملیں گی۔ غالبؔ ہی ہے جس نے نثر نگاری کا حد درجہ بدیع اسلوب پیدا کیا اور اس میں جزئیات نگاری کے حیرت انگیز کمالات دکھائے۔ اس عظیم القدر محسن کی یاد تازہ رکھنے کے لیے ہم جو کچھ بھی کر سکیں گے، وہ ہماری احسان شناسی کا ایک مظاہرہ ہوگا۔

(ماہ نو۔ کراچی فروری ۱۹۶۶ء)

اِشاریۂ غالبؔ

جس طرح آم کے محض نام لے دینے سے اس کے بہترین انواع واقسام کی سرورافزالذت اور لطیف ومتوازن شیرینی وخوشبو کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا، اسی طرح سیّد معین الرحمٰن صاحب کی پیش نظر کتاب ''اشاریۂ غالب'' کا محض نام دیکھ یا سن لینے سے اس کی گوناگوں معنوی خوبیوں کا تصور دماغ میں جمالینا میرے نزدیک ممکن نہیں۔ نظیری کیا خوب کہہ گیا ہے:

سحر چشم بت بکاراست و دعائے برہمن
گبر ہر تارے کہ بندد بر میاں زنار ہست

خود میرزا غالبؔ بھی ایک قصیدے میں اربابِ فن کے تفاوت درجات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

نے ہر ترانہ سنج نکیسا[1] نوا بود!
نے ہر سخن سرائے بہ سحباں[2] برابر ست
نے ہر کہ گنج یافت ز پرویز گوے برد
نے ہر کہ باغ ساخت بہ رضواں برابرست
گیرم کہ ہر گیاہ برد از ابر و باد فیض
خرزہرہ[3] کے بہ سنبل وریحاں برابرست

---

[1] ساسانی بادشاہ خسرو پرویز کا مشہور مطرب۔

[2] ایک عرب جو فصاحت و بلاغت میں مشہور مانا گیا۔

[3] یعنی کنیز جو سنبل وریحان کے مقابلے میں بے حقیقت ہے۔

کتاب کی دل آویزی:

مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ جب تک سید معین الرحمٰن کی مرتب فرمائی ہوئی یہ کتاب میرے مطالعے میں نہیں آئی تھی اس کے باب میں میرا تصور یہی تھا کہ میرزا غالب کی تصانیف یا ان کے اور میرزا کے متعلق لکھی ہوئی کتابوں کے اسماء کا یہ ویسا ہی مرقع ہوگی جیسی ''اشاریوں'' کے نام سے عموماً دیکھی گئیں۔ اغلب ہے اس نوع کی دوسری کتابوں سے بہ اعتبارِ فراہمی معلومات نسبتاً بہتر ہو لیکن جب اس کے مختلف حصوں کا مطالعہ کیا تو پتا چلا کہ یہ عام کتب اشاریہ سے مختلف نوع کی ایک کتاب ہے جس کا کوئی نمونہ قبل ازیں کم از کم میری نظر سے نہیں گزرا۔ بلاشبہ اس کا اصل موضوع میرزا کی تصانیف کے متعلق تمام ضروری معلومات یک جا کر دینے کے سوا کچھ نہیں لیکن اس کے لیے اسلوب ایسا اختیار کیا گیا ہے۔ جس سے محض معلومات ہی حاصل نہیں ہوتیں بل کہ اس کے مطالعے میں خاص جاذبیت پیدا ہوگئی ہے۔ حقائق ایسے انداز میں ترتیب دیے گئے ہیں کہ انھیں پڑھنا بار نہیں خوش گوار فرحت افزا معلوم ہوتا ہے۔ صفحوں کے صفحے دیکھتے جایئے کہیں طبیعت پر رکاوٹ یا آزردگی کا اثر نمایاں نہیں ہوتا۔ دل چاہتا ہے کہ انسان پڑھتا جائے، پڑھتا جائے۔

اعتراف عجز:

میری گزارش کا مطلب یہ نہیں کہ ضروری معلومات کے بیان کو خواہ مخواہ پھیلایا گیا ہے حاشا وکلا ہر ضروری معاملے کی توضیح کے لیے کم سے کم الفاظ استعمال کیے گئے ہیں تاہم ایجاز کے اہتمام نے نہ کسی متعلقہ پہلو کی وضاحت میں تشنگی کی گنجایش چھوڑی ہے اور نہ توضیح کے سلسلے میں یہ احساس ہو سکتا ہے کہ الفاظ کا اقتصاد پوری طرح ملحوظ نہ رکھا گیا۔ ہر حقیقت ٹھیک اسی انداز میں سامنے لائی گئی ہے۔ جو اس کے لیے بہ ہمہ وجوہ مناسب تھا۔ تولہ یا ماشہ تو رہا ایک طرف، رتی کی بھی کمی بیشی کا احساس نہ ہوگا اور لُطفِ تحریر کا کیف یکساں ہے یعنی جو کچھ بتانا ضروری تھا۔ نہ اس میں افراط ہے، نہ تفریط، عدل وتوسّط کا ایک بدیع معیار از اول تا آخر یکساں قائم رکھا گیا ہے۔

میں نے حقیقتِ حال کے بیان میں سعی بلیغ کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا لیکن یہ احساس برابر قائم ہے کہ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، شاید موزوں الفاظ میسّر نہ آسکنے کے باعث اس کا حق ادا نہیں کرسکا۔ بعض اوقات واضح اور روشن حقائق کی تفہیم میں بھی انسان کو دقتیں پیش آجاتی ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کتاب ملاحظہ

فرمائیں گے تو یہ الفاظ آپ کو میرے مافی الضمیر تک پہنچانے میں مشعل راہ کا کام ضرور دے سکیں گے۔

معلومات کی فراہمی اور پیش کش:

بلاشبہ ''اشاریۂ غالب'' کا اصل مقصودِ ترتیب یہی ہے کہ میرزا کے فکر ونظر کی ندرت کاریوں نے الفاظ وعبارت کا لباس پہن کر جن تصانیف کی شکل اختیار کی، وہ چھپ کر منظر عام پر آئی ہوں یا نہ آئی ہوں ان کی پوری سرگزشت از ابتدا تا انتہا سامنے آجائے۔ ظاہر ہے کہ اس موضوع میں کوئی خاص جاذبیت وکشش پیدا کردینے کی گنجایش نہ تھی لیکن فاضل مولف نے ترتیب کا انداز ایسا اختیار کیا کہ کتاب ملاحظہ کرنے والے کو کسی بھی مرحلے پر موضوع کی خشکی اور بے کیفی کا احساس نہ ہونے پائے۔ یہ کام کم از کم اتنا مشکل ضرور تھا جتنا خشک وبے آب سرزمینوں کو سبزہ نوگل کے خیابانوں میں تبدیل کردینا مشکل ہوتا ہے لیکن مولف نے اس دشوار مہم میں بفضل اللہ غیر معمولی کام یابی حاصل کی۔ ٹھوس معلومات کا ذخیرہ بھی وہ منظر عام پر لائے تو ایسی شکل میں لائے کہ ذوق وشوق اس کی طرف رغبت وتنافس میں معاون ہو، مزاحم نہ ہو۔ ترتیبات ونگارشات میں ایسی فضا پیدا کردینا مطالب ذہن نشین کرنے کے لیے بہ طور خاص سازگار سمجھا جاتا ہے اور ایسی کتابوں سے استفادے کا دائرہ قدرتی طور پر بہت وسعت اختیار کرلیتا ہے۔

کتاب کی ضرورت واہمیت:

سیّد معین الرحمٰن مقدّمے میں جس کا عنوان انھوں نے ''عرضِ مرتب'' رکھا ہے، ایک مقام پر فرماتے ہیں:

> ''پہچان، پرکھ، شناخت، تفہیم اور تحسین تو بعد کی بات ہے اور ہر ایک کے بس کی بات ہے بھی نہیں ان سو برسوں میں ان کے (میرزا کے) سرمایۂ علمی کا احصا اور احاطہ بھی بتمامہ ممکن نہیں ہو پایا۔ کوئی مستقل اور مفصل کتاب یا کوئی مبسوط مطالعہ ایسا نہیں جو زمانی وتاریخی ترتیب سے سلسلہ وار غالب کی جملہ تصانیفِ نظم ونثر اور اُن کی متفرق نگارشات (فارسی اور اُردو) کے جائزے پر محیط ہو۔ زیرِ نظر کتاب اسی خلا کے پیشِ نظر تالیف کی گئی اس ادّعا کے ساتھ پیش نہیں کی جارہی کہ یہ لازماً اس خلا کو پُر بھی کرتی ہے''۔

(اشاریۂ غالب/ص ۹)

جن اصحابِ علم ونظر پر حقیقت حال آشکارا ہے، ان میں سے غالبًا کوئی بھی مندرجہ بالا الفاظ کو حقیقت کی صحیح اور واشگاف ترجمانی تسلیم کر لینے میں تامل نہ کرے گا۔

آپ ہی کہا، آپ ہی سمجھا:

قطعاً شبہہ نہیں کہ زندگی میں میرزا غالبؔ کی اِتنی قدر و منزلت ضرور ہوئی جس سے غالبًا بہت کم شاعر حظ اندوز ہوئے ہوں لیکن میرزا کا یہ شکوہ یقیناً ہر اعتبار سے درست تھا کہ:

> ''مجھے اپنے ایمان کی قسم، میں نے اپنی نظم ونثر کی داد بہ اندازۂ بایست پائی نہیں آپ ہی کہا اور آپ ہی سمجھا''۔

یہ جو فرمایا کہ ''آپ ہی کہا اور آپ ہی سمجھا'' اس درد کی حقیقت کا اندازہ شناس ہر شخص نہیں ہو سکتا۔ میرزا کا ایک فارسی شعر بھی غالبًا اِسی احساس کا ترجمان ہے۔

از ما بہ ما پیام وہم از ما بہ ما سلام
رنجِ دلے مباد پیام و سلام ما

اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ انھیں بقدرِ خواہش یا کم از کم بہ اندازۂ ضرورت دولت نہ ملی اگرچہ وہ اپنی فطری دردمندی اور غیر معمولی ذکاوتِ حس کی بنا پر خلعت فروخت کر کے بھی خلعت لانے والے آدمیوں کو انعام دینے میں دریغ نہیں کرتے تھے، جیسا کہ خواجہ حالؔی نے لکھا ہے۔ اُنھیں یقیناً روپے کی بھی ضرورت تھی اور اس ضرورت کا اظہار گناہ نہ تھا۔ آخر عرفی، نظیری، طالب، کلیم وغیرہ سیکڑوں بل کہ ہزاروں ایرانی شاعر محض ''واہ وا'' سننے کے جنون خیز شوق میں وطن چھوڑ کر یہاں نہیں آئے تھے! اگر ان کے لیے پایہ شناسی اور قدر دانی میں وقار اعزاز کے علاوہ دولت بھی شامل تھی تو میرزا غالب کے لیے ایسی آرزو کیوں حرام قرار دے دی جائے؟ لیکن میرزا نے جو کچھ کہا، اُس کا مطلب صرف یہ تھا کہ میری شاعری جس عالی مشربی اور بلند منزلتی کی آئینہ دار ہے، اس کے شناسا بہت کم نکلے۔ میرزا نے بہادر شاہ، میرزا فخرو یا واجد علی شاہ یا افضل الدولہ والیِ حیدر آباد کے قصیدوں میں اپنے متعلق جو کچھ کہا ہے، اسے اکٹھا کر دیا جائے تو بڑے بڑے ایرانی شعرا کے فخریات بھی بے حقیقت سے رہ جائیں اور میرزا کی کوئی بھی بات حقیقت سے خالی نہ تھی۔

میرزا غالب، میرزا واجد علی شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے ایک قصیدے میں کہتے ہیں۔

سوالِ سائل اگر رہ بردبہ پردۂ گوش
قبول تانہ کنم تاب ناورم آن را!

یعنی اگر کسی سوالی کی صدائے درد میرے کان کے پردے سے ٹکرا جائے تو جب تک اُس کا سوال پورا نہ کرلوں دل چین نہیں پاتا۔

مخاطبوں کی بے حسی:

اگر مخاطب صاحبِ دل ہوتا اور اس شعر کی حقیقت پالیتا تو اس وقت تک اطمینان کا سانس نہ لے سکتا جب تک شاعر کی ایک ایک ضرورت پوری نہ کر دیتا لیکن مجھے یقین ہے کہ واجد علی شاہ نے یہ قصیدہ سنا ہی نہ ہوگا چوں کہ میرزا والیانِ لکھنؤ کے نام قصیدے عموماً مجتہد کی وساطت سے بھیجتے تھے، اس لیے مجتہد نے چند سو روپے لے کر میرزا کو بھجوا دیے ہوں گے۔ فرمائیے کیا اسے قدر دانی یا سخن فہمی قرار دیا جا سکتا ہے؟

میرزا نے فارسی کی ایک غزل میں کہا ہے۔

بینی ام از گداز دل در جگر آتشے چو سیل
غالب، اگر دم سخن رہ بہ ضمیر من بُری

یعنی اگر کوئی فرد عین شعر گوئی کے وقت میرزا کے ضمیر تک راہ پا سکے تو دیکھے گا کہ دل پگھلا جا رہا ہے اور جگر میں آگ کا سیل موجزن ہے۔ ایسی شعر گوئی کا صلہ کیا وہ ہو سکتا تھا جس کا ذکر اُوپر ہوا ہے؟ یا کیا غریب بہادر شاہ اس شعر گوئی کا صلہ دے سکتا تھا جس کے متعلق حالی نے بہ روایت غالب لکھا ہے کہ ایک روز فرمایا: میرزا تم شعر خوب پڑھتے ہو! میرزا نے ایک خط میں بڑے دُکھ سے جو یہ لکھا ہے تو سچ ہی لکھا ہے کہ:

> ''ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے ہیں۔ بہ قدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ دست گاہ کہ عالم کا میزبان بن جاؤں اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی، جس شہر میں رہوں، اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے ...... میرے اور معاملاتِ کلام و کمال سے قطع نظر کرو، وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود

دَر بہ دَر بھیک مانگے وہ میں ہوں......”

ناصر علی سرہندی کا واقعہ:

ناصر علی سرہندی کوئی بڑا شاعر نہ تھا۔ مولانا شبلی مرحوم نے “شعرالعجم” میں اسے یہاں کی فارسی شاعری کا مذاق بگاڑنے والوں میں شمار کیا ہے (جلد پنجم، ص ۲۱) وہ سرہند سے ذوالفقار خان کے پاس بیجاپور پہنچا تو سات شعر کی ایک غزل ذوالفقار خان کے دربار میں پڑھی جس کا مطلع تھا۔

اے شانِ حیدری زجبینِ تو آشکار
نام تو در نبرد کند کارِ ذوالفقار

مولانا آزاد بلگرامی فرماتے ہیں کہ ذوالفقار خان نے ایک ہاتھی اور بڑی رقم صلے میں دی (سرو آزاد، ص ۱۳۰) میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی “سفینۂ بے خبر” میں لکھتے ہیں کہ ذوالفقار خان نے صرف مطلع سُن کر ہاتھی اور تیس ہزار روپے دے دیے اور کہا کہ باقی اشعار کا صلہ دینے کی مجھ میں ہمت نہیں، اس لیے نہ سنائے جائیں”۔ یہ میرزا کی پیدائش سے صرف ایک سو سال پیش تر کا واقعہ ہے۔ میرزا کے کلیات میں ایسے بے شمار نوادر ہیں اور ناصر علی سرہندی کے پورے دیوان میں شاید ایک بھی چیز ویسی نہ نکلے۔

غالباً اِسی صورت حال کے پیشِ نظر سیّد معین الرحمٰن نے لکھا کہ پہچان، پرکھ، شناخت، تفہیم اور تحسین ہر ایک کے بس کی بات بھی نہیں اور بالکل صحیح لکھا۔

خیرہ ذوقی کا بدیہی سبب:

میرزا کے عہد کی خیرہ ذوقی کے بہت سے اسباب ہیں۔ جن کا ذکر چھیڑنے کا یہ مقام نہیں۔ ایک بڑا سبب یہ تھا کہ رسوم کے قالب تو موجود تھے مگر ان میں سے روحیں قرنوں پیش تر نکل چکی تھیں۔ شاعر محض مشاقی کی بنا پر مدح و ستایش میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے رہتے تھے۔ ممدوح بھی قصیدوں کو محض ایک رسمِ قدیم کی بجا آوری سمجھتا تھا اور اسے شعروں کی حقیقی حیثیت سے کچھ تعلق نہ تھا۔ مدّاح بھی قصیدہ گوئی کو اسی طرح اپنا وظیفہ تسلیم کرتا تھا، جس طرح دوسرے ملازمین مختلف خدمتوں کی بجا آوری کے لیے مقرر رہتے۔ کچھ تنخواہ مقرر تھی، کچھ مختلف تقریبات پر مل جاتا اور کام چلتا

رہتا۔ قیامت یہ ہوئی کہ میرزا غالب کی شاعری کو بھی اِسی رسمِ قدیم کی خانہ پری سمجھا گیا، جیسی بادشاہی اور امیریاں برائے نام تھیں ویسی ہی شاعری سمجھ لی گئی۔ انتہائی نازک احساسات والے شاعر کے لیے اس سے بڑی قیامت کیا ہو سکتی تھی لیکن میرزا نے اپنی تسلّی کے لیے کئی سہارے پیدا کر لیے۔ مثلاً:

تیزیِ فکرِ من از تُست، زگردوں چہ خطر؟
سختیِ دہر بود تیغ مرا سنگ فساں!

شاید خیرہ ذوقی کے اس یاس انگیز دور میں قُدرت کا منشا یہی تھا کہ میرزا کے لیے ہر دائرے میں زیادہ سے زیادہ ناسازگار احوال جمع کر دیے جائیں تا کہ وہ ناقدری کی ضرب کھا کر اور نوادر پیدا کرتے جائیں۔

اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد:

کارگاہِ قدرت کے معاملات بڑے عجیب ہیں۔ کہیں قدردانی اور منزلت شناسی کے ذریعے سے فکر و نظر کے دریا میں طغیانیاں لائی جاتی ہیں تا کہ تہ نشین دُرہائے شہوار، اُچھل کر سطح پر آ جائیں اور ساحل نشین اپنی جھولیاں بھر لیں۔ کہیں اس کے بالکل برعکس ناقدری اور حقیقت ناشناسی کے جھکڑوں اور آندھیوں سے طوفان اٹھائے جاتے ہیں تا کہ تہ سے اُٹھنے والی بڑی بڑی لہریں وہ سب کچھ اپنے دامنوں میں سمیٹ لائیں جو صدیوں سے قعرِ دریا میں مدفون تھا اور اسے کناروں پر ڈال دیں۔ میرزا کے لیے آخری صورت مقدّر تھی وہ وظیفۂ حیات پورا کر کے دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ اپنے تمام احساسات کو قلندرانہ انداز میں لباسِ شعر پہناتے رہے۔ پوری زندگی مصری کی مکھی بن کر گزاری، شہد کی مکھی بننا کبھی گوارا نہ کیا۔ یعنی زمانے کے خوب و زشت میں کبھی دل نہ اٹکایا۔

اُس کا جنازہ اٹھا تھا تو بہ ظاہر وہ دہلی مرحوم کی ایک بڑی شخصیت سے زیادہ نہ تھے۔ ایک سو سال کے بعد میرزا کی صد سالہ برسی منائی گئی تو اُن کی شہرت کی آوازوں سے گُنبدِ گردوں گونج رہا تھا۔ شاید ہی کوئی ملک، کوئی قوم اور کوئی خطّہ ایسا ہو جس نے میرزا کی بارگاہِ عظمت میں خراجِ تحسین پیش کرنے میں توقف کیا ہو۔

مولانا آزاد کی ایک تعریض:

شمس العلما مولانا محمد حُسین آزاد مرحوم کو تعریض سے خاص مناسبت تھی اور وہ مدّت العمر ذاتی

پسند ناپسند سے بالا ہو کر، حق و انصاف کی بات شاید ہی کہہ سکے ہوں۔ اُن کا ایک نہایت عمدہ مضمون ”شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار“ ہے۔ اس کے آخر میں ملک الشعرائی کا تاج اپنے استاد مکرم شیخ ابراہیم ذوقؔ مرحوم کے سر پر رکھ چکنے کے بعد، میرزا غالبؔ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”غالب اگرچہ سب سے پیچھے تھے پر کسی سے نیچے نہ تھے۔ بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا مگر واہ وا اور سبحان اللہ کہتے رہ گئے“۔

یہ بھی مرحوم غالبؔ پر تعریض ہی تھی۔ ۱۹۶۹ء میں میرزا کے لیے شہرتِ عام اور بقائے دوام کا جو دربار، دنیا کے ہر ملک، ہر خطے اور ہر قوم نے آراستہ کیا، اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے آزاد کی یہ تعریض بھی حرفاً حرفاً درست ثابت کر دی۔ یعنی میرزا غالبؔ کا نقارہ وفات سے ایک سو سال بعد بھی اُسی زور سے بج رہا تھا، جس زور سے آزادؔ نے ایک خیالی دربار میں سُنا تھا۔ گفتۂ غالب کو کسی نے سمجھا یا نہ سمجھا لیکن ”واہ وا“ اور ”سبحان اللہ“ کی آوازوں سے اطرافِ عالم گونج رہے ہیں۔ بقا صرف اُنھی چیزوں کے لیے ہے جو عالمِ انسانیت کے لیے نفع بخش ہوں۔ وَاَمَّا مَا ینفعُ النّاس فیمکثُ فی الارض (سورہ رعد) حقیقی شاعری مطلوب ہے اور اسی کے لیے دوام ہے۔ مَلِکُ الشعرائی کے تاجوں کو پوجتا ہے، جن کی درخشانی صرف چندروزہ ہوتی ہے!

غالبؔ، شیکسپیئر اور اقبال:

بہ ہر حال اصل مبحث یہ نہیں کہ میرزا کی قدردانی زندگی میں بقدر بایست ہوئی یا نہیں؟ شیکسپیئر کی حیثیت زندگی میں کیا تھی؟ اٹھارہ سال کی عمر میں لندن پہنچا۔ مشغولیت کا محتاج تھا۔ تھیٹر کی طرف کشش ہوئی ایکٹر بنا پھر پُرانے ڈراموں میں ردوبدل کرتا رہا۔ آخر نئے ڈرامے لکھنے شروع کیے۔ بائیس تیئس سال لندن میں گزار کر واپس وطن چلا گیا۔ زندگی کے آخری چند سال اطمینان سے گزرے۔ جس شیکسپیئر سے اب دُنیا روشناس ہے، وہ وفات سے کوئی صدی بھر بعد وجود پذیر ہوا۔ اقبالؔ نے ”اسرارِ خودی“ مرتب کی تھی تو وہ بھی اِن مراحل سے دوچار تھے جو ہر نئے داعی کو لازماً پیش آتے ہیں چناں چہ ”اسرارِ خودی“ کی تمہید میں ہمیں یہ شعر بھی ملتے ہیں۔

نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم   من نوائے شاعرِ فرداستم
عصرِ من دانندۂ اسرار نیست   یوسفِ من بہر ایں بازار نیست
نغمۂ من از جہانِ دیگر است   ایں جرس را کاروانِ دیگر است
اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد   چشمِ خود بربست و چشمِ ما کشاد
رخت باز از نیستی بیرون کشید   چون گل از خاکِ مزارِ خود دمید

اقبال نے کہا:

من نوائے شاعر فرداستم

میرزا نے بھی یہی کہا تھا:

ہوں گرمیِ نشاطِ تصوّر سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

انسانیت کے شہکار:

انسانیت کے ہر شہ کار کو اوّل یا آخر امتحان و آزمایش کے ان عافیت سوز مرحلوں میں سے گزرنا پڑتا ہے، خواہ اس کا تعلق کسی دائرے سے ہو۔ وہ یقین کی ایک خاص روح سے معمور ہوتے ہیں، جو پریشانیوں اور نامساعدتوں کی ہر اضطراب افزا تاریکی میں ان کے لیے مشعلِ راہ بنی رہتی ہے اور وہ اپنے وظیفے کی بجا آوری میں انہماکِ کامل کے ساتھ ڈوبے رہتے ہیں اور ان کے سازِ وجود سے ایسے ترانے اٹھتے ہیں:

آن راز کہ در سینہ نہان است، نہ وعظ است
بردار توان گفت و بہ منبر نتوان گفت

آخرِ کار نہ پیداست کہ در تن افسرد
کفِ خونے کہ بدان زینتِ دارے نہ دہی

اے زسازِ زنجیرم در جنوں نواگر کن
بندگر بدین ذوق است۔ پارۂ گراں ترکن

زآفرینش عالم غرض جز آدم نیست
بہ گردِ نقطۂ ما دورِ ہفت پرکارست

حصولِ معلومات کی مشکلات:

بہ ہر حال سیّد معین الرحمٰن صاحب نے صد سالہ برسی کی تقریب میں ایک جامع اشاریہ تیار کرنے کا بیڑا اٹھایا اور یہ اہم کام ہرگز سہل نہ تھا کیوں کہ پاکستان و ہند کے تعلقات کی اضطراب افزا پیچیدگیوں نے ہمسایے ملک سے تمام ضروری معلومات فراہم کرنا خاصا مشکل بنا دیا تھا۔ میرزا غالبؔ کا ایک شعر ہے:

چنیں کہ نخل بلند است و سنگ ناپیدا
زمیوہ، تانفتد خود ز شاخسار چہ حظ

مانا کہ درخت پھل سے لدا پڑا ہے لیکن اتنا بلند ہے کہ ہاتھ اس تک پہنچ نہیں سکتا۔ آس پاس کوئی پتھر بھی نظر نہیں آتا جس سے کام لے کر کچھ پھل گرا لیے جائیں۔ آخر اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ شاخ سے پھل خود بہ خود گرنے کا انتظام کیا جائے؟

بالکل یہی کیفیت پاکستان کے تعلق میں ہندوستان کی ہے۔ یعنی اپنے آپ کوئی چیز آ جائے تو آ جائے، تاہم یہ ممکن نہیں کہ سعی و کوشش کے عام وسیلوں سے کام لے کر کوئی مطلوب شے مہیّا کر لی جائے۔ گویا نظیریؔ کے قول کے مطابق ''فقر و توکل'' پر انحصار کے سوا چارہ نہیں اور:

رسوم فقر و توکل دراز دستی نیست
نشستہ ایم کہ خرما در اوفتد نخیل

عالی ہمتی اور انکسار:

بہ ہر نوع اہلِ عزم و ہمت مشکلاتِ گرد و پیش سے کبھی نہیں گھبراتے۔ جب وہ کسی کام کے سرانجام کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو اسے شروع کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے سامانِ تکمیل بہم پہنچا دیتا ہے۔

کوئی عمارت محض خیالی نقشہ آرائیوں سے کبھی پوری نہیں ہوئی۔ تعمیر کا کام شروع کر دیا جاتا ہے تو رفتہ رفتہ تکمیل کی منزل بھی آ جاتی ہے۔ سید معین الرحمٰن نے کام شروع کر دیا کیوں کہ ان کا احساس یہ تھا کہ کوئی ایسا مبسوط مطالعہ موجود نہیں جو زمانی و تاریخی ترتیب کے ساتھ میرزا کی تمام تصانیف نظم و نثر

کے جائزے پر محیط ہو۔ انھوں نے کتاب اسی عزم کے ساتھ مرتب کی کہ یہ خلا جس حد تک امکان میں ہو پُر ہو جائے تاہم ازرہ انکسار فرماتے ہیں کہ یہ:

"اس ادعا سے پیش نہیں کی جارہی کہ خلا کو لازماً پُر کرتی ہے"۔

(اشاریۂ غالب ص ۹)

پھر اپنی تائید میں سینٹس بری کا مُحکم قول پیش کر دیا کہ لاف زن کے سوا کوئی ایسی کتاب کا دعویٰ نہ کرے گا اور نامعقول کے سوا کوئی کسی سے ایسی کتاب کی توقع نہ رکھے گا جو فروگزاشتوں سے بالکل پاک ہو۔

ازسرِنو توجہ کی ابتدا:

خواجہ حالیؔ مرحوم کی "یادگارِ غالب" (۱۸۹۷ء) کی اشاعت کے ساتھ میرزا پر ازسرِ نو توجہ کی ابتدا ہوئی۔ پھر اقبال، حسرت موہانی، شبلی، محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد اور سیکڑوں اکابر علم و فضل نے میرزا کی حقیقی عظمت کے مختلف پہلو واضح کیے۔ اس اثنا میں ہمارے علومِ طبعی رفتار ترقی سے اس منزل پر پہنچ چکے تھے جہاں میرزا کی عظمت کا صحیح اندازہ کر لینا چالیس پچاس برس پیش تر کے مقابلے میں نسبتاً آسان تھا۔ اِس لیے میرزا ادب و شعر کی فضا پر اس انداز میں چھا گئے کہ انھیں اپنی زندگی میں شاید ایسا موقع مل ہی نہیں سکتا تھا، یا کسی دوسری شخصیتِ شعر و ادب کو شاید ہی ایسا مقام نصیب ہوا ہو۔ صد سالہ برسی کی صورت میں جو کچھ ہوا، وہ خدا ساز بات ہے اور قدرت کی طرف سے تلافی مافات کے طریقے بھی عجیب ہیں جن کا ظہور میرزا غالبؔ کے سلسلے میں ہُوا۔

عرفیؔ نے ایک قصیدے میں کہا تھا:

چہ دل کشاید از نیم کہ بعد من گویند
کہ بودہ است فلان دام اسمہٗ اُستاد
ازینکہ بعدِ بُریدن تمام شانہ شود
گرہ کشادہ نہ گردد کہ طرّۂ شمشاد

یعنی میرے دل کی کلی اس طرح کیا کھلے گی کہ میرے بعد لوگ کہیں گے کہ بھئی فلاں کا نام ہمیشہ قائم رہے، بڑا اُستاد تھا۔ شمشاد جب کٹ جاتا ہے تو اُس سے کنگھیاں بنائی جاتی ہیں۔ جن سے

زُلفوں کی گرہیں کھولی جاتی ہیں لیکن اس طرح شمشاد کے طرّے کی گرہ کشائی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ وہ جیسا تھا ویسا ہی رہتا ہے۔

شاعر کے دو وجود:

یہ دُرست سہی لیکن شاعر کا ایک وجود وہ ہے جو اس کے جسم و جان پر مشتمل ہے۔ ایک وجود وہ ہے جو اُس کی شاعری سے متشکل ہوتا ہے۔ اس کے پہلے وجود کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے یا نہیں پہنچتا اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا، تاہم دوسرے وجود کی بہ دولت تو اس کا نام اقصائے عالم میں پھیلتا ہے۔ بلاشبہہ سید محمد جمال الدین عرفی شیرازی جو خاص قد و جسامت اور خاص وضع و ہیئت کا انسان تھا، دُنیا سے چھتیس سال کی عمر میں رُخصت ہو گیا لیکن اُس کی شاعری تو ۹۹۹ھ/۱۵۹۱ء میں اس کے ساتھ دفن نہیں ہوئی تھی۔ وہ اب تک زندہ ہے اور اُس وقت تک زندہ رہے گی۔ جب تک ذوقِ صحیح دُنیا میں زندہ رہے گا۔

اِسی طرح میرزا غالب ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ/۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو سُپردِ خاک ہو گئے لیکن ان کی شاعری محفوظ رہی۔ اقبال کی تعبیر کے مطابق، اس نے شاعر کی وفات کے بعد نیا جنم لیا۔ پھول کی طرح میرزا کے خاکِ مزار سے اُگی اور آج دنیا بھر کی انجمن ہائے شعر و ادب اس پھول کی خوش بُو سے عنبر و عطر انگیز ہیں سچ ہے۔

وَاَمّا مَا یَنْفَعُ النّاس فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ

اَصل منصوبۂ مؤلف:

فاضل مؤلف فرماتے ہیں کہ یہ کتاب جو تصانیفِ غالب کی اوّلین اشاعتوں مطبوعات و مرتّباتِ مابعد، غالب کی معدوم تصنیفات، اُن کی متفرق و منتشر نگارشات اور تراجم غالب کے اشارات پر مبنی ہے، ایک بڑے منصوبے کا محض ہراول دستہ ہے اور اسے ''مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں سمجھنا چاہیے''۔

(اشاریۂ غالب، عرضِ مرتّب، ص ۱۷)

یعنی یہ کتاب جو مختلف اشاریوں وغیرہ کے ساتھ کم و بیش پانچ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، ایک وسیع منصوبے کی محض پہلی جلد ہے:

> ''اس منصوبے کی بقیہ دو جلدیں ان تصانیف و نگارشات کا تعارف کرائیں گی جو غالب پر لکھی گئی ہیں۔ یہ اجزا بھی ان شاء اللہ بہت جلد آگے پیچھے غالب دوستوں کی نذر ہوں گے''۔

(اشاریۂ غالب عرض مرتب، ص ۱۸)

باقی دو جلدوں کے مطالب کی وسعت کا اندازہ مندرجہ ذیل الفاظ سے ہو سکے گا؟

> ”پچھلے سو، سَوا سو برس میں غالب پر جو کچھ لکھا گیا ہے، یہ کتابیں ایک جامع اِشاریے کی شکل میں اس کا تعارف پیش کریں گی۔ اس اشاریے میں غالبؔ کی لکھی ہوئی جُزوی وکُلّی تصانیف اور اخبارات و رسائل میں غالب کی سیرت و شخصیت، اُن کے فکر و فن، عہد، احباب اور تلامذہ سے مُتعلق مضامین نظم و نثر کے حوالے ابجدی ترتیب سے بہ اعتبارِ مُصنّف اور بہ اعتبارِ موضوع ضروری صراحتوں کے ساتھ درج ہوں گے“۔
>
> (اشاریۂ غالب، عرضِ مرتب، ص ۱۸)

گویا پیشِ نظر جلد کی حیثیت محض بُنیاد و اساس کی ہے۔ پوری عمارت بقیہ دو جلدوں کی اشاعت کے بعد مکمل ہوگی۔ بنیاد و اساس میں جو انداز و اسلوب اختیار کیا گیا ہے، اُس سے بقیہ جلدوں کی جامعیت کا اندازہ کر لینا مشکل نہیں۔

مشکلاتِ کار:

حقیقتاً ایسے کام افراد نہیں جماعتیں پورا کر سکتی ہیں جو متعدد افراد پر مشتمل ہوں اور ہر شعبہ ایک ایک دو دو آدمی سنبھال لیں لیکن ہمارے ہاں اب تک نہ ایسی جماعتیں وجود پذیر ہوئیں، جنھیں اس قسم کے بنیادی علمی کاموں کی اہمیت کا احساس ہو اور نہ وہ اسباب مہیّا ہو سکے ہیں جن کی بنا پر موزوں جماعتیں بن جائیں اور کام شروع ہو جائے۔ لہٰذا ایک ایک فرد کو اپنے ذوق و شوق، احساسِ ضرورت اور ہمت، سعی و جہد کے مطابق کام سنبھال لینا پڑا۔ میرزا یا کسی دوسرے عظیم القدر شاعر و ادیب کے متعلق ہر کام کا سرانجام زیادہ سے زیادہ مشقت طلب ہونے کے باعث نسبتاً سہل تھا لیکن اِشاریے کا کام بے حد دشوار بلکہ بہ ظاہر غیر ممکن تھا کیوں کہ اس کے لیے گزشتہ سَوا سو برس کی تمام مطبوعات کا کھنگالنا ناگزیر تھا اور ایسی کتابوں کا پتا لگا لینا ہی ایک فرد کی دسترس سے باہر ہے جن میں میرزا کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھا گیا، اُن کا فراہم کر لینا تو یکسر محال ہے، پھر رسائل و اخبارات کا معاملہ ہے جو گذشتہ سَوا سو برسوں میں پاک و ہند کے مختلف شہروں سے جاری ہوئے اور اب ان سب کے ناموں سے بھی بہت کم لوگ واقف ہیں۔

ایک بہترین کام:

میرے نزدیک سید مُعین الرحمٰن بہت ہی غیر معمولی عزم و ہمت کے نوجوان ہیں جنھوں نے اس ہفت خوان کو بہ طریقِ احسن طے کر لینے کا بیڑا اُٹھایا اور پہلی جلد کا جو نمونہ ہمارے سامنے آیا، وہ ہر اعتبار سے قابلِ قدر ہے۔ اس لیے کہ معلومات کی جامعیت میں بھی کلام کی گنجایش نہیں اور ایسے خشک مضمون کو زیادہ سے زیادہ دل چسپ انداز میں پیش کرنا بھی حقیقت ہے۔ اُمید ہے کہ باقی دو جلدیں بھی جن کی ترتیب پہلی جلد سے بہ درجہا زیادہ دُشوار اور محنت طلب ہے، جلد سے جلد مرتب ہو کر منظرِ عام پر آجائیں گی۔ اِس طرح یہ سلسلہ اُردو ادب میں فاضل مولّف کے ذوقِ جستجو، ہمت، سعی و تلاش اور اہتمامِ حسن ترتیب کی ایک مستقل و محکم یادگار کے طور پر رہ جائے گا اور یہ مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہوگا مثلاً:

۱۔ اُردو ادب کا دامن آج تک ایسی کتاب سے بالکل خالی تھا۔ اب بہ فضل اللہ اس موضوع پر ایک جامع کتاب پیش کی جاسکے گی جیسی کتابیں دوسری زبانوں میں کم ملیں گی۔

۲۔ میرزا کی بارگاہِ عظمت میں بے شمار نذرانے پیش ہوئے جن میں بعض بڑے ہی بیش بہا تھے لیکن مکمل اشاریے کے نذرانے سے زیادہ قیمتی نذرانہ غالباً کوئی نہ ہوگا۔

۳۔ صد سالہ برسی کی بہ دولت ایسی بہت سی کتابیں بروے کار آئیں جن سے میرزا کی شخصیت اور فکر و فن کے مختلف پہلوؤں پر نئی روشنی پڑی لیکن جامع اِشاریہ ایک طرف آشکار کرے گا کہ میرزا کے ساتھ اہلِ وطن کی محبت و عقیدت کا درجہ کتنا بلند ہے، دوسری طرف یہ اشاریہ دنیا بھر کے لیے موقع بہم پہنچا دے گا کہ میرزا کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کی جامعیت و وسعت کا صحیح اندازہ فرمائیں۔

گویا سیّد مُعین الرحمٰن صاحب کی یہ کتاب ”اشاریۂ غالب“ بہ حیثیت نذرِ عقیدت بھی بے مثال ہوگی بہ اعتبارِ استفادہ بھی دوسری کوئی کتاب اس کا مقابلہ نہیں کرسکے گی اور یہ بجائے خود بھی میرزا کی عظمت و جلالت کی ایک روشن دستاویز ہوگی۔

ہر فرد کی دلی آرزو اور دعا ہونی چاہیے کہ سیّد معین الرحمٰن جلد اس سلسلے کو پایۂ اتمام پر پہنچا دیں۔

ایں دُعا از من و از جُملہ جہاں آمیں باد

پیشِ نظر مجلّد:

اب اختصار کے ساتھ پیش نظر مجلّد کا خاکہ پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے یہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلا باب:۔ میرزا کی وہ تصانیف جو اُن کی زندگی میں شائع ہوئیں۔

دوسرا باب:۔ میرزا کی وہ تصانیف جو اُن کے بعد مُرتب ہوئیں۔ ان میں سے کچھ چھپ گئیں۔ کچھ ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ بعض معدوم ہوگئیں۔

تیسرا باب:۔ مُتفرقاتِ غالب، یعنی میرزا کا جو کلام یا مکاتیب یا دوسری تحریریں اُن کی وفات کے بعد جہاں تہاں مرتب ہو کر چھپیں یا معاصر خطّی نسخے اور اہم ایڈیشن۔

چوتھا باب:۔ تراجمِ غالب مثلاً فارسی نگارشات اُردو میں، مختلف نگارشات قومی اور علاقائی زبانوں میں۔ انگریزی میں تراجم، پاک و ہند سے باہر غالب کا مطالعہ۔

ضمیمہ:۔ اس میں تصانیف غالب کے متعلق وہ معلومات درج ہیں جو اصل کتاب کی ترتیب کے بعد منظرِ عام پر آئیں۔ اس سلسلے میں یہ امر بہ طور خاص توجہ طلب ہے کہ ''اشاریۂ غالب'' میں اُس نسخہ ''گلِ رعنا'' کے چار صفحوں کا عکس چھاپا گیا ہے جو خود میرزا غالب کے قلم کا لکھا ہوا ہے اور اس سے پہلی مرتبہ ''گلِ رعنا'' کی ترتیب کی قطعی اور مستند تاریخ منظرِ عام پر آئی یعنی غرہ ربیع الاوّل ۱۲۴۴ھ (مطابق) ۱۱ستمبر ۱۸۲۸ء۔ (دیکھیے ضمیمہ اشاریۂ غالب، ص ۳۹۹ تا ۴۰۸)۔

''عرضِ مُرتب'' کے بعد اصل اشاریہ صفحہ ۲۴ سے شروع ہو کر صفحہ ۴۲۴ پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں محولہ بالا چاروں باب اور ضمیمے مکمل ہوگئے ہیں، پھر کم و بیش ساٹھ صفحات پر اصل کتاب کا انڈیکس مشتمل ہے۔ اس میں تمام ضروری مطالب کو مختلف حصّوں میں تقسیم کر کے الگ پیش کیا گیا ہے تاکہ خوانندگانِ کتاب کو استفادے میں زیادہ سے زیادہ سہولت رہے۔ انڈیکس کے بعد دو صفحوں میں ان غلطیوں کی تصحیح کر دی گئی ہے جو دورانِ طباعت میں انتہائی اہتمام اور نگرانی کے باوجود بنائی نہ جا سکیں اور ہمارے ہاں طباعت کے انتظامات ابھی تک اس اعلیٰ پیمانے پر نہیں پہنچ سکے کہ صحتِ متن کے متعلق فارغ البالی کا وثیقہ حاصل کر لیا جائے۔

آخر میں کتاب کے متعلق مختصر الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ اسے ہمارے ہاں اپنی صنف و نوع میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

نقوش لاہور۔ غالب نمبر (۳) ۱۹۷۱ء
ماہ نامہ قومی زبان۔ کراچی۔ نومبر ۱۹۷۱ء

نقدِ غالب

عالمی شہرت یافتہ شاعر میرزا اسد اللہ خان غالبؔ کا انتقال ۱۵- فروری ۱۸۶۹ء کو ہوا۔ ۱۹۶۹ء میں ان کی رحلت کو سو سال ہوئے تو اس سال کو غالبؔ صدی کے نام سے موسوم کیا گیا اور دنیا کے مختلف ممالک میں صد سالہ برسی کی تقریبات منعقد ہوئیں۔ غالبؔ کے برصغیر پاک و ہند کی خاک سے متعلق ہونے کے سبب اس خطہ میں یہ سال غیر معمولی طور پر منایا گیا۔ سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی طرف سے مختلف تقریبات کا اہتمام کیا گیا۔ رسالوں اور اخبارات نے اس یادگار موقع پر خصوصی نمبر شائع کیے۔ غالبؔ کی بعض تصانیف کو ازسرِ نو مرتب کر کے شائع کیا گیا۔ خاص طور پر دیوانِ غالبؔ (اُردو) کی بعض نہایت بیش قیمت اور بیش قدر اشاعتیں منظرِ عام پر آئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین نے غالبیات کے خزانے اگل دیے ہیں۔ یہاں تک کہ غالبؔ کے بدستِ خود لکھے ہوئے دیوان کی طباعت تک نسخۂ لاہور نسخۂ امروہہ کے نام سے کتم عدم سے منصۂ شہود پر جلوہ فروز ہوئی۔ غالبؔ کی زندگی اور اس کے فن پر کئی کتابیں وجود پذیر ہوئیں۔ غرض اس عہد آفریں شاعر کو دنیا نے جس انداز سے خراجِ تحسین پیش کیا، یہ اُردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ یاد رہے کہ اس سلسلے میں ۱۹۶۹ء میں غالبؔ پر جو کام ہوا، اسے کافی حد تک نہایت سلیقے سے ماہ نامہ ’’کتاب‘‘ لاہور کے غالبیات نمبر برائے فروری مارچ ۱۹۷۰ء میں محفوظ کر دیا گیا۔

راقم الحروف کو غالبؔ سلسلے کی ہندوستانی مطبوعات خاص طور پر اخبارات و رسائل کے خصوصی غالبؔ نمبر جناب مالک رام صاحب (دہلی) اور جناب اکبرالدین صدیقی صاحب (حیدر آباد دکن) کی مہربانی سے موصول ہوتے رہے۔ راقم بھی جواب میں پاکستانی رسائل کے خصوصی غالبؔ نمبران صاحبان کو ارسال کرتا رہا۔ غالبؔ سلسلے کی مطبوعات مولانا غلام رسول مہرؔ راقم سے مطالعہ کے لیے منگوا لیا کرتے اور دورانِ مطالعہ کسی مضمون میں جہاں انھیں کوئی بات خلافِ واقعہ نظر آئی، اس سے صرفِ نظر نہیں کیا بل کہ فوراً گرفت کی اور وہیں حاشیہ پر اپنی رائے تحریر کر دی۔ جناب مشفق خواجہ صاحب اکتوبر ۲۰۰۱ء کے آخری ہفتہ میں لاہور تشریف لائے تو راقم کو حسب معمول شرفِ ملاقات سے

نوازا اور مہرؔ صاحب کے رسالوں اور کتابوں میں اختلافی اضافات دیکھ کر فرمایا کہ میں انھیں مضمون کی شکل میں مرتب کردوں تاکہ مہرؔ صاحب کا یہ غیر مدونہ علمی سرمایہ مرتب صورت میں قارئین ''غالب'' تک پہنچ جائے۔ میں نے موصوف کے ارشاد کی تعمیل میں مہرؔ صاحب کی تمام تصریحات ایک مضمون کی صورت میں ترتیب دے دی ہیں اور اہتمام یہ کیا گیا ہے کہ پہلے عنوان رسالہ/کتاب کے کوائف، پھر اختلافی عبارت بقید صفحہ نمبر اور زاں بعد مہرؔ صاحب کی تصریح۔

(محمد عالم مختار حق)

۱۔ ماہ نامہ ''شاعر'' بمبئی ۱۹۶۹ء (غالبؔ نمبر)

۱۔ غالبؔ کی کہانی از ڈاکٹر ظ۔ انصاری:

''قوقان بیگ کے انتقال کے بعد یہ علاقہ ان کی اولاد سے چھن گیا''۔

(ص ۲۱)

مہرؔ: یہ صحیح نہیں۔ مرزا قوقان بیگ نے نجف خاں کی وفات کے بعد جانشینوں کے جھگڑے میں شاہ دہلی کی ملازمت چھوڑ کر جے پور میں ملازمت اختیار کرلی اور اس وجہ سے وہ دہلی چھوڑ کر آگرہ میں آبسے۔ ترکِ ملازمت کے بعد علاقہ خود بہ خود چھوٹ گیا جو ماتحت سواروں کے خرچ کے لیے دیا گیا تھا۔

''چناں چہ جب بہادر شاہ کی فرمایش پر وہ شاہی خاندان کی تاریخ (مہرِ نیمروز) لکھنے بیٹھے تو ابتدا میں سارا زور اس پر صرف کردیا کہ خود بھی کسی نہ کسی طور پر اسی سلسلے سے متعلق رہیں''۔

(ص-۲۲)

مہرؔ: مہر نیمروز لکھنے سے بہت پہلے وہ اپنے خاندان کے متعلق کئی مفصل تحریریں مرتب کر چکے تھے۔ مثلاً وہی قطعہ جو آگے نقل کیا ہے اور وہ ۱۸۴۵ء کے مطبوعہ دیوان میں بہت پہلے لکھا جا چکا تھا۔ قلعہ کی ملازمت ۱۸۵۰ء میں شروع ہوئی۔

''فیضِ حق را کمینہ شاگردیم (قدرت کے فیض سے ہم کو تھوڑا بہت حصہ ملا ہے)''۔

(ص-۲۳)

مہر: مصرعہ کا مطلب یہ نہیں بل کہ یہ ہے کہ ہم فیضِ حق کے کمینہ شاگرد ہیں یعنی حقیر شاگرد ہیں اور یہ مقام کسرِ نفس کا تھا لہٰذا کمینہ کا لفظ استعمال کیا۔

''اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے رستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا۔ ورنہ مہمل بکنے لگے گا''۔

(ص-۲۴)

مہر: تعجب ہے اس رائے کے الفاظ پر کسی کی نظر نہیں جاتی۔ فرمایا: ''اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا'' آپ سوچیں کہ کونسا استاد ملا جس نے راہ پر لگایا؟ استاد نہ ملنے کے باوصف میرزا نے مہمل نہیں بکا گویا رائے کے دونوں حصے غلط اور خلافِ حقیقت ثابت ہوئے لیکن شیفتگان اسے مسلسل نقل کیے جا رہے ہیں اور اس کی پختگی پر مٹے ہوئے ہیں۔ یہ میر تقی کی بھی ہتک ہے اور میرزا غالب کی بھی۔

''غالب مذہبی معتقدات سے رفتہ رفتہ دور ہوتے جاتے تھے''۔

(ص-۲۵)

مہر: یہ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ تعجب ہے کہ غالب کے اپنے بیانات سے بھی ناواقفیت کا ثبوت ہے اور ''یادگار'' بھی غالباً نہیں پڑھی ورنہ ایسی لغوبات کیوں زبانِ قلم پر آتی؟

''کلکتہ پہنچے (۱۸۳۵ء)'' (ص-۲۵)

مہر: ۱۸۳۵ء غلط ہے۔ میرزا ۱۸۲۷ء میں کلکتہ میں تھے اور ۱۸۲۹ء میں واپس آ گئے۔۔

''میری موت ہے۔ میں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا''۔

(ص-۲۵)

مہر: عجیب نقطۂ نگاہ ہے کہ کئی مثبت تحریرات چھوڑ کر ایک فقرہ تلاش کر لیا جو پریشان کن حالات میں لکھا گیا تھا اور اس میں بھی اصل مقصود بیگم نہیں بل کہ سلسلہ تاہل ہے جس کی ذمہ داریاں ہیں جو باعثِ مصیبت ہوئیں۔ میرزا کی آزادہ روی کے لیے پیامِ مرگ تھا۔

''مفتی صدرالدین آزردہ یوں تو غالب کے بہی خواہ اور مشکل حالات میں مددگار ثابت ہوئے لیکن ان کے ذوقِ شاعری کو غالب کی شاعرانہ خودسری گوارا نہ تھی اور

نوازا اور مہر صاحب کے رسالوں اور کتابوں میں اختلافی اضافات دیکھ کر فرمایا کہ میں انھیں مضمون کی شکل میں مرتب کر دوں تا کہ مہر صاحب کا یہ غیر مدونہ علمی سرمایہ مرتب صورت میں قارئین ''غالب'' تک پہنچ جائے۔ میں نے موصوف کے ارشاد کی تعمیل میں مہر صاحب کی تمام تصریحات ایک مضمون کی صورت میں ترتیب دے دی ہیں اور اہتمام یہ کیا گیا ہے کہ پہلے عنوان رسالہ/کتاب کے کوائف، پھر اختلافی عبارت بقید صفحہ نمبر اور زاں بعد مہر صاحب کی تصریح۔

(محمد عالم مختار حق)

۱۔ ماہ نامہ ''شاعر'' بمبئی ۱۹۶۹ء (غالب نمبر)

۱۔ غالب کی کہانی از ڈاکٹر ظ۔ انصاری:

''قوقان بیگ کے انتقال کے بعد یہ علاقہ ان کی اولاد سے چھن گیا''۔

(ص ۲۱)

مہر: یہ صحیح نہیں۔ مرزا قوقان بیگ نے نجف خاں کی وفات کے بعد جانشینوں کے جھگڑے میں شاہ دہلی کی ملازمت چھوڑ کر جے پور میں ملازمت اختیار کر لی اور اس وجہ سے وہ دہلی چھوڑ کر آگرہ میں آ بسے۔ ترکِ ملازمت کے بعد علاقہ خود بہ خود چھوٹ گیا جو ماتحت سواروں کے خرچ کے لیے دیا گیا تھا۔

''چناں چہ جب بہادر شاہ کی فرمائش پر وہ شاہی خاندان کی تاریخ (مہرِ نیمروز) لکھنے بیٹھے تو ابتدا میں سارا زور اس پر صرف کر دیا کہ خود بھی کسی نہ کسی طور پر اسی سلسلے سے متعلق رہیں''۔

(ص-۲۲)

مہر: مہر نیمروز لکھنے سے بہت پہلے وہ اپنے خاندان کے متعلق کئی مفصل تحریریں مرتب کر چکے تھے۔ مثلاً وہی قطعہ جو آگے نقل کیا ہے اور وہ ۱۸۴۵ء کے مطبوعہ دیوان میں بہت پہلے لکھا جا چکا تھا۔ قلعہ کی ملازمت ۱۸۵۰ء میں شروع ہوئی۔

''فیضِ حق را کمینہ شاگردیم (قدرت کے فیض سے ہم کو تھوڑا بہت حصہ ملا ہے)''۔

(ص-۲۳)

مہرؔ: مصرعہ کا مطلب یہ نہیں بل کہ یہ ہے کہ ہم فیض حق کے کمینہ شاگرد ہیں یعنی حقیر شاگرد ہیں اور یہ مقام کسرِ نفس کا تھا لہٰذا کمینہ کا لفظ استعمال کیا۔

''اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے رستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا۔ ورنہ مہمل بکنے لگے گا''۔

(ص-۲۴)

مہرؔ: تعجب ہے اس رائے کے الفاظ پر کسی کی نظر نہیں جاتی۔ فرمایا: ''اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا'' آپ سوچیں کہ کونسا استاد ملا جس نے راہ پر لگایا؟ استاد نہ ملنے کے باوصف میرزا نے مہمل نہیں بکا گویا رائے کے دونوں حصے غلط اور خلافِ حقیقت ثابت ہوئے لیکن شیفتگان اسے مسلسل نقل کیے جا رہے ہیں اور اس کی پختگی پر مٹے ہوئے ہیں۔ یہ میر تقی کی بھی ہتک ہے اور میرزا غالب کی بھی۔

''غالبؔ مذہبی معتقدات سے رفتہ رفتہ دور ہوتے جاتے تھے''۔

(ص-۲۵)

مہرؔ: یہ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ تعجب ہے کہ غالبؔ کے اپنے بیانات سے بھی ناواقفیت کا ثبوت ہے اور ''یادگار'' بھی غالباً نہیں پڑھی ورنہ ایسی لغوبات کیوں زبانِ قلم پر آتی؟

''کلکتہ پہنچے (۱۸۳۵ء)'' (ص-۲۵)

مہرؔ: ۱۸۳۵ء غلط ہے۔ میرزا ۱۸۲۷ء میں کلکتہ میں تھے اور ۱۸۲۹ء میں واپس آ گئے۔۔

''میری موت ہے۔ میں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا''۔

(ص-۲۵)

مہرؔ: عجیب نقطۂ نگاہ ہے کہ کئی مثبت تحریرات چھوڑ کر ایک فقرہ تلاش کر لیا جو پریشان کن حالات میں لکھا گیا تھا اور اس میں بھی اصل مقصود بیگم نہیں بل کہ سلسلہ تاہل ہے جس کی ذمہ داریاں ہیں جو باعثِ مصیبت ہوئیں۔ میرزا کی آزادہ روی کے لیے پیامِ مرگ تھا۔

''مفتی صدرالدین آزردہؔ یوں تو غالبؔ کے بہی خواہ اور مشکل حالات میں مددگار ثابت ہوئے لیکن ان کے ذوقِ شاعری کو غالب کی شاعرانہ خودسری گوارا نہ تھی اور

غالب کو یہ بات زندگی بھر کھٹکتی رہی اور وہ ہر پہلو کوشش کرتے رہے کہ اپنے عہد کے اس فاضل اجل کو کسی طرح قائل کر کے چھوڑیں''۔

(ص-۳۶)

مہر: یہ حالی کے ایک بیان پر مبنی ہے جو میرے نزدیک بے سروپا ہے۔ میرزا کے خطوط میں ایسی چیزیں ملتی ہیں کہ مشاعرے میں میرزا گئے اور آزردہ کسی وجہ سے نہ آسکے۔ وہ اس درجہ پریشان ہوئے کہ اپنا کلام پڑھے بغیر واپسی پر آمادہ ہو گئے۔ نیز یہ کہ آزردہ مرحوم کے سلجھے ہوئے ذوق شعر و سخن پر ظلم ہے کہ ایسی باتیں ان سے منسوب کی جائیں۔ اس سلسلے میں صرف تین فارسی مکاتیب دیکھ لیے جائیں جو کلیات نثر کے صفحہ ۲۰۰ سے ۲۰۳ تک ہیں۔ یہ مصطفیٰ خاں شیفتہ کے نام ہیں اور غالباً ۱۸۴۳ء کے ہیں۔ ان سے پتا چل جائے گا کہ خود میرزا حضرت مفتی صاحب کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں، آیا اس روشنی میں یہ واقعہ قابلِ اعتنا سمجھا جا سکتا ہے؟

۲۔ جہانِ غالب از قاضی عبدالودود:

''مرتب نے سرورق میں سال گردآوری ۱۲۸۳ھ بتایا ہے مگر خود غالب اسے سال آغاز کہتے ہیں۔ اس مجموعہ میں ایک قطعہ ہے جس کے دو ابیات آخر یہ ہیں:

در غرۂ شعباں چو زمن بادہ گرفتند   خود ''غالبِ پژمردہ'' نشانی زسنیں بود
رَوشش بدر آر از مہ شعباں کہ درینجا   مقصودِ من از تخرجہ البتہ ہمیں بود

''غالب پژمردہ'' = ۱۲۹۱ سے بتخرجہ ۶ مادہ تاریخ نکالا ہے۔

(ص-۲۷)

مہر: گویا ۱۲۸۳ھ آغاز ترتیب کا سال اور ۱۲۸۵ھ اختتام ترتیب کا۔ یہ قطعہ وفات سے چند ماہ پیش تر کہا گیا۔ اس کے بعد غالب نے شراب نہیں پی۔ باغِ دودر۔ قطعہ نمبر ۴۰ صفحہ ۲۸۔

۳۔ غالب کی افتادِ طبع از عبدالقادر سروری:

''سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو''

(ص-۳۳)

مہرؔ: خدا کی طرف اشارہ ہے نہ کہ کسی دنیوی محبوب کی طرف۔

۴۔ غالبؔ اور حافظؔ کا ایک تقابلی مطالعہ از سعید احمد اکبر آبادی:

گر مسلمانی اینست کہ حافظؔ دارد وائے گر در پسِ امروز بود فردائے

(ص۔۳۷)

مہرؔ: حافظؔ کا شعر یوں ہے:

گر مسلمانی ازیں است کہ حافظؔ دارد آہ! گر از پس امروز بود فردائے

۵۔ غالبؔ اور فنِ شعر از مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی:

”اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے
(ذوقؔ)

میرزا (غالبؔ) یہ سن کر نہایت متعجب ہوئے اور مجھ سے بار بار پڑھواتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ میرزا نے اپنے اُردو خطوط میں اس شعر کا جا بجا ذکر کیا ہے“۔

(ص۔۴۳)

مہرؔ: صرف ایک جگہ تذکرہ ہے۔ اصل مضمون عرفیؔ کا ہے:

امیدِ عافیت از مردن است وی ترسم کہ مرگ دیگر و آسودگی دگر باشد

مگر ذوقؔ نے جس انداز میں یہ مضمون بیان کر دیا اس سے عرفیؔ کا مضمون بدرجہا بلند تر اور پر تاثیر ہو گیا ہے۔

۶۔ غالبؔ کے کلام میں تحریف و تصرف از نادم سیتا پوری:

”جنوں گرم انتظار و نالہ بیتابی کمند آیا سویدا تا بہ لب زنجیر“ سے ”دود پسند آیا

مہرؔ: ایک صاحب یہ نسخہ لیے ہوئے میرے پاس آئے۔ سوچتے سوچتے خیال ہوا کہ ”زنجیر“ سے ”نہیں

بل کہ ''زنجیری'' ہے چوں کہ کتاب میں مجہول و معروف کے درمیان اس زمانے میں چنداں امتیاز نہ تھا کاتب نے ''زنجیری'' کو زنجیرے'' لکھ دیا۔ اسے ''زنجیرے'' پڑھا گیا۔ جب مرتب نسخہ حمیدیہ سے پوچھا گیا تو جواب ملا کہ صحیح ''زنجیری'' ہے ''زنجیرے'' کاتب کی غلطی ہے۔ (دستۂ گل از مہرؔ — غیر مطبوعہ)۔

۷۔ غالبؔ اور اُردو خطوط نویسی از پنڈت گوونداس خموشؔ سرحدی:

> ''مرحوم دہلی کالج کے ماسٹر رام چندر ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اس قدیم زمانے میں اُردو کے تمول کی ترقی میں اور لوگوں کو اصلاح و ترمیم کی طرف توجہ دلانے میں نمایاں کام کیا ہے''۔

(ص-۱۵۵)

مہرؔ: یہ اصول تو میرزا غالبؔ ماسٹر رام چندر سے بھی دس گیارہ سال پیش تر ''پنج آہنگ'' کے دیباچے میں لکھ چکے تھے۔ فرماتے ہیں: ''ہنجارِ من در نگارش اینست کہ چوں کلک و ورق بہ کف گیرم مکتوب الیہ را بہ لفظے کہ فراخور حالت اوست درسر آغاز صفحہ آواز دہم و زمزمہ سنج مدعا گردم (کلیات نثر غالبؔ فارسی صفحہ ۵)۔

> ''بھئی اگر شاعری ذریعہ عزت نہیں ہے تو اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے اور اپنے آبا کے صد سالہ پیشے کو کیوں نہیں اختیار کر لیتے''۔

(ص-۱۵۶)

مہرؔ: اس شعر:

سو سال سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

کا مطلب ہی وہ نہیں جو ظاہر الفاظ سے کیفیؔ صاحب نے سمجھا۔ مطلب یہ ہے کہ میں شاعری اس لیے نہیں کر رہا کہ اس سے عزت پاؤں گا بل کہ:

شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما

۸۔ غالبؔ کے مزاج کے بنیادی عناصر از سید علی رضا حسینی:

> ”میر نے غالبؔ کی شروع عمر کا کلام سن کر بڑے پتے کی بات کہی تھی کہ اگر اس بچے کو اچھا رہنما مل گیا تو یہ استاد بن جائے گا ورنہ بگڑ جائے گا۔ غالبؔ کا یہ استاد ان کا ذوقِ سلیم تھا“۔
>
> (ص-۲۰۹)

مہرؔ: میر تقی نے کہاں کہا کہ ذوقِ سلیم میرزا کا استاد بنے گا؟ ہر شاعر ہی نہیں ہر فرد کا ایک استاد ذوقِ سلیم بھی ہوتا ہے بہ شرط یہ کہ یہ کسی کو حاصل ہو۔ میر تقی سے جو داستان منسوب ہے وہ بالکل بے بنیاد ہے اور اسے بے بنیاد مان لینا سہل ہے۔ تاویلات رکیکہ و باطلہ سے اسے بے معنی بنانا کیوں کر مناسب سمجھا جا سکتا ہے۔

”دل کی بربادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گزرا

میرؔ (ص-۲۰۹)

مہرؔ: یہ کلیم ہمدانی کا مضمون ہے:

کلیم از درد بے داد کہ نالم　　کہ بر کشتم گزار لشکر افتاد

یعنی میں کسی خاص شخص کے جور و ظلم کی شکایت کیا کروں۔ میرے کھیت پر سے تو لشکر گزر گیا اور اسے برباد کر گیا۔

۹۔ غالبؔ کا دربار اور خلعت از امتیاز علی عرشی:

”خلعت ہفت پارچہ سالش“　　”عیسوی گفتم از سر عزت“

(ص-۲۱۷)

مہرؔ: ”خلعت ہفت پارچہ“ کے اعداد ۱۷۹۶ء۔ ان میں سرِ عزت یعنی عین کے اعداد ۷۰ شامل کر لیں تو ۱۸۶۶ء بن جاتے ہیں۔

۱۰۔ اُردو شاعری کے دو رجحانات (میرؔ و غالبؔ) از بشر نواز:

’’آرزو عشق مدعا ہے عشق‘‘

(ص-۲۵۵)

مہرؔ: For love is heaven and heaven is love۔

۱۱۔ سبد چیں اور غالبؔ کے انگریز ممدوح از حامد اللہ ندوی:

’’تیسرے قصیدے میں کسی کا نام نہیں لیا ہے لیکن اس میں جو خصوصیتیں اپنے ممدوح کی بتائی ہیں وہ لارنس پر صادق آتی ہیں‘‘۔

(ص-۲۹۳)

مہرؔ: یہ کلب علی خاں والیٔ رام پور کی مدح میں ہے۔

’’قصیدہ ششم بھی اپنے ممدوح کے ذکر سے خالی ہے۔ ممکن ہے یہ بھی لارنس ہی کی شان میں ہو۔ اس میں شہنشاہ ہند و انگلینڈ کے خلعت بھیجنے کا ذکر ہے۔ لکھا ہے:

’’تا ز بخشش ہائے شاہنشاہ ہند و انگلینڈ خلعت از بہر خدیوشہ نشاں آوردہ اند

مہرؔ: یہ کلب علی خاں والی رام پور کی مدح میں ہے۔

(ص-۲۹۳)

۱۲۔ غالبؔ کی تشبیہیں اور استعارے از ڈاکٹر میمونہ دلوی:

’’دل گزرگاہ خیالِ مے و ساغر ہی سہی گر نفس جادہ سرِ منزل تقوی نہ ہوا‘‘

(ص-۳۳۳)

مہرؔ: لفظ ’’تقوی‘‘ قافیہ ہے نہ کہ ’’تقویٰ‘‘، ’’بھی‘‘ کا اور ’’راضی‘‘ کا۔

ع: ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا
ع: وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

۲۔ ماہ نامہ ''فکروفن''، دہلی۔ اپریل ۱۹۶۹ء (غالب نمبر)

۱۔ روبروبات چیت ـــــ مولانا امتیاز علی عرشی سے:

''غالب کے یہاں ندرتِ خیال اور جدّتِ ادا خود ان کے اپنے بیان کے مطابق بیدل کے ساتھ ظہوری، عرفی اور نظیری کے کلام کے مطالعہ سے پیدا ہوئی''۔

(ص۔۱۲)

مہر: یہ رائے میرے نزدیک نظرِ ثانی کی محتاج ہے۔ اس میں غالب کی فطری صلاحیتوں اور غیر معمولی کمالات کے لیے کوئی جگہ نہیں چھوڑی گئی۔ کیا ہر شخص بیدل کے ساتھ ظہوری اور نظیری کے ساتھ عرفی کے مطالعے سے وہ مقام پیدا کر سکتا ہے جو غالب کو میسر آیا؟ مطلب یہ تھا کہ نادر فطری صلاحیتوں کے ساتھ صحیح ذوقِ مطالعہ کا موقع ملا اور فطری صلاحیتیں جلا پا گئیں۔

۲۔ غالب کی عظمت ـــــ ایک سیمینار: رشید احمد صدیقی

''کیا تعجب ہے کہ آخر زمانے میں انھوں نے خود بھی یہ محسوس کر لیا ہو، جبھی تو کہتے ہیں:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

(ص۔۹۶)

مہر: یہ شعر آخری زمانے کا نہیں۔ بالکل ابتدائی زمانے کا ہے۔

۳۔ قلمی خاکہ:

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ   آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

مہر: مولانا نے مصرعہ اول میں ''یہ'' کاٹ کر ''بھی'' لکھا اور کہا ہے کہ:
یہ مقام ''بھی'' ہے کیوں کہ ناسخ کے قول کی حمایت میں کہا گیا ہے۔

۳۔ سہ ماہی ''صحیفہ''، مجلس ترقی ادب لاہور۔ جنوری۔ ۱۹۶۹ء

(غالبؔ نمبر۔ حصہ اول)

محکمہ ڈاک حکومت پاکستان نے غالبؔ کی صد سالہ برسی کے موقع پر مورخہ ۱۵ فروری ۱۹۶۹ء کو دو یادگاری ٹکٹ پندرہ اور پچاس پیسے مالیت کے جاری کیے۔ پچاس پیسے والے ٹکٹ پر غالبؔ کا یہ شعر چھپا:

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

میں نے اسی روز دونوں یادگاری ٹکٹ لاہور جی پی او سے خرید کر مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور کے سہ ماہی مجلّہ ''صحیفہ'' کے غالب نمبر (حصہ اول) برائے جنوری ۱۹۶۹ء کے سرورق پر چسپاں کر دیے اور اسی روز ان پر جی پی او سے خصوصی یادگاری مہر لگوائی۔ مورخہ ۲۸-۰۲-۱۹۶۹ء کو میں جناب مولانا غلام رسول مہرؔ صاحب کی خدمت میں مذکورہ پرچہ ساتھ لیے حاضر ہوا۔ انھوں نے ٹکٹ پر چھپا ہوا شعر دیکھا تو لاحول پڑھی اور پھر اسی وقت اس پر مندرجہ ذیل نوٹ تحریر کر دیا:

''باسمہ سبحانہ:

سب سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ ٹکٹ پر جو شعر درج ہے اس کے دوسرے مصرعہ میں ''کاش کہ'' بالکل غلط ہے۔ صحیح ''کاشکے'' ہے۔ (ک، ا، ش، ک، ی)''

۴۔ کلیاتِ غالبؔ (فارسی)

جلد دوم مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی۔ مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۷ء

''از پئے مدحِ تو چوں نقطہ گزارد بہ ورق
خامۂ من بغزالی دمِ اِحیا ماند
کہ سیہ مست مئے ناز بہ صحرا پوید
واندراں پویہ ازو نافہ بصحرا ماند

دیوانِ فارسی طبع دہلی اور کلیات طبع لکھنو میں ایک لفظ کی تبدیلی سے معنی خیز اختلاف ہو گیا ہے۔ دیوان میں ہے ''دمِ احیا ماند''۔ کلیات میں ''دمِ انشا ماند''۔ ہم نے دہلی والے نسخے کو بہتر سمجھا ہے کیوں کہ غزالی کی کتاب ''احیاء العلوم'' وجہ امتیاز ہے نہ کہ انشائے غزالی''۔

(ص-۱۴۹)

مہرؔ: انا للہ۔ یہ ''غزالی'' نہیں ''غزالے'' ہے اور اگلے شعر سے مل کر معنی پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی وہ غزال

جو سیاہ مست صحرا میں دوڑتا ہے اور ہر طرف مشک چھوڑتا جاتا ہے اگر ''غزالی'' اور ''احیا'' والی تعبیر مان لی جائے تو:

۱۔ ''خامۂ من بغزالی دمِ احیا ماند'' کے معنی یہ کرنا ہوں گے کہ میرا خامہ غزالی کی مانند ہو جائے جب وہ احیاء العلوم لکھ رہے تھے۔ یہ تعبیر کی کون سی صورت ہے۔

۲۔ اگلے شعر کا مطلب کیا ہوگا؟ کیا یہ کہ امام غزالی جب احیاء العلوم لکھ رہے تھے تو وہ پھر غزالی ہی سیہ مست مئے ناز ہو کر صحرا میں قلانچیں بھر رہے تھے اور ہر طرف مشک بکھیر رہے تھے۔

میرزا غالبؔ نے ایک قصیدے میں کہا ہے:

خامۂ من بہ غزالے دمِ انشا ماند — از پئے مدحِ تو چوں نقطہ گزارد بہ ورق
واندراں پویہ ازو، نافہ بہ صحرا ماند — کہ سیہ مست مے ناز بہ صحرا پوید

یعنی میرے قلم کی حیثیت اس غزال یعنی ہرن کی سی ہے جو مئے ناز سے سیہ مست ہو کر صحرا میں چوکڑیاں بھرتا ہے اور ہر چوکڑی بھرنے میں نافہ مشک بو کی لہریں صحرا میں چھوڑتا جاتا ہے۔ آج کل ہمارے فارسی دان ایرانیوں کی تقلید میں یاے مجہول کی جگہ بھی یاے معروف استعمال کرتے ہیں۔ اس وجہ سے ''غزالے'' ''غزالی'' بنا۔ بعض اصحاب نے قطعہ بندی کا رشتہ توڑ کر غزالی کو امام غزالی بنایا اور شعروں کا مطلب کچھ سے کچھ ہو گیا۔ (دستہ گل از مہرؔ۔ غیر مطبوعہ)

''یہ قصیدہ ان کی خدمت میں لیفٹننٹ گورنری کے زمانے میں پیش ہوا ہوگا'' میں اسے ماننے میں تردد کرتا ہوں''۔

(کلیات ص-۲۷۱)

مہرؔ: تردد ضرور کیجیے مگر اس شعر کی بھی کوئی شرح فرمایئے:

فرِ فرمانروائے غرب و شمال — گفتی آفاق را گرفت فرو

(ص-۲۷۳ کا تیسرا شعر)

''۶ مارچ ۱۸۴۹ء سہ شنبہ دہلی کی رپورٹ میں ہے ''دہلی کے جاگیرداروں کے نام جنگ پنجاب کی فتح کے متعلق سات خطوط بھیجے گئے تھے۔ جواب میں جاگیرداروں کی طرف

سے تہنیت نامے آئے۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ زیرِ نظر قصیدہ ۱۸۴۹ء کا ہے"۔

(ص-۲۷۷)

مہرؔ: ۱۸۴۹ء میں فتح پنجاب کے متعلق جو خطوط بھیجے گئے وہ دوسری جنگ کے بعد کے تھے۔ اس وقت ہارڈنگ نہیں ڈلہوزی گورنر جنرل تھا۔ ہارڈنگ جولائی ۱۸۴۴ء سے جنوری ۱۸۴۸ء تک گورنر جنرل تھا۔ دسمبر ۱۸۴۵ء میں لڑائی شروع ہوئی۔ جنوری ۱۸۴۶ء میں ختم ہو گئی۔ ۸/ مارچ ۱۸۴۶ء کو صلح نامے کی توثیق۔ یہ قصیدہ بہ ہر حال ۱۸۴۶ء کا ہے۔

کلیاتِ غالب (فارسی) جلد سوم مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی۔ مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۷ء:

آفتابِ عالمِ سرگشتگی ہائے خودیم میرسد بوے تو از ہر گل کہ می بوئیم ما
تاچہا مجموعۂ لطف بہاراں بودہ ای تابہ زانو سودہ پائے ما و می پوئیم ما

(ص-۳۶)

مہرؔ: "ان اشعار کی صحیح صورت یہ ہے:

آفتاب عالم سرگشتگی ہائے خودیم تابہ زانو سودہ پائے ما و می پوئیم ما
تاچہا مجموعہ لطف بہاراں بودہ ای میرسد بوے تو از ہر گل کہ می بوئیم ما

یہ غلطی طبع اول میں ہوئی (۱۸۶۲ء) لیکن پڑھنے والے پر مخفی نہیں رہ سکتی تھی۔"

ہم بہ عالم ز اہل عالم بر کنار افتادہ ام چوں امام سُبحہ بیرون از شمار افتادہ ام

(ص-۲۸۴)

مہرؔ: "مطلع کا پورا مصرعہ ثانی فرخ حسین فرخؔ لاہوری کا ہے جو فرخ سیر کے عہد میں تھا۔ سوائے ردیف کے۔ شعر یوں ہے:

باسروساماں چنیں بے اعتبارم کردہ اند چوں امام سُبحہ بیروں از شمارم کردہ اند

(شمع انجمن-ص ۳۷۰)"

۵۔ دیوانِ غالبؔ جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ۔ مرتبہ مفتی محمد انوار الحق مفید عام پریس آگرہ-۱۹۲۱ء

”آتشیں پا ہوں گدازِ وحشتِ زنداں نہ پوچھ
موئے آتش دیدہ ہے ہر حلقہ یاں زنجیر کا“
(ص-۱)

مہر: ”آتشیں پا اور آتش زیرِ پا کا مطلب ایک ہے۔ ”گداز وحشتِ زنداں نپوچھ“۔ ”گداز وحشت زنداں“ غیر ضروری تھا لہٰذا اصلاح فرمائی۔“

ع اسد ہے دل پہ مرے داغِ بدگمانیِ شمع
ع نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیِ شمع
(ص-۹۱)

مہر: بیان میں زور پیدا ہوگا۔ پہلے مصرع میں صرف بیان تھا۔ اب اس کی دلیل بھی شامل ہوگئی۔

”چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں“
(ص-۱۳۳)

مہر:

آیا سراغ از کہ کنم منزل شما نامت زرشک پیش کسے چوں نمے برم
(غیاثی استرآبادی)

اگر سمجھا جائے کہ میرزا نے مضمون غیاثی ہی سے لیا تو واضح رہے کہ یہ مضمون کے باندھنے کی صحیح صورت وہ نہ تھی جو غیاثی نے اختیار کی۔ صحیح اور طبعی صورت وہی تھی جو میرزا نے اختیار کی یعنی محبوب کا نام لیتے نہیں کیوں کہ رشک اظہار کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کے بعد یہ طبعی صورت نہیں معلوم ہوتی کہ کہا جائے اب محبوب کے گھر کا سراغ کیوں کر لگاؤں۔ نہایت عمدہ صورت ہے کہ ہر ایک سے پوچھ رہے ہیں میں کہاں جاؤں؟ کس طرف کا رخ کروں؟ شاید اسی طرح اتفاقیہ منزل محبوب کا سراغ مل جائے جو لوگ کسی مکان یا مقام کا نام بھول گئے ہوں وہ اسی فکر میں رہتے ہیں کہ آس پاس کے رہنے والوں کی زبان پر اتفاقیہ وہ نام آ جائے۔ ویسے بھی مختلف معروف ہستیوں کے مکانوں سے آس پاس کے مکانوں کا نشان بتایا جاتا ہے۔ میرزا کی یہی کوشش ہے کہ کسی کی زبان پر نام آ جائے تو کچھ کہے بغیر اس کی طرف چل پڑیں۔

"نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو"
(ص-۱۴۹)

مہر:

از خرابی کس نمے گردد بہ گرد خانہ ام   پاسبانے نیست مشفق تر ز ویرانی مرا

(یاد رہے کہ مولانا نے نوائے سروش شرح دیوانِ غالب کے صفحہ ۷۱۷ پر اس مضمون سے ملتا جلتا نظیری نیشاپوری کا یہ شعر بھی درج کیا ہے:

بہ عریانی ازاں شادم کہ از تشویش آزادم   گریبانے ندارم تا کسے از دست من گیرد

"پاترابِ سیل طوفان صدائے آب ہے"۔   (ص-۲۰۲)

مہر: "بہارِ عجم" میں "پاتراب" کوئی محاورہ نہیں۔ "برہان قاطع" میں بھی پاتراب نہیں ملا۔ بہ ظاہر یہ فارسی نہیں۔

"ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں   شوقِ عناں گسیختہ دریا کہیں جسے"

(ص-۲۰۶)

مہر: نسخہ امروہہ میں یہ شعر یوں ہے:

ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے سوا   شوقِ عناں گسیختہ دریا کہیں جسے

"سوا" بے حد بے محل معلوم ہوتا ہے۔ غالب نے اس جگہ "نہاں" بنا کر شعر کو کمال پر پہنچا دیا۔

(حاشیہ) "یہ شعر حاشیے پر بڑھایا گیا ہے اور اس کا آسان اور قریب الفہم ہونا خود ہی کہہ رہا ہے کہ یہ بعد کا کہا ہوا ہے"۔

(ص-۲۲۲)

مہر: لیکن سوال یہ ہے کہ "بعد کا" سے کیا مراد ہے؟ یعنی سال دو سال یا دس بیس سال بعد؟ یہ زیادہ سے زیادہ اس وقت کہا ہوگا جب نظرِ ثانی شروع کی ہوگی۔

۶۔ شرح دیوان اردوے غالب از جناب مولوی سید علی حیدر نظم طباطبائی لکھنوی انوار المطابع لکھنؤ (سنہ ندارد)

۱۔ ’’ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

(ص-۱۵۶)

’’یعنی پھر ہم تجھ سے محبت کر کے اپنے ساتھ دشمنی کیوں کریں، جب تجھے غیر کی محبت کا یقین ہو گیا‘‘۔

مہرؔ: مطلب یہ ہے کہ غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی مگر ہم بھی تو اپنے دشمن نہیں۔ یعنی تجھ سے محبت نہ کرنا اپنے ساتھ دشمنی کے مترادف ہے۔

۲۔ ’’دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

(ص-۱۷۰)

گل کترنا اور شگوفہ چھوڑنا ایک ہی معنی کے دونوں محاورہ ہیں یعنی کوئی ایسی بات کرنا جس سے فساد برپا ہو اور آپ الگ رہے‘‘

مہرؔ: اس کے معنی اچنبھے کا کام کرنا بھی ہے۔

۷۔ نوائے سروش (شرح دیوانِ غالب) از مولانا غلام رسول مہرؔ۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز لاہور (۱۹۶۹ء)

(نوٹ): میرا نسخہ ’’نوائے سروش‘‘ انٹرلیف شدہ ہے جس میں مولانا نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ اگر اسے الگ قلم بند کیا جائے تو ’’مثنوی ہفتاد من کاغذ شود، ایک اچھی خاصی جلد نقش پذیر ہو جائے۔ لہٰذا اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف تین مثالوں پر اکتفا کیا گیا:

حکایت بود بے پایاں ولیکن مختصر کردم۔

۱۔ ’’عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

(ص-۱۵۲)

موت کے بعد کی زندگی میں راحت و آسودگی ہر انسان کی طبعی اور فطری خواہش ہے۔ مختلف

شاعروں نے اس کے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ مثلاً عرفیؔ کہتا ہے:

امیدِ عافیت از مردن است و مے ترسم
کہ مرگ دیگر و آسودگی دگر باشد

یعنی مرنے کے بعد عافیت کی امید ہے لیکن مجھے اس خوف نے پریشان کر رکھا ہے کہ موت ایک شے ہے اور آسودگی بالکل دوسری شے۔ ضروری نہیں کہ موت بجائے خود ذریعہ آسودگی بن جائے۔ عرفیؔ کا یہی خیال شیخ ابراہیم ذوقؔ نے نہایت عمدہ انداز میں یوں پیش کیا ہے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

میرزا غالبؔ نے مفتی صدرالدین آزردہؔ مرحوم کی مدح میں جو بے مثال قصیدہ کہا ہے، اس کا مطلع یہ ہے:

زاں نے ترسم کہ گردد قعرِ دوزخ جائے من
وائے گر باشد ہمیں امروز من، فردائے من

یعنی میں اس سے نہیں ڈرتا کہ مرنے کے بعد مجھے دوزخ کی تہ میں پھینکا جائے گا اور وہی میرا مقام ہوگا لیکن اگر مجھے ویسی ہی زندگی مرنے کے بعد بسر کرنی پڑی، جیسی اب دنیا میں بسر کر رہا ہوں تو صد حسرت و افسوس کا مقام ہے۔ گویا دنیوی زندگی کی تکلیفیں اور مصیبتیں اتنی بڑھی ہوئی ہیں کہ ان کے مقابلے میں قعرِ دوزخ سے بھی کچھ ڈر اور خوف نہیں۔ اب آپ اصل شعر پڑھیے:

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ   مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

فارسی مثنوی ‘‘ابر گہر بار’’ کی مناجات میں جہاں محاسبۂ اعمال کا منظر پیش کیا ہے وہاں زندگی کی مصیبتیں تفصیل سے بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

بہر جرم کز روے دفتر رسد   زمن حسرتے در برابر رسد
بفرمائی کایں داوری چوں بود   کہ از جرم من حسرت افزوں بود
ہر آئینہ ہم چوں منے را بہ بند   تلافی فراخور بود نے گزند

یعنی میرے نامہ اعمال سے جو جو گناہ مجھ سے جتلایا جائے گا میں اس کے مقابلے میں حسرت پر حسرت پیش کرتا جاؤں گا۔ فرمایئے اس صورت میں حضور کے عدل کا تقاضا کیا ہوگا۔ جب میرے گناہوں سے میری حسرتیں بڑھی ہوئی نظر آئیں گی۔ ظاہر ہے کہ مجھ ایسے گناہ گار کے لیے تلافی نظر آئے گی نہ کہ سزا۔

۲۔ سرپائے خم پہ چاہیے ہنگام بے خودی   رو سوے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے
یعنی بہ حسب گردش پیمانۂ صفات   "عارف" ہمیشہ مستِ مۓ ذات چاہیے

(ص-۴۴۷)

خواجہ غلام غوث خاں مرحوم کا ایک مکتوب "انشاے بیخبر" میں بنام منشی امین الدین خاں چھپا ہے جس میں اس قطعے پر نکتہ چینی فرمائی گئی ہے۔ خواجہ صاحب کے ارشادات کا خلاصہ یہ ہے کہ تصوف سے آگاہی رکھنے والے لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اول اصحاب قال جو تصوف کی کتابوں نیز مصطلحات ودقائق سے واقف ہوتے ہیں۔ دوسرے اربابِ حال جو اپنی سرگزشت بیان کرتے ہیں۔ تیسرا گروہ ان دونوں طبقوں سے علیٰحدہ ہے، جسے نہ علم باطنی سے تعلق ہے نہ علم ظاہری سے۔ خواجہ صاحب نے میرزا کو تیسرے گروہ میں رکھا ہے اور قطعے کے اشعار کو باہم بے تعلق بتایا ہے۔ بلاشبہہ میرزا غالب صاحب حال نہ تھے یعنی ان معنی میں جو عموماً اس اصطلاح کے سمجھے جاتے ہیں حالاں کہ صاحب حال ہونا ایک خاص قلبی یا روحانی کیفیت ہے جس کے لیے خاص شرطیں وضع کرنا ممکن نہیں لیکن قطعے کے متعلق جو رائے ظاہر کی گئی ہے وہ تو قطعاً درخور قبول نہیں بل کہ اصل اشعار کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ خواجہ صاحب نے مصرع:

یعنی بحسب گردش پیمانۂ صفات

اس کی اصلاح کرتے ہوئے کہا کہ مصرع یوں ہوتا تو شعر کے معنی صاف ہو جاتے:

پیمانۂ صفات کو گردش اگرچہ ہو

حالاں کہ اس طرح شعر کے معنی الجھ گئے، مصرع بے کیف ہو گیا اور بات کوئی نہ بنی۔ میرزا کا مقصد یہ ہے کہ پیمانۂ صفات کی گردش کے مطابق عارف کو حقیقت و اصلیت سے وابستہ رہنا چاہیے۔ یعنی وہ مستِ مے ذات رہے۔ مثلاً ہر رنگ اور وضع کے پھول میں بہار کا اثبات، بے خودی میں خم کے پاؤں پر سر، مناجات میں قبلے کی طرف توجہ یعنی ظواہر سے ہٹ کر بواطن، مقاصد اور اصول پیشِ نظر رکھے جائیں۔

’’بحسب گردش پیمانۂ صفات‘‘ نہایت اچھا ٹکڑا ہے۔ اس کی جگہ ’’پیمانۂ صفات کو گردش اگرچہ ہو‘‘ کچھ بھی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے خواجہ صاحب شعروں کی معنویت پر غور نہیں فرما سکے اور انھوں نے بلاوجہ میرزا غالب کو حقیقت ناشناسوں میں شامل کر دیا۔ خواجہ صاحب کے علم و فضل سے ایسے انتقاد کی توقع نہ تھی۔

۳۔ ہوں میں بھی تماشائی نیرنگ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آئے

(ص-۲۰۲-۷)

مطلب یہ کہ تمنا کی لذت نے مجھے اپنے دام میں الجھا لیا ہے۔ یہ مدعا نہیں کہ جو کچھ میں چاہتا ہوں وہ حاصل ہو جائے۔ اس شعر کی معنویت تھوڑی سی تشریح کی محتاج ہے۔

۱۔ انسان کے لیے زندگی ایسی صورت میں دل چسپ و دل آویز ہو سکتی ہے کہ دل میں تمنائیں اور آرزوئیں ہوں۔

۲۔ تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل کے لیے انسان مختلف تدبیریں اختیار کرتا ہے۔ طرح طرح کے منصوبے بناتا ہے اور مسلسل جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح وہ خود اور اس کائنات کی تمام دوسری چیزیں ایک فعال عنصر کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

۳۔ اگر مدعا بر آئے تو ظاہر ہے کہ انسان کی تدبیر آرائیاں اور سرگرمیاں ختم ہو جائیں گی اور زندگی کی دل آویزی بے معنی رہ جائے گی کیوں کہ خود انسان کی فعالیت ختم ہو جائے گی۔

۴۔ میرزا فرماتے ہیں کہ ہمارے لیے تمنا کی نیرنگیوں میں الجھے رہنا اچھا ہے کیوں کہ زندگی کی بہار اسی کا نام ہے۔ ہم مدعا بر آری سے اپنے اوپر سکون کی کیفیت طاری نہیں کرنا چاہتے جو زندگی کے لیے باعث ننگ ہے اور زندگی کو بے کیف بنا دیتی ہے۔

۵۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جدوجہد میں کوئی مقصد تو پورا ہو ہی جاتا ہے۔ میرزا فرماتے ہیں کہ جزوی مقاصد بے شک پورے بھی ہوں لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم اپنے اصل مطلب کی تکمیل کے خواہاں ہیں کیوں کہ اس کے ساتھ تو نیرنگ تمنا کا تماشائی بنے رہنا ممکن ہی نہیں رہے گا۔

(ارمغان ڈاکٹر سید عبداللہ مرتبین ڈاکٹر تحسین فراقی ڈاکٹر ضیاء الحسن شعبۂ اُردو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور ۲۰۰۵ء)

نوٹ: (مضمون ہذا ارمغان میں ’’نقدِ غالب‘‘ کے عنوان سے چھپا تھا)

تاثراتِ مہر

”مجلس یادگارِ غالب“، جس کے صدر پروفیسر حمید احمد خاں وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی تھے، میرزا غالبؔ کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں بعض کتابوں کی ترتیب و تہذیب نیز موزوں تقریبات کے اہتمام کے لیے قائم ہُوئی تھی اس مجلس کی ایک تجویز یہ بھی تھی کہ مختلف اصحاب سے میرزا کے متعلق ذاتی تاثرات لکھوائے جائیں اور انھیں کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ یہ مختصر سا مقالہ اسی سلسلے میں لکھا گیا تھا۔

در عرضِ غمت پیکرِ اندیشۂ لالم
پا تا سرم انداز بیان است و بیاں نیست

میں مشن ہائی سکول جالندھر کی نویں جماعت میں پڑھتا تھا، جب شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا (۱۹۰۹ء)۔ ضامن علی ضامنؔ کا دیوان کہیں سے ہاتھ آ گیا تھا، اس کی غزلوں پر طبع آزمائی کر کے شوق کی پیاس بُجھاتا۔ یقین ہے کہ جو کچھ کہتا تھا وہ قابلِ توجہ تو کیا غالباً صحیح بھی نہ ہوگا۔ تاہم خُوب یاد ہے کہ اپنی ہر غزل کئی کئی مرتبہ صاف کاغذوں پر لکھ لکھ کر خوش ہوتا تھا، گویا ”طفلِ خود نما“ کا سا معاملہ تھا۔

یک حرف خواندہ ایم و بصد جا نوشتہ ایم

کچھ عرصے کے بعد خیال آیا کہ اس ”تک بندی“ کے متعلق کسی سے مشورہ ضرور کر لینا چاہیے۔ ایک ہم جماعت سے بات کی تو اس نے مولانا حکیم محمد سلیم کی بارگاہ میں حاضری کی صلاح دی جو بستی غذاں میں رہتے تھے اور بستی غذاں مشن ہائی سکول سے زیادہ دُور نہ تھی۔

مولانا سلیم عربی، فارسی اور اُردو کے تو فاضل تھے ہی، بھاشا بھی خوب جانتے تھے اور چاروں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ میں نے انھیں تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ وغیرہ مختلف علوم پر بے تکلف فاضلانہ گفت گو کرتے ہوئے بارہا سنا۔ ہیئت و جفر میں بھی انھیں دست گاہ حاصل تھی۔ فنِ خطاطی میں بھی ماہر تھے۔ ایک روز میری نظر اچانک ان کے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر پڑی تو معلوم ہُوا ناخن

بہت بڑھا ہوا ہے میں نے سمجھا اتفاق سے ناخن ترشوانا بھول گئے۔ ان سے ذکر کیا تو چپ چاپ سفید کاغذ کا ایک تختہ اٹھایا، جو سامنے پڑا تھا اور چند لمحوں میں اس پر ابجد کے نہایت خوب صورت نقوش ناخن سے بنا دیے۔ طب کو تو انھوں نے پیشے کے طور پر اختیار کر لیا تھا اور مشہور تھا کہ تشخیص و تجویز میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ میں ان کی خدمت میں پہنچا تو عمر ستر کے قریب معلوم ہوتی تھی۔ بال بالکل سفید ہو چکے تھے اگر چہ صحت اچھی تھی تاہم اُٹھنے بیٹھنے میں خاصا تکلف محسوس کرتے تھے۔ علم و فضل کے باوصف ان کی آمدنی بہ ظاہر بہت محدود تھی۔ مریض بھی کم ہی آتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اوائل شباب ہی میں وہ عرق نوشی کے عادی ہو گئے تھے۔ اس شغل میں انہماک کے باعث ان کے تمام کمالات پر پردہ سا پڑ گیا اور وہی صورت پیدا ہو گئی جس کا نقشہ میرزا غالبؔ نے اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے یوں کھینچا ہے:

جوہرِ طبعم درخشان است، لیک
روزم اندر ابر پنہاں می رود!

مولانا سلیم مرحوم خود بھی بعض اوقات عالم سرور میں نہایت عمدہ علمی گفت گو کرتے ہوئے یکایک پیکرِ حسرت بن جاتے اور میرزا غالبؔ کا یہ شعر پڑھتے:

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ساتھ ہی آنکھیں نم آلود ہو جاتیں لیکن میری اور بعض دوسرے نیاز مندوں کی انتہائی کوشش کے باوجود عرق نوشی ترک کرنے پر آمادہ نہ ہُوئے ان حالات میں خوش گوار تغیر کی کیا امید ہو سکتی تھی؟

مولانا کے حالات بے حد دل چسپ بھی ہیں اور عبرت انگیز بھی، تاہم میں یہ داستان چھیڑ دوں تو اصل موضوع سے بہت دُور چلا جاؤں گا۔

یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ مولانا نے مجھے شرفِ تلمذ سے بھی نوازا۔ میرا موجودہ تخلص بھی انھی کا عطیہ ہے اگر چہ اس کی حیثیت مدت سے ایک تہمت کی سی رہ گئی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ چند ہی روز کے بعد ''دیوان غالبؔ'' پڑھنے کی تاکید فرمائی بل کہ چند غزلیں خود پڑھائیں۔ افسوس کہ میں کم علمی کے باعث ان کی تشریحات سے زیادہ فائدہ نہ اٹھا سکا۔ پھر مولانا حسرتؔ موہانی اور شوکت

میرٹھی کی شرحیں پڑھیں وہ بھی میرے لیے چنداں سُود مند ثابت نہ ہوئیں لیکن شفیق استاد کے تاکیدی ارشاد کی تعمیل میں ''دیوانِ غالبؔ'' کا مطالعہ برابر جاری رکھا اگرچہ سوچتا ہوں تو آج بھی مجھ پر قطعاً واضح نہیں ہوتا کہ اس ارشاد کی بنیاد کیا تھی۔ رفتہ رفتہ طبیعت کو میرزا کے اسلوبِ بیان سے ایک گونہ مناسبت پیدا ہونے لگی اور زیادہ تر اشعار کے معانی فہم کی دسترس میں آنے لگے۔

دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد اسلامیہ کالج لاہور میں پہنچا تو میرزا کے فارسی کلام سے روشناس ہُوا پھر بیدلؔ کا مطالعہ شروع کر دیا صرف اس خیال سے کہ میرزا غالبؔ نے ابتداء میں بیدلؔ بہت پڑھا تھا لیکن یہ دور جلد ختم ہو گیا:

در سلوک از ہرچہ پیش آمد گذشتن داشتم
کعبہ دیدم، نقشِ پائے رہرواں نامیدمش

میرزا ہی کی رہنمائی میں فارسی کے مشہور اساتذہ تک رسائی نصیب ہُوئی، جن میں سے بعض کا کلام عموماً میری زبان پر جاری رہتا ہے۔

میرزا غالبؔ کے ساتھ اوّلین روشناسی پر نصف صدی سے زیادہ مُدّت گزر چکی ہے تاہم آج بھی دل میں یہی آرزو موجزن رہتی ہے کہ گوناگوں مشاغل سے کچھ مہلت میسّر آ جائے تو اسے میرزا کے فارسی اور اُردو کلام یا اُردو مکاتیب کے مطالعے میں گزار دوں شاید اس طرح معنی رسی اور حقائق شناسی کی صلاحیت میں کسی قدر رجلا پیدا ہو جائے۔

الحمدللہ کہ میں اپنی فطری یا اکتسابی استعداد کے بارے میں غلط فہمی سے ہمیشہ محفوظ رہا۔ قدرت نے جو کچھ عطا کیا تھا اس کی حیثیت قرآن حکیم کے لفظوں میں ''بضاعۃ مزجاۃ'' کی سی ہوگی۔ باقی رہا تحصیل و اکتساب کا معاملہ تو میں ہر دور میں نارسائیوں، نامساعدتوں اور واماندگیوں کا شکوہ سنج رہا۔ تاہم میرے کشکولِ فکر و نظر میں جو بھی حقیر سی پونجی موجود ہے اس میں شعر و ادب کی حد تک ہر شے کو میں اصلاً میرزا غالبؔ ہی کا فیضان سمجھتا ہوں۔ میرے ذوق، میری صلاحیت، فہمِ حقائق، میری قوت اخذ معارف، میرے معیار ''خوب'' و ''ناخوب'' نے میرزا ہی کے کلام کی آغوشِ ممارست میں تربیت پائی۔ غرض میں جو کچھ بھی بن سکا اس کی بنیادیں میرزا ہی کی بارگاہِ عظمت میں پُرخلوص عقیدت کی بہ دولت استوار ہُوئیں اس کے لیے اپنے شفیق و مکرم استاد مولانا حکیم محمد سلیم کے لیے نوافل سحر گاہی میں

بالالتزام دعا کرتا ہوں۔

میرزا کا یہ شعر بے شمار اصحاب نے پڑھا ہوگا بل کہ اسے جا بجا استعمال بھی کیا ہوگا۔

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبع خریدار دیکھ کر

میں فرومایگی کے دلی اعتراف کے ساتھ اپنے تصور کے مطابق اپنے آپ کو اس کی صداقت کی ایک شہادت سمجھتا ہوں۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ خدانخواستہ میں اپنے عیارِ طبع کے متعلق حسن ظن میں مبتلا ہوں یا میرزا غالبؔ واقعی متاعِ سخن کے ساتھ بہ نفسِ نفیس میرے پاس آگئے حاشا و کلا۔ صرف یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے جو کچھ ملا، میرزا ہی کے سرچشمۂ فیض سے ملا اگر آپ کی نظر میری بے حقیقی اور بے مایگی کی طرف جائے تو خواجۂ شیراز کی حقیقت گوئی نظر انداز ہونی چاہیے:

ہرچہ ہست از قامتِ ناسازو بے اندامِ ماست
ورنہ تشریفِ تو بربالائے کس کوتاہ نیست

اس سلسلے میں ایک بدیہی نقصان کی طرف بھی اشارہ کردینا ضروری ہے۔ بالکل ابتدائی دور میں میرزا کے کلام سے شغف پیدا ہوجانے کا ایک نتیجہ یہ ہُوا کہ میں اقبالؔ کے سوا کسی بھی اُردو شاعر کا کلام آج تک بالاستیعاب نہ پڑھ سکا۔ مختلف شعرا کے دواوین صرف جستہ جستہ ہی دیکھ سکا کیوں کہ اقبالؔ کو مستثنیٰ کرتے ہُوئے غالبؔ کی آتش سیال کا سا کیف و سرور کسی دوسرے خُم خانے میں نہ مل سکا۔

اگرچہ یہ ذکر پیشِ نظر موضوع سے بے تعلق ہے۔ تاہم میرے لیے ایسی ہی صورت اُردو نثر میں بھی پیش آئی۔ میں نے بالکل ابتدائی دور میں "الہلال" پڑھا اور شاعری سے نثر نگاری کی طرف توجہ "الہلال" کے باعث منعطف ہُوئی۔ مولانا ابوالکلام مرحوم کے اندازِ بیان نے ذہن و دماغ پر اس طرح قبضہ کرلیا کہ میں اُردو نثر کے بھی بیش تر عمدہ ذخیروں سے جزواً ہی مستفید ہوسکا۔

میری مثال کوئی اچھی اور قابلِ تقلید مثال تو یقیناً نہیں مگر یہ ضرور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر ذوق صحیح کی نشو و ارتقاء کی آرزو ہو اگر حقائق و معارف عالیہ سے حقیقتاً لذت یاب ہونے یا انھیں دل پذیر طریق پر پیش کرنے کی صلاحیتوں میں فروغ و بالیدگی کی جستجو ہو تو میرزا کا کلام ضرور پڑھیے نظم بھی اور نثر

بھی۔ اس طرح پڑھیے جو پڑھنے کا حق ہے۔ اس عاجزانہ گزارش کو شرفِ قبول بخش کر آپ یقیناً پشیمان نہ ہوں گے۔ میرزا کا یہ ارشاد شاعرانہ تعلّی کا کرشمہ نہیں، حقیقت کا ترجمان ہے:

درتہِ ہر حرف غالبؔ، چیدہ ام میخانۂ
تاز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن

(میرزا غالبؔ تاثرات کے آئینے میں۔
مجلس یادگار غالبؔ پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور ۱۹۶۹ء)

مرزا غالب کی عظمت کے پہلو

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

مرزا غالبؔ کی عظمت کے متعدد پہلو ایسے ہیں جن پر اب تک پوری توجہ نہیں کی گئی، مثلاً:

۱۔ اُردو کلام بہت پڑھا گیا لیکن فارسی کلام کا مطالعہ اس پیمانے پر نہیں کیا گیا حالاں کہ فارسی کی غزلیں، قطعے، قصیدے، مثنویاں، رباعیاں، ترکیب بند، ترجیع بند وغیرہ اُردو سے کہیں زیادہ ہیں۔ نیز میرزا کی زندگی کا بڑا اور بہترین حصہ فارسی ہی کی نذر ہوا اور یہی دائرہ ہے جس میں ہمیں اندازہ ہوسکتا ہے کہ بلندترین اساتذہ فارسی کی مختصری مجلس میں میرزا کا درجہ اور مقام کیا تھا۔

۲۔ میرزا کی اُردو غزلوں کے برابر ان کے اُردو قصائد (خصوصاً چند آخری قصائد) سے بہت کم اعتنا کیا گیا۔ ان میں بعض قصیدے ایسے ہیں جو ندرتِ فکر، قدرتِ کلام اور حسنِ بیان کے اعتبار سے اُردو اور فارسی اشعار کے پورے مجموعے میں اپنی مثال آپ ہیں، مثلاً:

ہاں مہ سنیں ہم اس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

یا

صبح دم دروازۂ خاور کھلا
مہر عالم تاب کا منظر کھلا

۳۔ غالب اُردو کا پہلا شاعر ہے جس نے انداز و بیان میں خاص تغیر پیدا کر کے ہماری قومی زبان میں دقیق مطالب و حقائق کا محمل بننے کی صلاحیت کمال پر پہنچا دی اور اس کے لیے نشو و بلوغ کے وسیع ممکنات مہیا کر دیے۔ میرزا کے بعد اُردو شاعری نے جو ترقی کی اس کا ابتدائی انتظام میرزا ہی نے کیا تھا۔

۴۔ میرزا کے مختصر سے دیوان میں ایک دو نہیں بیسیوں اشعار ایسے ملیں گے جن میں جملے کے جملے مقدر چھوڑ دیے گئے۔ تاہم معانی کے اظہار و ابلاغ بیان کی دل آویزی اور لطائف اشعار میں نہ

محض کوئی کمی نہ آئی، بل کہ اضافہ ہوگیا۔ ایسے اشعار کی تشریح کی جائے تو ایک داستان سنانی پڑے گی، جس کی مبادی کو بہ ظاہر شعر سے کوئی تعلق نظر نہ آئے گا۔ تاہم پوری داستان سن لینے کے بعد یقین ہو جائے گا کہ وہ معنویت شعر کا لاینفک جزو تھی۔ اس سلسلے میں چند مثالیں پیش کیے بغیر حقیقت بہ خوبی واضح نہیں ہوسکتی لیکن ظاہر ہے کہ ایک مختصر سے پیغام میں مثالوں کا رشتہ بیان کھولنا سراسر غیر مناسب ہوگا۔

۵۔ میرزا کی اُردو نثر کے مقام بلند کا صحیح اندازہ اب تک نہیں کیا گیا۔ کہنے کو یہ مکاتیب ہیں جو قلم برداشتہ لکھے گئے اور انھیں لکھتے وقت میرزا کو خیال بھی نہ ہوگا کہ یہ کبھی منظر عام پر آئیں گے۔ مجھے اپنی علمی فرومایگی کے اعتراف میں تامل نہیں۔ تاہم پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اُردو نثر کے جس قدر دل کش اسالیب ان مکاتیب میں مل سکتے ہیں، وہ مشہور ادیبوں اور انشاء پردازوں کی ضخیم کتابوں سے بھی شاید ہی مہیا کیے جا سکیں پھر میرزا کا کمال یہ ہے کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی فراہم کر دیتے ہیں۔ بہ ایں ہمہ حسن تحریر، لطف بیان اور ابلاغ و جاذبیت معانی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اس گزارش کی توضیح بھی مثالوں کی متقاضی ہے لیکن میں پیغام کو مقالہ نہیں بنا سکتا۔ پھر میرزا کی نثر نگاری کا ایک عجیب پہلو یہ ہے کہ اس سے مبتدی اور منتہی بقدر صلاحیت و ذوق یکساں مستفید و لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

ان چند الفاظ کے ساتھ اپنی جسارت کے لیے عذر خواہ ہوں۔ میرزا غالبؔ کے سلسلے میں کوئی پیغام دینا میرا منصب نہ تھا لیکن یہاں میری حیثیت ''مامور'' کی ہے۔ اس لیے ''معذور'' سمجھیے۔ آپ کو عرض پرداز کی بے حیثیتی پر نہیں، نفس مدعا اور دلی آرزو پر نظر رکھنی چاہیے:

شعر غالبؔ نبود وحی و نگوئیم ولے
تو و یزداں نتواں گفت کہ الہامے ہست

''فولیو''۔ مجلّہ فارمن کرسچین کالج لاہور
(غالب نمبر) ۱۹۶۷ء

مولانا مہرؔ کے پانچ پسندیدہ اشعار

مجید ملک مدیر ''کاروان'' لاہور نے بعض احباب سے فرمائش کی کہ رسالہ ''کاروان'' میں اشاعت کے لیے اُردو کے صرف پانچ پسندیدہ اشعار لکھ بھیجیں۔ اس فرمائش کی تعمیل میں جن احباب نے حصہ لیا، ان میں سر عبدالقادر، خلیفہ عبدالحکیم، عبدالمجید سالک، سید سلیمان ندوی اور مولانا غلام رسول مہرؔ شامل ہیں۔ ہم مضمون کی مناسبت سے اس مقام پر صرف مولانا غلام رسول مہرؔ کے پانچ پسندیدہ اشعار درج کر رہے ہیں۔ لطف یہ کہ مولانا نے صرف غالبؔ ہی کے پانچ پسند فرمائے۔

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابندِ نے نہیں ہے

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذّت ہماری سعی بے حاصل میں ہے

عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے

(سال نامہ ''کاروان'' لاہور ۱۹۳۴ء،

مرتب: مجید ملک۔ کاروان چابک سواران لاہور)

غلام رسول مہؔر کے منتخبہ بہترین اشعارِ غالب

علی بہادر خاں نائب صدر انجمن ترقیِ اُردو (شاخ دہلی) کی فرمایش پر فروری ۱۹۵۳ء میں بعض اہلِ علم نے غالبؔ کے بہترین پانچ اشعار کا انتخاب کیا جن میں مولانا غلام رسول مہؔر بھی شامل ہیں۔ انھوں نے پانچ اُردو اور پانچ فارسی اشعار کا انتخاب کیا۔ یہ بھی ہدیہ قارئین کرام کیے جا رہے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ اشعار بعد میں انجمن ترقی اُردو، دہلی نے اسی سال کتابی صورت میں بہ عنوان ''غالبؔ کے بہترین پانچ شعر'' (اہلِ نظر کی نظر میں) شائع کر دیے تھے۔

(۱)

اردو: بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پہ پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

(۲)

فارسی: بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلا است
قعر دریا سلسبیل و روے دریا آتش است

نشاطِ جم طلب از آسماں نہ شوکتِ جم
قدح مباش زِ یاقوت بادہ گرغنی است

بہ راہ کعبہ زادم نیست، شادم، کز سبک باری
برفتن پائے برخارِ مغیلانم نمی آید

اندر آں روز کہ پرسش رود از ہرچہ گزشت
کاش با ما سخن از حسرت مانیز کنند

ہفت دوزخ در نہادِ شرمساری مضمر است
انتقام است ایں کہ با مجرم مُدارا کردۂ

مجلس ترقی ادب لاہور